

# فتح مبین

بار سوم

مارچ ۱۹۹۲ء

تعداد اشاعت

ایک ہزار

مطبع

بک پرنٹرز لاہور

پابند

پبلیکیشنز، لاهور

کتبت

فاضل اینڈ سنز - پبلی مارکیٹ

اُردو بازار - لاہور

قیمت

قیمت ایک سو بیس روپے

انتساب

اپنے بھائی اور حسن

الحاج السید ابو محمد صاحب نے پی

صدر شیعہ ایشیا عشری جماعت بمبئی

کی خدمت میں

جن کی محبت اور شفقت کا سارا

پاکستان یہ کتاب مکمل کر سکا

از  
ذوالحسین فاروقی

پبلشرز  
مکتبہ امامیہ مشن پاکستان ٹرسٹ  
مظاہر پلان ۲۸ - نیو انارکلی لاہور

# عرض ناشر

ہاری انمول پیش کش "فتح مبین" کا تیسرا ایڈیشن آپ کے زیر نظر ہے  
فاضل قلمکار ڈاکٹر ذاکر حسین قاروقی ایم ایس پی ایچ ڈی کی ذات گرامی علمی  
حلقوں میں شہرت یافتہ نہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ وہ نامیہ مشن پاکستان کے ان  
خاص علمی معاونین میں سے ہیں جو ہمیشہ بے لوث علمی اعانت فرماتے رہتے ہیں۔  
ہمیں ممدوح کے دو عظیم شاہکار "وہبیت" (پانچ حصوں میں) اور "شہید اعظم"  
شائع کرنے کی سعادت حاصل ہے۔

کچھ عرصے سے ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ مہسوس کر رہے ہیں کہ  
پاکستان میں ایک نیا فتنہ بڑی تیزی کے ساتھ پروان چڑھ رہا ہے جو بنی امیہ کی  
حمایت میں تحریری اور تقریری "جھوٹ" میں مصروف ہے۔ کسی بھی شخص کو جبر و  
اکراہ کے ساتھ اس کے عقیدے سے بلائیں رکھنا جائز نہیں۔ خاندان بنی امیہ  
کے شاخواریوں کو اس کام کی جزا و سزا تو بیکار اور جہل سے بچنا ہوگی۔ لیکن  
اس بات کا تلقین ضرور ہوتا ہے کہ بنی امیہ کے ہر مخالف شخص کے نام پر تاریخ  
کو مسخ کر کے پیش کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں۔ ہم سرکار محمد و آل  
محمد کے نام لیا ہونے کی وجہ سے یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ظہور کا صحیح رخ بھی  
پیش کرتے رہیں تاکہ گمراہی نہ پھیلنے پائے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے روایت و درایت کے ساتھ بنی امیہ کے  
مقابلہ میں آل محمد کی فتح مبین کو قلم کی پوری توانائیوں کے ساتھ اس دلچسپ انداز  
میں پیش کیا ہے کہ آل محمد کے کردار کی عظمت و لازوال فتح کا اقرار کرنے کے  
سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا۔ آپ یقیناً اس کتاب کو پڑھ کر محفوظ ہوں گے۔

ناشر  
سید انصار حسین نقوی  
ایم۔ ٹی

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔

پیش کشی کے لیے شکر ہے۔





مورخین کی اس فلسفی سے نسل انسانی کو بے حد نقصان پہنچا۔ اگر وہ ایک ذرا اسی پارک بنی سے کام لیتے اور حق کی فتح مبین کا اور اک کرتے ہوئے اس کا اعلان کر دیتے تو شاید نسل انسانی کی تاریخ آج سے بالکل مختلف ہوتی اور دنیا وہ نہ ہوتی جو آج ہے۔

جب لوگ یہ دیکھ لیتے کہ حق والے اقلیت میں رہتے ہوئے بے سرو سامانی کی زندگی بسر کرتے ہوئے دولت و عساکر کی قوتوں سے محروم رہتے ہوئے مصلحت کے جاہ و جلال سے بے پروائی برتتے ہوئے مادی وسائل اور ظاہری اسباب جنگ کے اعتبار سے بے حد کمزور ہوتے ہوئے ہر معرکہ میں باطل کو دندانِ حنک شکست دیا کرتے ہیں۔ اس کے غرور اور طغیانہ کو خاک میں ملا سکتے ہیں تو ان میں حق پسندی کے عزائم ابھرتے، سچائی پر قائم رہنے کی ہمت پیدا ہوتی، اعلیٰ اقدار انسانی کی خاطر قربانیاں دینے کی قوت ابھرتی اور باطل کے مقابلہ میں سینہ سپر رہنے کی وہ طاقت موجود رہتی جس کے نتیجے میں دنیا سے باطل کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن نسل انسانی کا پرانا دشمن شیطان بھی اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر عام انسانوں نے یہ حقیقت جان لی کہ مٹی بھر بے سرو سامان انسان محض عزم و ہمت کے سارے بار بار باطل کو شکست دے چکے ہیں تو تمام انسان پوری جرات کے ساتھ حق کے پرچم تلے متحد ہو جائیں گے اور اس اتحاد انسانی کے نتیجے میں دنیا سے باطل یا شیطنت پرستی کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ اس لئے شیطان نے انسانوں کو یہ یقین دلانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ فتح کے پرچم ہمیشہ باطل کے نام پر لہرائے جاتے ہیں۔ قوت، سطوت، عظمت، شوکت اور دولت صرف باطل کے خزانہ میں نظر آتی ہیں۔ حق ہمیشہ ذلت و مسکنت کا شکار رہتا ہے۔ حق پسند صرف مرنے یا تباہ ہونے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا مقوم صرف شکست اور بربادی ہے اور کامرانی و ظفر مندی کے پرچم صرف باطل کی فضاؤں میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ شیطان جانتا تھا کہ یہ واہمہ وجود میں آجائے گا تو یہ ہو گا کہ عام انسان یا تو اپنی کمزوری

اور بزدلی کے نتیجے میں معرکہ حق و باطل سے دور رہیں گے اور یا پھر خوف یا طمع کے نتیجے میں باطل کے کیچ میں جمع ہو جائیں گے۔ بد قسمتی سے شیطان اس منصوبہ میں کامیاب رہا اور مورخین نے باطل کی فتح ظاہری کے جو نقشے مرتب کئے حق کی پامالی کا جس انداز میں ماتم کیا۔ شیطانی قوتوں کے جاہ و جلال کی جو تصویر کشی کی۔ اس کے نتیجے میں شیطان کا مقصد پورا ہو گیا۔ باطل کی ظاہری تمغندی ایک حقیقت ابدی کے طور پر تسلیم کر لی گئی اور اس کے نتیجے میں عام انسانوں میں حق پسندی کی جو قوتیں ابھرنے لگی تھیں اور جن پر نسل انسانی کے مستقبل کا انحصار تھا وہ بپ کے فنا کے قاروں کی نذر ہو گئیں۔ باطل کی ظفریابی اور اس کے ظاہری شکوہ کے تصور نے انسانوں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر دی اور حق کی حمایت کا جذبہ اتنا کمزور ہو گیا کہ آج کے ترقی، روشنی، اور علم کے دور میں بھی اس کے ابھرنے کی امید بہت کم نظر آتی ہے۔ ہم یہ تماشا آئے دن دیکھا کرتے ہیں کہ حق کی حمایت میں ایک کلمہ بھی زبان سے ادا کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہو کر رہا ہے اس لئے کہ انسانوں کے لاشعور میں بات جم چکی ہے کہ حق کی حمایت کا نتیجہ جہی، بربادی اور ناکامی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ پختہ ہو چکا ہے کہ ظاہری کامرانی صرف باطل کا مقوم ہے اور اگر انہوں نے باطل کی طاقتوں کا مقابلہ کرنا چاہا تو انسان کا وہی عبرتناک انجام ہو گا جو حق پرستوں کا ہوتا رہا ہے۔ اس تصور نے حق کے باب میں ان کی ہمتوں کو پست، ان کے دلوں کو چھوٹا اور ان کے قلوب کو مضحل کر دیا ہے۔ ان کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ طاقت ہمیشہ باطل کا ساتھ دیتی ہے اور اس طاقت کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے اور یہی ہے وہ چیز جو دنیا کی تباہی کی اصلی جڑ کسی جا سکتی ہے۔ اسی تصور کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا پر باطل کا پرچم لہرا رہا ہے اور حق مقوم و پسماندہ نظر آتا ہے۔ باطل پرستوں کے مقابلہ میں حق پرستوں کی کسی جمعیت کا تیار کرنا حد درجہ دشوار ہو چکا ہے اور اگر کسی گوشہ سے حق کی آواز بلند بھی ہوتی ہے تو

اسے آسانی سے دبا دیا جاتا ہے۔ حق کی یہ پامالی نتیجہ ہے تاریخ کے غلط مطالعہ کا۔ مورخین کے غلط اندازوں کا اور نسل انسانی کے اس غلط اور جاہ کن تصور کا کہ فتح ظاہری باطل کا مقصوم ہے اور پامالی و نامرادی حق کا مقدر!۔

اس سلسلہ میں ایک مزید حقیقت سامنے آتی ہے۔

انسان فطرتاً حق پسند ہوا کرتا ہے اور چاہے خوف یا طمع اسے باطل کے پرچم تلے جمع کر دے لیکن اس کا دل اور اس کا ضمیر ہمیشہ حق کی پاسداری پر مجبور کرتا ہے۔ وہ چاہے لاکھ گناہ میں مبتلا ہو لیکن نیکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتا۔ ہزار برائیاں کرتا رہے لیکن اچھائیوں کی خوبی کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے جسے وہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ اس کا مزاج ہے جسے بدلنے پر وہ مطلق قادر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باطل کی ظاہری شان سے مرعوب ہو جانے کے باوجود اس کے دل کے کسی گوشہ میں یہ تمنا ضرور موجود رہتی ہے کہ حق ظفر مند و کامران ہو۔ وہ حق کو مقہور اور پامال دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ باطل کو کامران و سر بلند قرار دیتے ہوئے اسے ایک فطری تردید اور ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی فطرت اسے پسند نہیں کرتی کہ وہ جھوٹ کو سچ کے مقابلہ میں، گناہ کو نیکی کے مقابلہ میں، برائی کو اچھائی کے مقابلہ میں تقصیل عطا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مورخین باطل کی ظاہری شان سے مرعوب ہو کر اس کی فتح کا اعلان کرتے رہے وہیں اپنی انسانی فطرت سے مجبور ہو کر ان کو حق کی فضیلت اور برتری کی بھی ایک راہ نکالنا پڑی چنانچہ انہوں نے ایک نیا نعرو ايجاد کیا اور وہ یہ تھا کہ:

حق و باطل کے ہر معرکہ میں جہاں ظاہری فتح باطل کو نصیب ہوئی  
وہیں ”باطنی فتح“ حق کے حصہ میں آئی۔“

”باطنی فتح“ کا یہ نعرو محض اس لئے ايجاد کیا گیا کہ مورخ کا دل اور اس کی فطرت

حق کو پامال اور شکست خوردہ قرار دینے پر تیار نہیں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح کھینچ تان کے ہی کیوں نہ سہی حق کی کامیابی کا پرچم بھی لہرایا جائے اور باطل کی ظفر بندی ایک ظاہری حقیقت سہی لیکن باطن کی ایک پراسرار نقاب اوڑھا کے حق کو بھی کامیاب و کامران قرار دیا جائے۔ اور اس طرح اپنی فطرت کو تسکین دے لی جائے۔

مورخین یہ جانتے تھے کہ ان کا یہ نعرو ایک طفل تلی، ایک خوش آسید خواب اور ایک دل خوش کن معرہ ہے لیکن چونکہ یہ نعرو ان کی فطرت سے قریب تر تھا اور اس کے نتیجہ میں حق کی فضیلت کا انسانی جذبہ تسکین پاتا تھا۔ اس لئے وہ باطل کی ظاہری اور حق کی باطنی فتح کا راگ ہمیشہ الاپتے رہے اور یہ بات اتنی مرعبہ کہی اور سنی گئی کہ آج بچہ بچہ کی زبان پر یہی بات ہے کہ معرکہ حق و باطل میں جہاں باطل اپنی مادی قوتوں کے سارے ظاہری کامیابی حاصل کرتا ہے وہیں حق باطنی طور پر کامران و منصور ہوا کرتا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتے ہیں کہ یہ ایک واہمہ ہے جو محض فطرت انسانی کی تسکین کے لئے تراشا گیا ہے ورنہ دو متحارب قوتوں کا بیک وقت کامیاب ہونا ایک کا ظاہری طور پر اور دوسری کا باطنی طور پر عقلی اور منطقی طور پر قطعاً محال ہے۔

جنگ میں صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک فریق غالب ہو اور دوسرا مغلوب اور دوسرے یہ کہ جنگ غیر فیصلہ کن طریقہ پر ختم ہو جائے۔ ہر دو فریق کا کامیاب ہونا محال ہے لیکن مورخین عین اسی محال عقلی کے تسلیم کرنے کی دعوت دیا کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جہاں باطل کی ظاہری فتح کو ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر تسلیم کیا جائے وہیں حق کو کسی پراسرار اور نامعلوم طریقہ پر فتح باطنی کا تمغہ عطا کر کے پلہ برابر کر دیا جائے۔ باطل کی کامرانی ایک سائنٹیفک حقیقت کے طور پر ماننی جائے لیکن

چونکہ حق کو شکست خوردہ قرار دیتے ہوئے ایک ندامت اور کوفت سی محسوس ہوتی ہے اس لئے اس کے نام کے ساتھ بھی ایک غیر مرئی اور غیر محسوس فتح کا لیل پھیل چھپا کر دیا جائے۔

اگر حقیقت پر نظر ڈالی جائے ”باطنی فتح“ ایک حرف بے معنی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، فتح صرف ایک ہی قسم کی ہوتی ہے اور وہ ظاہری ہوتی ہے۔ فتح وہی ہے جو نظر آئے، دیکھی جائے، محسوس کی جائے، جسے ہر دیکھنے والی آنکھ فتح قرار دے، نہ یہ کہ وہ غیر مرئی ہو، غیر محسوس ہو، عالم اسرار یا عالم روحانیت کی کوئی ایسی عجیب کیفیت ہو جسے صرف فلسفے کے زور اور منطق کی قوت سے ثابت کیا جاسکے جو حکماء و علماء کی ڈرف نگاہوں کی مرہون کرم ہو۔ حقیقت کی دنیا سے دور صرف ذہن کے نکتہ رس گوشوں میں وجود رکھتی ہو اور جسے دنیا کی نگاہوں سے دور صرف خوابوں کے جزیرہ میں ساکن قرار دیا جائے۔ اگر اس طرح محض فلسفیانہ نکتہ آرائیوں پر فیصلہ کا انحصار کروا جائے تو دنیا کی ہر فتح کو شکست اور ہر شکست کو فتح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح و شکست کا منہوم ہی دنیا سے محدود کیا جاسکتا ہے!

”فتح باطنی“ کے حرف اللہ یعنی کو معنی پر بنانے کے لئے جو بات بڑے شہ و مد سے کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حق پرستوں کے ظاہری طور پر شکست کھا جانے کے باوجود ان کے اصول باقی رہے اور باطن ان کے اصولوں کو مٹانے میں کامیاب نہیں ہوا، اسی کو باطنی فتح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو باطن کی ”فتح باطنی“ کا اعلان بھی اسی شہ و مد سے کیا جاسکتا ہے جس کا مظاہرہ حق کی فتح باطنی کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے۔ اس لئے جہاں حق کے اصول نہیں مٹے وہیں باطن کے اصول بھی فنا نہیں ہوئے۔ اگر حق کے نقوش قائم رہے تو باطن کا تصور بھی باقی رہا۔ اگر باطن کی قوتیں حق کو محو نہیں کر سکیں تو حق بھی باطن کو ناپید کرنے سے قاصر رہا۔ ایسی حالت میں اگر حق کے

اصولوں کا دنیا میں باقی رہنا حق کی فتح باطنی ہے تو باطن کے اصولوں کی بھابھ باطن کی فتح باطنی قرار دی جانے چاہیے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حق کی ”فتح باطنی“ سے یہ مراد ہے کہ باطن حق کو مٹا دینا چاہتا تھا اور وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تو اس کے جواب میں یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ حق کا مقصد بھی باطن کو فنا کر دینا رہا ہے اور وہ بھی اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اگر حق کو مقصدی اور باطنی فتح نصیب ہوئی تو اسی حد تک باطن کی فتح باطنی سے بھی انکار محال ہے۔

اس صورت میں باطن کا پہلہ حق کے مقابلہ میں یقیناً بگراں معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ باطن کی فتح ظاہری تو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ یہی باطنی فتح، یعنی اصولوں کی بھابھ — تو اس معاملہ میں حق اور باطن مساوی الرتبہ نظر آتے ہیں۔ حق کو تو صرف باطنی فتح کا مالک قرار دیا جاتا ہے لیکن باطن کو ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی فتح حاصل ہوتی نظر آتی ہے جس سے اس کا پہلہ قطعاً بگراں ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فتح میں ظاہری اور باطنی کا فلسفیانہ امتیاز ان لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو حقیقت کی دنیا سے دور، خوابوں کی دنیا میں زندگی بسر کرنے کے قائل ہوئے ہیں لیکن حقیقت پسند اور صاحب فکر انسان اس تفریق پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ ان کے نزدیک فتح صرف وہ ہے جو دیکھی اور پرکھی جاسکے جس کے ثبوت کے لئے صرف واقعہ بیان کر دینا کافی ہو۔ فلسفہ کی امداد ضروری نہ ہو، جسے ایک عام آدمی بھی فتح قرار دے سکے، علماء کی نکتہ آرائیوں میں اس کا وجود تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

اگر باطنی، اصول یا مقصدی فتح کے اس فلسفہ کو تسلیم کر لیا جائے جو آج بڑے شہ و مد سے بیان کیا جاتا ہے تو فتح مکہ کو جسے قرآن پاک نے فتح مبین قرار دیا ہے صرف فتح ظاہر قرار دینا پڑے گا اور ابوسفیان کے لئے یہ دعویٰ کرنا حق بجانب ہو گا کہ اسی جنگ میں

اسے "باطنی اور مقصدی" فتح نصیب ہوئی۔ اس لئے کہ ہلا سحر اس کی نسل نے اسلام کو اپنا کھلونا بنا کر دیئے عرب کی فرمانروائی حاصل کر لی اور جن "اصولوں" کے لئے ابو سفیان جنگ کرتا رہا تھا وہ پیغمبر اسلام کی آنکھ بند ہونے ہی دنیا پر غالب آگئے ظاہر ہے کہ ابو سفیان کے اس دعویٰ کو کوئی سلیم العقل انسان ایک لمحہ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا اور فتح مکہ کے فتح مبین ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ یہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ فتح باطنی دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی اور یہ لفظ محض اس لئے تراش لیا گیا ہے کہ باطل کی فتح ظاہری کا اعلان و اعتراف کرنے سے جو ذہنی و روحانی کرب محسوس ہو تا تھا۔ اسے حق کی ایک خیالی فتح کے دل خوش کن تصور سے دور کر دیا جائے اور اگر حق کی فتح مبین کا اعلان نہ کیا جاسکے تو کم از کم پہلے مساوی ضرور کر دیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ حق اور باطل میں جب بھی تصادم ہوا تو حق کو ہمیشہ ظاہری فتح نصیب ہوئی۔ فتح مبین — اور تاریخ پر اگر ایک ذرا بھی گہری نظر ڈالی جائے تو اس واقعہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے کہ ظاہری فتح باطل کو حاصل ہوا کرتی ہے!

حقیقت یہ ہے کہ حق کی علیبرداری کے فرائض ہمیشہ انبیاء اور اوصیاء علیہم السلام نے انجام دیئے ہیں اور یہ وہ دولت مقدسہ تھیں جو عقل و حکمت ربانی کی امین تھیں ان کی عقل عام عقل بشری سے کہیں افضل اور انکی حکمت و تدبیر عام انسانی فہم سے کہیں برتر تھی، ان کا ہر فعل عقل و حکمت پر مبنی ہوتا تھا اس لئے وہ کسی ایسی جنگ کا آغاز نہیں کر سکتے تھے جس کا انجام شکست ہو اس لئے کہ شکست اور ناکامی — خواہ اسے فتح باطنی کہہ کے اس کی شان میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کیوں نہ کی جائے — کسی حالت میں اچھی چیز نہیں کہی جاسکتی۔ صاحبان عقل اسی وقت لڑتے ہیں جب وہ اپنی طاقت اور حریف کی قوت کا اندازہ لگا کے یہ یقین کر لیتے ہیں کہ فتح کا سرا نہیں کے سر رہے گا اور

دشمن لاکھ طاقتور نظر آئے لیکن ان کے مقابلہ میں ضرور مغلوب رہے گا۔ شکست کھانے کے لئے لڑنا نہ تو چھندی ہے اور نہ خیر۔ ایسی حالت میں علیبرداران حق امتلاء حکمت ربانی اور قدرت کے مقرر کردہ قاندرین نسل انسانی کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ایسی لڑائیاں لڑیں جن میں شکست لازمی ہو یا کم از کم ایک عام انسان کو مغلوب و مقهور نظر آئیں۔

اور باطل پرستوں کے زیر اثر مرتب کردہ تاریخیں خواہ کچھ کہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ حق اور باطل، سچ اور جھوٹ میں جب بھی ٹکراؤ ہوا ہے تو فتح مبین ہمیشہ حق پسندوں کے ہاتھ رہی ہے۔ باطل کو ہمیشہ ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے اور باطل کی فتح ظاہری کے جو افسانے مشہور کر دیئے گئے ہیں وہ پادور ہوا سے زیادہ نہیں ہیں۔

قرآن پاک نے جو حقائق و معارف کا گنجینہ اور حکمت و بصیرت کا خزانہ ہے نسل انسانی کو اس حقیقت سے بڑے خوبصورت انداز میں روشناس کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل كان زهوقا

"حق آیا اور باطل مٹا، بے شک باطل مٹنے والا ہے۔"

یہ ایک عظیم تاریخی حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے پیش کیا ہے لیکن مسوس کہ باطل کی ظاہری فتح کے غمگنائے باطل نے ہماری نگاہیں اس حقیقت تک نہیں پہنچنے دیں اور حق کی جس فتح مبین کی جانب قرآن پاک نے ہمارے ذہنوں کو موڑنا چاہا تھا وہ ہماری نگاہوں سے آج تک روپوش ہے۔

قرآن نے حق کی فتح کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ انتہائی واقفیت پر مبنی ہے اور جن لوگوں نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اس کلام الہی کی تصدیق کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں چند تاریخی شواہد پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح



ہو جائے گی کہ حق کو ہمیشہ ظاہری فتح نصیب ہوئی اور حق کبھی اس کا تھک نہیں رہا کہ اس کی نام نماند شکست پر باطنی فتح کا لیل چسپاں کر کے اسے مرہون منت کیا جائے۔

تاریخ انسانی میں حق اور باطل کا سب سے پہلا ٹکراؤ اس دن ہوا جس دن شیطان نے آدمؑ کی خلافت ظاہری کو چیلنج کیا۔ اوہر آدمؑ کے جسد خاکی میں روح ہوا اوہر معرکہ حق و باطل آراستہ ہوا اور اس معرکہ کا جو انجام ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آدمؑ اور شیطان دونوں جنت سے نکلے لیکن اس عالم میں کہ شیطان کی گردن میں ابدی لعنت کا طوق اور اس کے سینہ پر ”رجیم“ کا تمغہ آویزاں تھا۔ اس کے برعکس آدمؑ کے فرق مبارک پر خلافت ارضی کا تاج جگمگا رہا تھا۔ دوش پر روئے حکومت جلوہ پار تھی، نبوت کی مہر انگشت مقدس کی زینت تھی، رسالت کا جلال جبین اور سے نمایاں تھا اور مجبور ملا کہ ہونے کا شرف آپ کی عظمت کا نقیب تھا۔ اس ظاہری اختلاف سے قطع نظر بھی کر لیجئے تب بھی اس حقیقت سے کہ شیطان اپنے مقصد میں قلعہ بنا کام رہا۔ ملا کہ نے آدمؑ کو سجدہ کیا اور اس باب میں شیطان کا اعتراض برہم قدس میں تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس آدمؑ کا مہماب رہا۔ مجبور ملک بھی قرار پائے۔ خلافت الہی کے امین بھی مقرر ہوئے اور زمین کی بادشاہی بھی ان کو حاصل ہو کے رہی۔ یہ تھی حق کی فتح مبین جس سے کسی صاحب عقل کے لئے انکار محال ہے۔

حق اور باطل کا دوسرا ٹکراؤ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہوا۔ ایک طرف اکیلے نوحؑ تھے اور دوسری جانب پوری قوم، ایک سمت انتہائی کمزور اقلیت اور دوسری طرف بے پناہ اکثریت، حق کا پرستار ایک اور باطل کے شیدائی لاکھوں۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا اس ٹکراؤ کا؟ یہی کہ طوفان کی ایک موج نے باطل کا سفینہ غرق کر دیا اور کشتی نوحؑ نجات و سلامتی کے مظہر قرار پائی۔ سارے باطل پرست نذر اجل ہو گئے اور دنیا پر حق پسندوں کا راج اس شان سے قائم ہوا کہ نوحؑ آج تک آدمؑ جانی کے نقیب سے

یاد کئے جاتے ہیں۔

اسے فتح مبین نہیں کہا جائے گا تو پھر اور کیا کہا جائے گا؟

حق اور باطل کا تیسرا ٹکراؤ سرزمین نیا پر ہوا جہاں باطل کے پاس حکومت کا جلال بھی تھا، عساکر کا لشکر بھی تھا، خزانوں کی قوت بھی تھی، اکثریت کی طاقت بھی تھی۔ مجاہدوں اور کاہنوں کے اثرات بھی تھے اور ان کے مقابلہ میں ایک تن عماحق پرست تھا جو دورانہ اور شیرانہ انداز میں باطل کو دعوت مبارزت دے رہا تھا۔ باطل کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ حق کی آواز کچل دی جائے اور حق ساری دنیا پر چھا جانے کے لئے چل رہا تھا۔ مقابلہ ہوا۔ باطل کی قوتوں نے ابراہیمؑ کے لئے آگ تیار کی لیکن حق پر آج نہیں آئے پائی۔ نمرود کی خدائی حرف باطل کی طرح فنا ہو گئی اور ابراہیمؑ نے نہ صرف یہ کہ سرزمین نیا پر توحید کا پرچم لہرایا بلکہ آس پاس کے علاقوں میں بھی وحدانیت اور صداقت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ عربستان میں ان کے بڑے صاحبزادے اسلعلؑ ان کی تحریک کے نقیب قرار پائے۔ شام میں اسحاقؑ نے ڈیرے ڈال دیے اور سدوم میں لوطؑ ان کے مشن کے محاذ مقرر ہوئے۔ پورا جزیرہ نمائے عرب حق کی تحریک اور حق کی فتح کا مرکز بن گیا اور یہ مرکز اس شان سے بنا کہ آج جبکہ نمرود اور اس کے ساتھیوں کا کوئی نشان سطح ارض پر موجود نہیں ہے۔ ابراہیمؑ کا تعمیر کیا ہوا امکان ان کی تحریک توحید کا سب سے تابناک اور درخشندہ نشانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

مصر کی سرزمین پر حق و باطل میں جو تصادم ہوا وہ تاریخ اسلامی میں اب ذر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ ایک طرف فرعون تھا اور حکومت کا مظہر اقلیت مصری قوم تھی اور اس کے قریبی یافتہ علوم و تمدن، سلطنت کا زعم تھا اور دولت کا فرور اور دوسری سمت ایک کبیل پوش اور یورپین قبیلہ تھا جو ہر قسم کے ظاہری ساز و سامان سے مہر تھا۔ فرعون بنی اسرائیل کو ظلام بنائے رکھے اور اپنی ربوبیت تسلیم کرانے پر مصر تھا اور موسیٰؑ

بنی اسرائیل کو آزاد کرانے اور اس جھوٹی روایت کو مٹانے پر تھے ہوئے تھے۔ ککراؤ ہوا اور انتہائی سخت ہوا۔ نمرود سے بڑھ کر فرعون کو ایک اور طاقت نصیب تھی اور وہ تھی علم اور سحر کی قوت، لیکن جس طرح ابراہیمؑ کے ہاتھوں نمرود کو شکست ہوئی اسی طرح موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعون غرق دریائے خلالت ہوا۔ مصری سلطنت ختم ہو گئی اور سرزمین شام پر بنی اسرائیل کی حکومت قائم ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کی یہ فتح مبین کسی "باطنی" پردہ کی محتاج نہیں ہے۔ یہ کھلی ہوئی ظاہر اور روشن فتح تھی، ایسی فتح جو صرف حق کے لئے مقصوم ہے۔

سرزمین فلسطین پر حق اور باطل میں ککراؤ ہوا۔ اب مقابلہ اور زیادہ سخت تھا۔ رومی سلطنت اور یہودی قوم دونوں مسیح کے مقابلہ میں صف آراء تھیں۔ سلطنت، اکثریت، طاقت، دولت، علم، مذہب فرض کیا تھا جو باطل کے قبضہ میں نہ تھا اور اس کے مقابلہ میں تھا ایک کمزور اور نتہ اللہ کا سچا بزم۔ ککراؤ ہوا اور خوب ہوا۔ ایک طرف تلوار تھی اور دوسری جانب محبت تھی جو کچھ ہوا وہ دنیا پر آشکار ہے۔ یہودی ذلیل ہوئے قیصر کی نسل مسیح پر ایمان لانے پر مجبور ہوئی اور خود مسیح کو یہ عزت و عظمت نصیب ہوئی کہ آج دنیا کے ایک ارب سے زیادہ عیسائی اور ایک ارب سے زیادہ مسلمان ان کا نام سنتے ہی اوب سے گرد نہیں خم کر دیتے ہیں۔

قارن کی چوٹیوں سے حق کا آواز بلند ہوا تو پورے عرب میں بل چل چک گئی۔ قریش کی خوچکان تلواریں نیاموں سے اٹل پڑیں۔ عرب سوراؤں کی تیروں پر بل پڑ گئے خبیر کے یہودی ہوں یا جوک و فجران کے نصاریٰ مکہ کے بت پرست ہوں یا نجد کے صائکن، سب ایک مجاہد حق کے مقابلہ میں صف بستہ ہو گئے مقابلہ ہوا اور بار بار ہوا۔ نتیجہ جو نکلا وہ قرآن کے الفاظ میں لٹا ہوا حنا لک لٹا ہوا مبینا کی تصویر تھا، قریش کی تلواریں کند ہو گئیں، یہودیوں کی سازشیں ناکام ہو گئیں، دشمنوں نے ہتھیار ڈال دیئے

اور پورا جزیرہ نمائے عرب توحید کے ان نعروں سے گونجنے لگا جس کی بازگشت سے آج سارا عالم گونج رہا ہے۔

حق و باطل کے معرکوں کی یہ محض چند مثالیں ہیں جن میں سے ہر ایک میں حق کو فتح مبین حاصل ہوئی ہے۔ ایسی ہی اور دوسری بیسیوں مثالیں انبیاء کے مجاہدات سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہو گا کہ فتح مبین ہمیشہ حق کا مقصوم ہے اور ناکامی و نامرادی باطل کی تقدیر، لیکن ہم ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے اس لئے کہ یہ چیز ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ حق و باطل کی کشمکش کے سلسلہ میں ہمارے دنوں میں جو تصور اٹھا دیا گیا ہے حق کی پامالی اور باطل کی ظاہری سرانندی کا جو واہمہ ہمارے لئے شیطان نے تیار کر دیا ہے اور شیطیت و الوہیت کے ککراؤ کے متعلق جو غلط فہمیاں عوام میں پیدا ہو گئیں ہیں ان پر سے پردہ اٹھا دیا جائے اور اس حقیقت کو برآگاہندہ نقاب کر دیا جائے کہ:-

فتح مبین ہمیشہ حق کے ہاتھ رہتی ہے۔

باطل ہمیشہ مغلوب اور ناکام رہتا ہے۔

باطل کی ظاہر اور حق کی باطنی فتح دراصل کوئی معنی نہیں رکھتی اس لئے کہ باطل کو دراصل کسی قسم کی فتح نصیب نہیں ہوتی۔ فتح صرف حق کو حاصل ہوتی ہے اور یہ فتح اتنی کھلی ہوئی اور روشن ہوتی ہے کہ اس سے انکار ہر سلیم العقل انسان کے لئے محال ہے۔

## آل رسولؐ کا مجاہدہ حق

حضرت سرور کائنات ﷺ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی باب نبوت بند ہو جاتی رہائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور بنیائے طاہرین کے شاندار مجاہدات حق کا دور اختتام کو پہنچا، لیکن شیطنیت اور الوہیت کی جنگ ختم نہیں ہوئی یہ جنگ جاری رہی اور آج بھی جاری ہے اس لئے کہ شیطان نے ابھی تک شکست تسلیم نہیں کی ہے اور حق کے مقابلہ میں اس کی سرگرمیاں آج بھی اسی زور و شور سے جیسے کہ دور نبوت میں جاری تھیں۔

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دنیا پر ایک عظیم احسان یہ ہے کہ آپ نے شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی آل پاک ہمارے درمیان چھوڑی، جس نے دوسرے مہدلت گتہ نبوت کے بعد حق کی قوتوں کی قیادت فرمائی اور جس کے فیوض و برکت و تعلیمات کی روشنی میں آج بھی حق کے پرستار شیطان اور اس کی قوتوں کا دلیرانہ مقابلہ کر رہے ہیں۔

آل رسولؐ کے مجاہدات کی تاریخ انتہائی شاندار اور تابناک ہے لیکن ملت اسلامیہ کی اس سے بڑی بد قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان مجاہدات پر کبھی صحیح روشنی میں نگاہ نہیں ڈالی جاتی اور حق کی خاطر ان ذوات مقدسہ نے جو سعی و جہد فرمائی ہے اس پر دشمنوں کی توخیر دوستوں کی نگاہ بھی بہت کم جاتی ہے۔

اس حقیقت کو بھی بیان کرتے ہیں کہ چھستان اسلام کی شاہدانی آل رسولؐ کی مرہونِ کرم ہے۔ دلف ایمان کو اگر کسی نے سنوار تو وہ بھی بزرگوار تھے اور دینِ حنیف

اگر آج زندہ ہے تو انہیں ذوات مقدسہ کے دم سے ہے، لیکن اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود آئمہ آل رسولؐ کے حالات کی تحقیق اور ان کے عظیم کارناموں کے حعلق ٹھکر و تھقل پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ان کی تحریک کو سمجھنے، ان کے انقلاب آفرین و فکرائیگز اقدامات کے صحیح اسباب و علل کو معلوم کرنے اور تاریخ اسلام میں ان کے حقیقی کردار اور موقف کا پتہ چلانے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور یہی وجہ ہے کہ ان کی عظمت کے ہزاروں گوشے ایسے موجود ہیں جو آج تک پردہ اخفا میں ہیں اور اسلامی تاریخ میں ان کو جو مقام و مرتبہ حاصل ہے اس پر عوام تو رہے الگ خود خواص کی نگاہیں بھی نہیں پہنچ سکی ہیں۔

کیا ستم ہے کہ آل رسولؐ سے عشق و ارادت کا دعویٰ رکھنے والے بھی آل رسولؐ کے حالات پر غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی تلاش و تحقیق مناظرہ بازی سے آگے نہیں بڑھتی، یہی وجہ ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ کے حقائق اچھی اور عالمانہ تصانیف بہت کم بازار میں آئی ہیں اور جو کتابیں لکھی بھی جاتی ہیں ان میں وہی فرسودہ اور پامال باتیں ملتی ہیں جو اب تک ہزاروں مرتبہ کہی اور لکھی جا چکی ہیں۔ ذہنی اور فکری انحطاط کا یہ دردناک نظارہ ہمارے لئے حد درجہ تکلیف دہ ہے اور اس کے نتیجہ میں خود اہل بیتؑ کو جو نقصان پہنچ رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

چونکہ ذاکری کے نقطہ نظر سے اہل بیتؑ کو مظلوم، مقهور، پامال، بے دست و پا، مجبور، بے بس اور ناکام ظاہر کرنا حد درجہ مفید ہے اور اس کے نتیجہ میں مجلس میں گریہ بھی خوب ہو جاتا ہے اس لئے ہمارے داعیین آل رسولؐ کی زندگی کے انہیں پہلوؤں کو ابھارتے اور اجاگر کرتے ہیں جن سے یہ ذوات مقدسہ زیادہ سے زیادہ ناکام، محروم اور ستم رسیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے پہلوؤں پر نہ تو غور و فکر کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور نہ زور بیان صرف کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ عوام میں یہ

احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ آل رسول کی زندگی حسرت و نامرادی اور اٹک و آہ کی ایک طولانی داستان ہے۔ مظلومی و پامالی درد انگیز اور الم آفرین کہانی ہے۔ ایک انسان نامی، ایک تاریخ درد و غم ہے اور اس اعتبار سے عوام کے لئے قطعاً ناقابل تقلید ہے۔ اس لئے کہ انسان فطری طور پر نامرادی اور غم سے دور رہنا چاہتا ہے اور کسی ایسے انسان کی نامی قبول نہیں کر سکتا جس کی زندگی ہمہ درد و ناکامی ہو۔ عوام جب یہ دیکھتے ہیں کہ آئمہ آل رسول کو یہ جرم حق پرستی، عیشہ ناکامی، تکلیف اور غم کا سابقہ رہا تو خود ان کا فطری جذبہ حق پرستی مضطرب ہو جاتا ہے اور ان کے دلوں میں لازمی طور پر یہ خیال ابھرتا ہے کہ حق پرستی کا نتیجہ ایک ناکام زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر کہ عوام کی اکثریت ایک ناکام، شکست خورہ اور پامالی زندگی پر قناعت نہیں کر سکتی۔ چند اصولوں کی خاطر زندگی کی ہر نعمت کو خیر یاد کہہ دینا اور مریض الم بن کر زندگی بسر کرنا چاہے فلسفیانہ طور پر کتنا ہی بلند تر اصول انسانیت ہو لیکن عوام کے لئے عملی چیز نہیں ہے۔ ایسی حالت میں جب آل رسول کو ایک ناکام اور شکست خوردہ عنصر کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام ان کی تقلید و نامی کا تصور ترک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ عملی ہو رہا ہے اور ہمارے عوام کا کردار دن رات آل رسول کا ذکر سنتے رہنے کے باوجود جو کچھ ہے وہ ہمارے اس دعوے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ آل رسول کے مصائب نہ بیان کئے جائیں یا ان کی مظلومی کی داستان میں کوئی کمی کر دی جائے اس لئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے آئمہ کے مصائب کا تذکرہ دراصل نسل انسانی کی معراج کا تذکرہ ہے۔ اعلیٰ اقدار انسانی کا تذکرہ ہے۔ انسان کی اخلاقی و روحانی بلندی کا تذکرہ ہے اور اس کے نتیجہ میں حقانیت کا آفتاب اس شان سے چمکتا ہے کہ باطن کی ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ آل رسول کے مصائب کا ذکر صرف حقل، ایثار و فدا، خلوص و لیبیت، شرافت و ضبط نفس اور سچی حق پرستی پیدا

کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں احیائے دین ہوتا ہے۔ حقیقت اسلام جلوہ لگن ہوتی ہے۔ رسول اللہ کے پیغام کی اشاعت ہوتی ہے اور آنسوؤں کے سیلاب میں سارے گناہ خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں آل رسول کے مصائب ضرور بیان ہونا چاہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے مجاہدہ دینی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ ان سے بھی لیل بیت طہیم اسلام کی سیرت کے بہت سے نقوش ابھرتے ہیں اور حق و باطل کی اس کشمکش میں جو خود ہماری زندگی کے ہر لمحہ میں جاری رہتی ہے ہمیں ایک نیا عزم، ایک نئی ہمت، ایک نیا ولولہ، جفا اور استقامت، علی الحق کا ایک نیا درس ملتا ہے۔ ہمیں آل رسول کی کامرائیوں کی داستان بھی عوام کے سامنے پیش کرنا چاہیے اس لئے کہ جفا حق و باطل میں ان کی ہر فتح ہمارے لئے زندگی کا ایک نیا پیغام ہوگی۔ صبر و استقامت کا ایک نیا درس ہوگی۔ عزم و ہمت کی ایک نئی تعلیم ہوگی اور اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ حق پر مرتلے والے ہمیشہ کامران و ہامراد ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی فتح مبین کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی کامیاب ہوتی ہے اور ان کی موت بھی کامیاب حقیقی عزت اور سربلندی انہیں کے لئے ہوتی ہے۔ ابدی نعمتوں سے وہی سرفراز کئے جاتے ہیں اور جہاں آخرت میں ان کے مراتب اعلیٰ ہوتے ہیں وہیں خود اس دنیا میں بھی سچی اور پائیدار فوژ و فلاح انہیں کے حصے میں آتی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ آل رسول کی مقدس زندگیوں کا ایک حصہ مصائب و آلام میں بسر ہوا لیکن یہ مصائب ہی دراصل ان کی کامیابی و کامرائی کا ذریعہ بنے۔ دنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر مقصد کے حصول کے لئے انسان کو سعی و جہد کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس سعی و جہد کے دوران میں اسے مصائب اور تکالیف سے گزرنا پڑتا ہے۔ کوئی مقصد بغیر تکلیف و سعی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مقصد جتنا بلند ہوگا، مراد جتنی

اعلیٰ ہوتی ہے، مطلوب جتنا گراں قدر ہوتا ہے محنت اور تکلیف بھی اسی درجہ کی ضروری ہوا کرتی ہے۔ آل رسول کے مقاصد انتہائی بلند تھے اس لئے لازماً ان کو عظیم مصائب اور صبر آنا تکالیف کا سامنا کرنا پڑا لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کی قربانیاں رائیگاں گئیں۔ ان کے مصائب بے نتیجہ ثابت ہوئے؟ ان کی محنت و تکلیف بے سود تھی اور وہ ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہوئے۔ جن کے لئے ان کو قربانیاں پیش کرنا پڑی تھیں؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کا دعویٰ کرنے کی کسی کو مجال نہیں ہو سکتی اس لئے ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ جہاں آل رسول کو عظیم ترین مصائب کا سامنا ہوا وہیں انہوں نے عظیم ترین کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آل رسول کی حقیقی عظمت بھی اسی چیز میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے عظیم مقاصد کے لئے عظیم قربانیاں پیش کیں اور بلاخر ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ جن کا حصول ان نامساعد حالات اور اس ہمت شکن ماحول میں بڑے سے بڑے انسان سے بھی ممکن نہیں تھا۔

میرا شکوہ بس اتنا ہے کہ ہمارے وطنین جہاں آل رسول کے مصائب بیان کرتے ہیں وہ ان عظیم کامرائیوں پر بہت کم روشنی ڈالتے ہیں جو ان صبر آنا تکالیف کے نتیجہ میں لٹل بیت کو نصیب ہوئیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جب آئمہ آل رسول جہاد حق میں عظیم قربانیاں پیش کرتے رہنے کے باوجود حسرت و نامرادی کا شکار رہے تو پھر عام انسان اس مجاہدہ میں شمولیت اختیار کر کے کون سی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں؟ اس سے ان کا عزم حق پرستی مضل اور ان کی ہمت شکستہ ہو جاتی ہے اور وہ اس جہاد حق میں جرات مندانہ طریقہ پر حصہ لینے سے گریز کرنے لگتے ہیں جس پر دین کی بناء انسانیت کی فلاح، ملت کے ارتقاء اور دنیا کے فوز و فلاح کا انحصار ہے۔ اس کے برعکس اگر آل رسول کے مصائب کے تذکرہ کے ساتھ ہی ان کی کامرائیوں اور فتح مندوں کا ذکر بھی جاری رہے تو اس سے عوام میں حق پر مریٹے کا

عزم نازہ ہو گا اور وہ حق کی خاطر قربانوں کا عظیم اور پیش قرار انجام لینے کے بعد خود ہر قربانی پیش کرنے پر آمادہ نظر آئیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے آئمہ اسی حکمت ربانی کے امین اور اسی تدبیر الہی کے حامل تھے جو انبیاء کی ذوات مقدسہ میں جلوہ گر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح انبیاء نے حق و باطل کے ہر معرکہ میں فتح مبین حاصل کی۔ اسی طرح آئمہ آل رسول نے بھی ہر ٹکراؤ میں مکمل فتح حاصل فرمائی۔ وہ حق کے پیچھے جاگتے پیکر بلکہ مجسم حق تھے اور حق کو بہ نص قرآنی ہمیشہ فتح نصیب ہوتی ہے اس لئے ان کو بھی ہمیشہ فتح و کامرائی نصیب ہوئی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کامیابیوں کی مفصل روداد دنیا کے سامنے پیش کی جائے اور ان حق نما حضرات کی سعی و جہد کی ایک مکمل تصویر عوام کے سامنے لائی جائے لیکن یہ کام بہرحال علماء کا ہے اور وہی اسے مکمل انجام دے سکتے ہیں۔ راقم المعروف نہ تو عالم ہے اور نہ اس عظیم موضوع پر قلم اٹھانے کا اہل۔ اس کا مقصد اس مقالہ سے صرف اتنا ہے کہ ارباب ملت کو آل رسول کی سیرت طیبہ پر ایک نئے نقطہ نظر سے غور کرنے کی دعوت دے دے اور بس۔ اور اگر وہ اپنی اس کاوش میں کچھ بھی کامیاب ہو گیا تو اس کو اپنے لئے سرمایہ نجات تصور کرتے ہوئے مطمئن ہو جائے گا۔

☆══════☆☆══════☆

## اسلام — ایک انقلابی تحریک

اسلام کے علاوہ سارے مذاہب چند عقائد و عبادات اور چند مراسم اور اخلاقی ضابطوں کا مجموعہ ہیں۔ مگر اسلام روحی لہ اندازاً صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل ساری دنیا میں یہ تصور عام تھا کہ مذہب چند عقائد اور چند مراسم کا نام ہوا کرتا ہے اور جو شخص ان عقائد پر ایمان رکھتا ہے اور چند مراسم انجام دے لیتا ہے وہ بچا بچا ہی آدمی ہوتا ہے۔ اپنی عمل زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کو مذہب کی گرفت سے آزاد تصور کیا جاتا تھا۔ سیاست، معاش، تعلیم، تہذیب اور تمدن وغیرہ سے مذہب کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان امور میں ہر شخص خود اپنے پسندیدہ تصورات کی پیروی کے لئے آزاد تھا۔

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذہب کے نام سے جو چیز دنیا کے سامنے پیش کی وہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ آپ نے جہاں دنیا کے سامنے چند عقائد و عبادات پیش فرمائے وہیں انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک مکمل قانون بھی پیش فرمایا اور اس ”آزادی“ کو بالکل سلب کر لیا جو انسانوں کو حاصل تھی۔ آپ نے دین کے نام پر دراصل ایک عظیم انقلابی تحریک کا آغاز فرمایا۔ ایسی انقلابی تحریک جو ماضی کے تمام آثار باطلہ کو مٹانے کے لئے اور اعلیٰ اخلاقی و روحانی اقدار پر منظم کرنا چاہتی تھی۔ جو سیاست، معاش اور تمدن کے ہر شعبہ پر بلوی تھی اور ان میں سے ہر معاملہ میں انقلاب آفریں اصلاحات وجود میں لانا چاہتی تھی جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو نظام الہی کے مطابق استوار کرنا چاہتی تھی جو انسانی حاکمیت کے ملعون تصور کو ختم کر کے زمین پر

اللہ کی بادشاہت قائم کرنا چاہتی تھی اور جو ایک ایسی اخلاقی روحانی اور ذہنی نشا پیداکرنا چاہتی تھی جس میں انسان نکلے اللہ کے مطابق وہ تمام ترقیاں حاصل کر سکے جو خلیفہ اللہ فی الارض کے شایان شان کی جاسکتی ہیں۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس عظیم روحانی انقلابی تحریک کے حقیقی قائد اعظم تھے۔ آپ نے یہ تحریک شروع فرمائی تو جس شخص نے سب سے پہلے اس تحریک کو اس کے سارے عناصر و مضمرات کے ساتھ قبول کیا اور اسے پروان چڑھانے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دینے کا وعدہ کیا وہ ایک نوجوان تھا۔ علی مرتضیٰؑ اس بلند فطرت، بلند حوصلہ، بلند ہمت اور بلند نظر نوجوان نے جس کی فطرت میں شہنم کی لطافت اور سنگ و آہن کی صلابت ایک ساتھ سموی ہوئی تھی اسلامی تحریک کے قائد اعظم کی آغوش میں تربیت پائی تھی اس لئے وہ اپنے قائد کے افکار و نظریات سے کما حقہ آگاہی رکھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا قائد اس وقت کے مروجہ نظام کے کن اجزاء سے اختلاف رکھتا ہے اور حصول کامیابی کے بعد کس قسم کا نظام نو قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس تحریک کے سارے خدو خال جانتا تھا اور اپنے قائد کی مزاجی ساخت کو بھی خوب پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس قسم کے حالات میں اس کا قائد کیا طرز عمل اختیار کرے گا۔ اس نے اپنے قائد کے مزاج، اس کے طریقہ کار، اس کے انداز فکر اور اس کی سیرت کے سارے نقوش کی اشاعت کو اپنے قلب و روح کا جزو بنا لیا تھا۔ اور اسے اس تحریک سے اتنی گہری دلچسپی، اتنا دلنشین عشق اور ایسی ہی محبت ہو گئی تھی کہ وہ جیتا تھا تو اس تحریک کی کامیابی کے لئے مور مرنا چاہتا تھا تو جس کی جہاد سے لے کر یہ تحریک اس کے جسم و جان کا ایک جزو بن چکی تھی۔ اس کی ہر سانس اس عظیم تحریک کے لئے وقف تھی اور وہ اس کی کامیابی کے لئے اپنے قائد کے اشارہ پر دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے پر تیار تھا۔

تحریک اسلامی کا قائد اعظم بھی اس حقیقت کو خوب جانتا تھا اسے اس نوجوان کی عظیم صلاحیتوں اور اس کی اعلیٰ فطری استعدادوں کا بھی خوب احساس تھا۔ وہ اپنے شریک نور کے جذبہ فداکاری، خلوص اور مستقل مزاجی سے بھی کما حقہ آگاہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہی نوجوان آگے چل کر اس کے مشن کو کامیاب بنائے گا۔ اس لئے

کہ

جہاں تک اس تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا تعلق ہے یہ نوجوان ایک بے مثل عالم، ایک بے نظیر حکیم، ایک مدیم الشال خطیب، ایک بلند پایہ انشاء پرداز اور ایک بے پناہ معلم اخلاق و روحانیت کی حیثیت سے قطعاً اس کا اہل ہے کہ وہ اس تحریک کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔

جہاں تک اس تحریک کو دشمنوں کے مقابلہ سے بچانے اور مخالفین کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا تعلق ہے یہ نوجوان ایک مدیم الشیر جرنیل اور ایک مافوق الفطرت سپاہی کی حیثیت سے اس کی پوری اہلیت رکھتا ہے کہ تحریک مدافعت کی ذمہ داریاں اسی کے سپرد کی جائیں۔

اور

جہاں تک اس تحریک کے پھیلاؤ اور اس کی بقاء کا تعلق ہے اس نوجوان میں ایثار، قربانی، فداکاری اور جان سپاری کے وہ جوہر موجود ہیں کہ وہ اپنا اور اپنے گھرانے کا خون دے کر بھی اس تحریک کی جڑوں کو مستحکم اور اس کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کر سکتا ہے!

پیغمبر اسلام نے اپنی تحریک کا آغاز ایک دعوت سے کیا جسے تاریخ اسلام میں ”دعوت ذوالشیرہ“ کہا جاتا ہے۔ اس دعوت میں مکہ کے تمام اکابر موجود تھے۔ پیغمبر نے ہاشمی سرداروں کے سامنے اپنی تحریک پیش کی تو بزم میں سناٹا چھا گیا، چہروں پر وحشت برسنے لگی اور پیغمبر کی تقریر کا جواب ایک طویل خاموشی سے دیا گیا۔ اس ظلم سکوت کو جس شخص نے توڑا وہ یہی نوجوان تھا جس نے بڑے شیرازہ انداز میں انتہائی بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعظم قریش کے سامنے بڑے مخالفی کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ وہ اس تحریک کو پروان چڑھانے میں جان کی بازی لگا دے گا اور بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس عظیم روحانی تحریک کو پروان چڑھانے میں جان کی بازی لگا دے گا اور بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس عظیم روحانی تحریک کو آگے بڑھانے میں پوری پوری مدد دے گا۔

پیغمبر اسلام نے بھی سچی تدبیر شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بزم میں علی کو اپنا وصی، وزیر اور خلیفہ مقرر کروا اس لئے کہ آپ یہ جانتے تھے کہ اسلامی انقلاب سے جو گہری شینگی، جو سچی ارادت علی کو ہے، نیز جو اعلیٰ قائدانہ صلاحیتیں علی میں موجود ہیں وہ کسی دوسرے انسان میں ممکن نہیں ہیں۔ آپ کا یہ تاریخی اعلان دراصل ایک مرتد و مشفق تھی جو علی کی قیادت پر اس وقت شہت کی جارہی تھی جب علی کی حیثیت ایک کسبہ جو سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے جہاں علی کی بے پناہ عظمت ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہیں پیغمبر اسلام کی مردم شناسی کا بھی یہ اعلیٰ نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ گھن ہوتا ہے کہ آپ ایک دس بارہ سال کے بچے کو دیکھ کر اس کے مستقبل کا کیسا صحیح اندازہ فرمانا جانتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علی کی جن عظیم صلاحیتوں کی جانب دعوتِ شیرہ میں اشارہ فرمایا تھا وہ دور رسالت میں پورے شباب کے ساتھ جلوہ انگن

ہوئیں۔ دنیا نے دیکھا کہ علیؑ اتنے بڑے عالم ہیں کہ نبیؐ ان کے بابِ العلم ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ اتنے عادل ہیں کہ افضالِ علیا کا فرمان صادر ہو رہا ہے، اتنے بڑے مبلغ ہیں کہ پورا یمن ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کر رہا ہے۔ اتنے سرفروش ہیں کہ عمرو بن عبدود کے مقابلہ صف آرا ہیں۔ اتنے بہادر ہیں کہ عرب کا بڑے سے بڑا سورا ان کے نام سے کانپ رہا ہے۔ دعوتِ تحریک میں اتنے پیش پیش ہیں کہ سورۃ برات کی تلخ انہیں سے متعلق ہے۔ اتنے جان سپار ہیں کہ اپنے قائد کی جان بچانے کیلئے شبِ بھرت چار سونگی تلواروں کے سائے میں آرام کر رہے ہیں اور تحریکِ اسلامی کے سارے رموز کے اتنے عالم ہیں کہ پیغمبرؐ کے بعد مسلمانوں کی نگاہیں انہیں کی جانب اٹتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اسلامی تحریک سے ہی دلچسپی رکھتے تھے وہ رسولؐ کی زندگی میں ہی علیؑ کو مستقبل کا قائد اور پیغمبرؐ کا جانشین تسلیم کرنے لگے تھے۔ سلمان، ابوذر، عمار اور مقداد وغیرہ سب اسی کتبِ خیال کے افراد تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بزرگوار اسلامی تحریکِ انقلاب کے سچے فدائی، حقیقی پرستار اور صفِ اول کے رکن نہیں تھے؟

اسلامی تحریک آگے بڑھی تو دنیا کی ہر انقلابی، عوامی اور عظیم تحریک کی طرح اس تحریک میں بھی ہر قسم کے لوگ شامل ہو گئے۔ ذاتی مفادات سے قطع نظر اجتماعی طور پر ہم ان لوگوں کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

۱۔ پہلا طبقہ ان سچے انقلابیوں پر مشتمل تھا جو پرانے غیر الہی اور جاہلی نظام کو مٹانے کی جگہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات کے مطابق وہ نیا نظام زندگی قائم کرنے کے خواہش مند تھے جسے الہی یا اسلامی نظامِ زندگی کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو پرانے جاہلی نظام سے نفرت رکھتا تھا اس لئے جہاں تک اس نظام کے مٹا دینے کا تعلق تھا وہ پورے جوش اور ولولہ کے ساتھ پیغمبرؐ کے

ساتھ رہا۔ رہا اس جاہلی نظام کی جگہ ایک نیا اور صالح نظام قائم کرنے کا سوال، تو اس طبقہ کو اس معاملہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ انصار کا بڑا حصہ اسی طبقہ سے متعلق تھا۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں تک پرانے نظام کو مٹا دینے کا سوال تھا انصار ہمیشہ سرفروشی کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی جب نئے نظام کی صورت مرتب کرنے کا سوال ابھرا تو انصار گھروں میں بیٹھ رہے اور خلافتِ اسلامی کا سوال صرف مہاجرین بلکہ قریش کی مرضی پر منحصر ہو گیا۔

۳۔ تیسرا طبقہ مفاد پسندوں (Opportunists) کا تھا۔ جنہیں نہ پرانے نظام سے پرہاش تھی نہ نئے نظام سے دلچسپی ان کو بس اپنی فکر تھی۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ تحریک ضرور کامیاب ہوگی اس لئے وہ اس تحریک سے وابستہ ہو کر اپنے لئے ایک روشن مستقبل کی تعبیر کرنا چاہتے تھے۔ مہاجرین قریش کی اکثریت اسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔

۴۔ اور چوتھا طبقہ ان رجعت پسندوں (Reactionaries) کا تھا جو اس انقلاب کی کامیابی سے حدودِ خوف و ترسنا تھے اور یہ چاہتے تھے کہ انقلاب پسندوں کی صفوں میں شریک ہو کر اندر ہی اندر اس تحریک کو بہلا کر دیں۔ اول الذکر طبقہ کے راس و رئیس حضرت علیؑ مرتضیٰ تھے اور اس طبقہ میں وہ صحابہ شامل تھے جنہوں نے اپنی بے پناہ قربانیوں سے تاریخِ اسلام کو انتہائی شاندار اور تابناک بنا دیا ہے۔ سلمان و ابوذر اسی مومنین خالصین کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، مقداد، یاسر ابی ابن کعب، حذیفہ یمانی، جابر بن عبد اللہ، مالک بن نویرہ، خزیمہ بن ثابت، بلال حبشی، ابو ایوب انصاری اور دوسرے سینکڑوں صحابہ کے نام اس زمر میں فرست میں شامل ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جن کے سامنے اس انقلاب کی ایک جامع اور مکمل تصویر



موجود تھی جو پیغمبر اسلام کا فشاء و مقصود تھا۔ اور وہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قربانی پیش کرنے پر تیار تھے۔ وہ نظام کمن کو مٹانا بھی چاہتے تھے اور نظام نو قائم کرنے کے بھی آرزو مند تھے۔ وہ ایک منزل پر تخریب چاہتے تھے اور دوسرے موقع پر تعمیر۔ تخریب نظام کمن کے لئے چونکہ تلوار کی ضرورت تھی اس لئے وہ میدان جنگ میں شمشیر بکت نظر آئے اور قیام نظام نو کے لئے چونکہ تبلیغ و اشاعت کی ضرورت تھی اس لئے بعد رسولؐ بھی حضرات جو ساری دنیا سے اپنی تلواروں کی کٹ اور اپنے ہاتھوں کی قوت منوا چکے تھے۔ پراسن اور خاموش تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔

دو سرا طبقہ زیادہ تر انصار مدینہ اور چند ماجرین پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ نظام کمن کو ختم کرنے کی حد تک بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے رہے لیکن جیسے ہی نظام نو کے قیام کا سوال پیدا ہوا ان کا سارا جوش جملہ اور عزم انقلاب سرود پر گیا۔ خلافت کے نام پر جو نظام بھی ان کے سر قہو پ دیا گیا اسے انہوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ قبول کر لیا۔ انہیں نہ اس سے دلچسپی تھی کہ خلیفہ کون مقرر ہو رہا ہے اور نہ اس سے بحث تھی کہ اس سلسلہ میں کون سے اصول وضع ہو رہے ہیں۔ اجتماع کا فیصلہ ہوا تو ان کو قبول نامزدگی کا طریقہ اختیار کیا گیا تو ان کو منظور۔ شورشی کی ٹھہری تو وہ راضی۔ فرض ان کی نہ تو اپنی کوئی رائے تھی نہ کوئی اصول تھا نہ کوئی مقررہ راہ عمل تھی۔ جو کچھ چاہتے تھے اسے دیتے تھے اکابر قریش کا جو فیصلہ ہو جاتا تھا یہ اسے مان لیتے تھے۔ ان کو نئے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان کے دلوں سے زندگی، ان کے خون سے حرارت اور ان کے قلوب سے گرمی بالکل ختم ہو چکی ہے۔ عہد رسالت میں یہی لوگ تھے جنہوں نے کفار قریش اور یہودیوں کے واپس کھٹے کر دیئے تھے۔ لیکن بعد رسولؐ یہ طبقہ اسلامی سیاست میں ایک ایسا مفلوج بے حس اور بے جان عنصر بن گیا تھا جس کا تصور بھی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا طبقہ مغلوبہ ہندوں کا تھا، ان لوگوں کی کیفیت یہ تھی کہ جب نظام کمن کے خلاف میدان جملہ آراستہ ہوتا تھا تو یہ فرار پر فرار کرتے تھے اور جب سکون کی فضا ہوتی تھی تو نظام نو میں اپنے لئے مناسب جگہ پیدا کرنے کے جوڑ توڑ میں مصروف رہتے تھے۔ رسول اللہؐ مکہ میں تھے تو یہ حضرات جہاں ایک طرف پیغمبرؐ کے پہلو میں نظر آتے تھے وہیں دوسری طرف کفار سے بھی میل جول رکھتے تھے۔ رسولؐ شعب ابوطالبؓ میں نظر بندی کے شدائد جھیلتے رہے اور یہ کفار مکہ کے ساتھ دلویش دیتے رہے۔ رسول اللہؐ ہجرت کر کے مدینہ آگئے تو یہ حضرات وہاں بھی جلوہ فرما ہو گئے تاکہ فتوحات ملکی اور مال نفیست میں حصہ بنا سکیں۔ ان کو نہ انقلاب سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کے اصولوں سے محبت، ان کی دلچسپی کامرکز صرف ان کی ذات تھی اور وہ اپنے ذاتی نفع کے لئے انقلاب کے اہم اور بنیادی اصولوں کو بھی قربان کر سکتے تھے۔ اپنے ذاتی فائدہ کے لئے پرانے نظام کے شیردازیوں اور انقلاب دشمنوں سے بھی دوستی کر سکتے تھے اور حصول مقصد کے لئے ہر قسم کے جوڑ توڑ سے کام لے سکتے تھے۔ یہی وہ طبقہ تھا جو رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی برسر اقتدار آ گیا اور چونکہ اسے اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا تعاون درکار تھا اس لئے اس نے اسلامی تحریک کے اس سب سے بڑے دشمن ابوسفیان سے بھی دوستی کر لینے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی جس کی انقلاب دشمنی پر بدر واحد کے معرکے گواہ ہیں۔

یہ طبقہ اکابر قریش پر مشتمل تھا اور ہمیں یہ سن کر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ اس میں اکثریت ماجرین کی تھی۔

چوتھا طبقہ ان مشرکین پر مشتمل تھا جو پہلے تو پیغمبر اسلامؐ کے مقابلہ میں تیغ و سناں کی تمام قوتیں استعمال کرتے رہے لیکن جب فتح مکہ نے ان کی کمر توڑ دی۔ پورے عربستان پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا اور ان کی فتح کی امیدیں یاس و ناکامی میں تبدیل ہو

گنیم تو اپنی جنگ کا رخ موڑنے اور کھلم کھلا جنگ کے بجائے اسلام کا لہاؤ لوڑھ کے تحریک اسلام کو اندر سے کھوکھلا کرنے پر تیار ہو گئے۔ ان لوگوں نے بظاہر تو اسلام قبول کر لیا تھا لیکن بباطن یہ اسی جاہلی نظام کے پرستار تھے جس کے لئے وہ آگ اور خون کا کھیل کھیل چکے تھے۔ مسلمان بننے سے ان کا مقصد بس اتنا تھا کہ انقلابیوں کی صفوں میں داخل ہو کر ان کا شیرازہ درہم برہم کر دیا جائے، ان کا نظم برباد کر دیا جائے اور موقع ملے ہی اسلام کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے۔ وہ جنگ میں مسلمانوں سے ہار چکے تھے۔ مگر و فریب، سازش، اندرونی بغاوتوں اور داخلی انتشار کا سارا آلہ کار مسلمانوں کو مات دینا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کھیل آسان نہیں تھا۔ اس میں شدید احتیاط کی ضرورت تھی اور مسلمانوں کی جمی ہوئی طاقت پر اچانک حملہ کر دینے میں شدید خطرات کا سامنا ہو سکتا تھا اس لئے یہ طبقہ وفات رسولؐ تک بالکل خاموش رہا لیکن پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہیں جیسے ہی حالات بدلے اس نے اپنے مقاصد کے حصول کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے سامنے اس وقت حصول مقصد کی دو ہی راہیں ہو سکتی تھیں۔

۱۔ وہ ایک تو یہ کہ برسر اقتدار طبقہ کو جو مفاد پسندوں پر مشتمل تھا سچے انقلابیوں کے مقابلہ میں صف آرا کر دیں اور اس طرح مدینہ میں خانہ جنگی چمڑ جائے اس سے قاعدہ یہ ہو گا کہ اسلامی تحریک کے سچے شیعرائی اور پیغمبرؐ آخر الزماں کے انقلابی تصورات کا اصلی امین قتل ہو جائے اور اس طرح اس انقلاب کا خاتمہ ہو جائے جو حضرت سرور کائناتؐ وجود میں لانا چاہتے تھے۔

۲۔ اور دوسرے یہ کہ اگر خانہ جنگی نہ کرائی جاسکے تو مفاد پرستوں سے دوستی اور مفاہمت کر کے رفتہ رفتہ خود اپنی طاقت اتنی بڑھالی جائے کہ بالاخر اقتدار حکومت اسی طبقہ کے ہاتھوں میں آجائے اور پھر وہ سچے انقلابیوں کو کچل کے دوبارہ اپنا پسندیدہ نظام جاہلیت قائم کر دے۔

اس طبقہ کا سرخندہ ابوسفیان تھا۔

رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ابوسفیان نے یہ کوشش شروع کر دی کہ انقلاب اسلامی کے علمبرداروں اور ان کے حریف مفاد پرستوں میں جنگ چمڑ جائے ایک طرف علیؑ اور ان کے ساتھی ہوں اور دوسری طرف خلافت کے مسند نشین مسلمان آپس میں لڑیں اور اس رجعت پسند طبقہ کی تمنا پوری ہو جائے جو نفاق کی ردا میں لوڑھے اسلام کی بربادی کی تمنائیں کر رہا تھا۔ ابوسفیان جانتا تھا کہ علیؑ اور اس کے ساتھی جو نظام جاہلی کے سب سے بڑے دشمن اور تحریک انقلاب اسلامی کے سچے شیعرائی تھے اقلیت میں تھے اس لئے اگر جنگ ہوتی تو یہ سب لوگ مارے جاتے اور اس طرح انقلاب اسلامی کا ہر نقش دنیا سے فنا ہو جاتا۔ رہ جاتے مفاد پرست طبقہ کے لوگ تو ان کے متعلق ابوسفیان کو یقین تھا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لئے کوئی لگن نہیں ہے۔ اس لئے اگر سچے انقلابیوں کا خاتمہ ہو گیا تو یہ طبقہ خود ہی کچھ عرصہ کے بعد جاہلی نظام کی طرف واپس ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں وقت کی بہترین سیاست یہ تھی کہ نام نماؤ مفاد پرست مسلمانوں کے ذریعہ سچے مسلمانوں کا خاتمہ کرا دیا جائے چنانچہ اس نے خلافت کا فیصلہ ہوتے ہی حضرت علیؑ کو ٹھولا۔ ان کو اپنی امداد کا یقین دلایا مدینہ کو لشکروں سے پات دینے کا سبزیباغ دکھایا اور یہ چاہا کہ علیؑ حاکم وقت کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں۔ یہ ایک خوبصورت کھیل تھا۔ سچے مسلمانوں کو مفاد پرست مسلمانوں سے پڑا دینے کا، لیکن بنو امیہ کے سردار کی یہ چال ناکام ہوئی۔ امیرالمومنینؑ نے انتہائی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ابوسفیان کو دھتکار دیا اور انقلاب اسلامی کے سچے پرستاروں کو قتل کرا دینے کی یہ شیطانی سازش ناکام بنا دی گئی۔ وفات سرور کائناتؐ کے بعد الہی اور شیطانی قوتوں کا یہ پہلا ٹکراؤ تھا جس میں حق کامیاب ہوا اور باطل ناکام۔ بنی امیہ کی شیطانی چال ناکام ہوئی اور تحریک اسلامی کا علمبردار کامیاب۔ سچے مسلمانوں کو قتل کرا دینے کی مکررہ سازش

ناکام بنا دی گئی اور ان لوگوں کو موت کے چنگل سے بچالیا گیا جن کے سارے آئندہ دنیا کو دعوت اسلام سے روشناس کرایا جاسکتا تھا۔

رجعت پسند طبقہ جب اس سازش میں ناکام رہا تو اس نے دوسری راہ اختیار کی۔ اب وہ مفاد پسندوں کی جانب مائل ہوا تاکہ ان کی طاقت اتنی مضبوط کر دی جائے کہ سچے انقلاب پسند اور نظام الہی کے داعی برسر اقتدار نہ آسکیں۔ دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ ایوان حکومت میں داخل ہو کر خود اپنی طاقت مستحکم کر لی جائے اور موقع ملنے ہی مفاد پرست مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کر حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ رجعت پسند طبقہ یہ یقین رکھتا تھا کہ اگر حکومت اس کے ہاتھوں میں آگئی تو وہ انقلاب اسلامی کا قلع قمع کر دے گا اور دنیا سے اسلام کا نام حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا اور حکومت حاصل کرنے کی واحد تدبیر اس کے نزدیک یہی تھی کہ حکمران طبقہ کو اپنے تعاون کا یقین دلا کے اس کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اس نے برسر اقتدار طبقہ کے مقابلہ میں سر اٹھایا اور وفات رسولؐ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کی راہ اختیار کی تو سارے مسلمان اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں گے اور مفاد پسند طبقہ اپنے اقتدار کی بقاء کے لئے سچے انقلابیوں اور نظام کسن کے دشمنوں کا تعاون حاصل کر لے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ رجعت پسند اور اسلام دشمن عناصر کچل ڈالے جائیں گے اور سچے مسلمان جن کو مفاد پسندوں نے پس پشت ڈال دیا تھا وہ بارہ اسلامی سیاست میں نمایاں ہو جائیں گے۔ ابوسفیان اس حقیقت کو خوب جانتا تھا کہ مسلمانوں کو اس پر یا اس کے اسلام پر اعتماد نہیں ہے اور اس کی سابقہ روش کے نتیجہ میں عام مسلمانوں میں اس کے خلاف ایک نفرت موجود ہے۔ ایسی حالت میں وہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نے بغاوت کی راہ اختیار کی اور کھلم کھلا اسلام پر ضرب عائد کرنا چاہی تو اس کا نتیجہ مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی بیداری کی شکل میں برآمد ہو گا اور یہ چیز اس کے مقاصد

کے خلاف تھی اس لئے اس نے حکمران طبقہ کو اپنے تعاون کا یقین دلانا شروع کر دیا تاکہ

۱۔

مفاد پسند طبقہ رجعت پسندوں کی مدد سے اتنا طاقتور ہو جائے کہ سچے مسلمان اس کے مقابلہ میں بے بس ہو جائیں۔

۲۔ عام مسلمان رجعت پسندوں کی جانب سے غافل ہو کر جمود اور بے بسی کا شکار ہو جائیں اور ان میں سرکارِ دو عالم نے نظام کسن کے خلاف جو جذبہ جہاد بیدار کر دیا تھا وہ رفتہ رفتہ فنا ہو جائے۔

۳۔ اور ایوان حکومت میں داخل ہو کر اپنی طاقت اتنی مستحکم کر لی جائے کہ وقت آنے پر سلطنت اسلامی کا تختہ الٹ کر عربستان پر دوبارہ اسلام دشمن طاقتوں کا قبضہ کرا دیا جائے۔

ابوسفیان اپنی اس چال میں کامیاب رہا۔ مفاد پسند حکمران چونکہ خود خوفزدہ تھے اور ان کے دلوں میں یہ دھڑکانگا ہوا تھا کہ کہیں سچے انقلاب پسند علیؑ کے پرچم تلے متحد ہو کر ان کی بساط حکومت نہ الٹ دیں اس لئے انہوں نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کی پوری پذیرائی کی۔ ابوسفیان کے بیٹے کو شام کی گورنری دے دی گئی اور اس طرح گویا رجعت پسند عناصر کو خرید لیا گیا لیکن حکمران اکابر قریش کے مقابلہ میں ابوسفیان کہیں زیادہ دانش مند اور بساط سیاست کا تجربہ کار کھلاڑی تھی۔ اکابر قریش اس خیال میں تھے کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی شام کی گورنری پر مطمئن ہو جائیں گے اور پھر وہ ہمیشہ سلطنت کے وفادار رہیں گے۔ ان کی مدد سے مہاجرین قریش ہمیشہ عربی مملکت پر راج کرتے رہیں گے لیکن ابوسفیان کی تدبیر دوسری تھی وہ ایوان حکومت میں اس لئے نہیں داخل ہو رہا تھا کہ بنی تیم اور بنی عدی کی غلامی کرتا رہے اور اپنی طاقتیں ان کے استحکام پر صرف کرتا رہے بلکہ اس لئے داخل ہو رہا تھا کہ رفتہ رفتہ حکمران اکابر

قریش کی طاقت کو اندر سے کھوکھلا کر کے خود سلطنت اسلامی پر قابض ہو جائے۔ یہ صرف غرض کی دوستی تھی جس میں مفاد پسند اور رجعت پسند دونوں اس لئے ایک ساتھ نظر آرہے تھے کہ اپنی اپنی غرض کی تکمیل کر لیں۔ اس سیاسی کھیل میں فتح بالاخر ابوسفیان کو نصیب ہوئی۔ چنانچہ اسلامی سلطنت کے قیام کے صرف سترہ سال بعد دنیا نے ابوسفیان کو مسند خلافت سے یہ جملہ کہتے سنا کہ

”میرے پیارے بھتیجے عثمان! بڑی مشکل سے حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ اسے بنی امیہ کے ذریعے مضبوط کر لو۔ اس سے گیند کی طرح کھیلو، اس لئے کہ جنت و نار سب ایک ڈھکوسلہ ہیں۔“

اور پھر ابوسفیان کو دنیائے دیکھا کہ وہ اسد الرسول، حضرت حمزہ کی قبر مبارک کو ٹھکرا ٹھکرا کر یہ تاریخی جملہ کہہ رہا ہے۔

”بنی ہاشم! تم نے اسی حکومت کے لئے ہم سے نزاع کی تھی اب دیکھو کہ امیہ کے فرزند اس سے کس طرح کھیل رہے ہیں۔“

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے منصوبہ کا ایک ایک جزو پورا ہو گیا تھا۔ حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں آگئی تھی لیکن رجعت پسند طبقہ یہ جانتا تھا کہ ابھی اس کی قوت مستحکم نہیں ہے۔ ابھی مسلمانوں میں انقلاب اور زندگی کی چنگاریاں موجود ہیں اس لئے اگر رجعت پسند طبقہ حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر اسلام پر کھل کر مارنا چاہتا تو وہی مسلمان جو اپنے جمود اور بے حسی کے نتیجے میں بنی امیہ کے ایک رکن کی بیعت کرنے پر تیار ہو گئے تھے اس حرکت کو ہرگز برداشت نہ کرتے بلکہ بڑھ کر رجعت پسندوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے۔ ان کا سویا ہوا جذبہ جہاد جاگ اٹھتا اور اسلام

کی شہ رگ پروار ہوتے دیکھ کر ان میں وہی زندگی اور بیداری پیدا ہو جاتی جس کا مزہ رجعت پسند طبقہ بدر و احزاب کے میدانوں میں چکھ چکا تھا اس لئے حکومت ہاتھ میں آتے ہی یہ کوشش شروع کی گئی کہ مسلمانوں کے نفوس کو بگاڑ دیا جائے، ان کی ہمت توڑ دی جائے، ان سے زندگی اور انقلاب کے جوہر چھین لئے جائیں۔ ان کا لقمہ برباد کر دیا جائے، ان کی قوت پریشان کر دی جائے اور جب عام مسلمان سیاسی اور روحانی اعتبار سے بالکل مفلوج اور ناکارہ ہو جائیں تو سچے انقلابیوں کی اس جماعت پر وار کیا جائے جو آج تک رسول اکرم کے مقدس مشن کو کوکلیجے سے لگائے اس نظام نوکی خاموش تبلیغ کر رہی تھی جسے سرکارِ دو عالم قائم فرمانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے:-

۱۔ اسلامی سلطنت کے ہر صوبہ کی گورنری بنی امیہ کے سپرد کر دی گئی تاکہ وہ ظلم و ستم رانی کی قوتوں سے سچے مسلمانوں میں خوف و ہراس پھیلا دیں اور ان میں نظام کے قیام کی جو خواہش موجود ہے وہ السرود اور پامال ہو جائے۔

۲۔ اسلامی بیت المال کو بنی امیہ کی ”گھریلو الماک“ بنا دیا گیا تاکہ جہاں ایک طرف رجعت پسند طبقہ مالی اعتبار سے قوی ہو جائے، وہیں عام مسلمان افلاس و تنگ دستی کے نتیجے میں زندگی کی حرارت سے محروم ہو جائیں۔

۳۔ جن مسلمانوں کے متعلق یہ معلوم تھا کہ وہ انقلاب اسلامی کے سچے داعی اور نظام کے قیام کے سچے خواہش مند ہیں ان پر مظالم شروع کر دیئے گئے۔ چنانچہ عمار یا سرور ابوذر کے ساتھ خلافت ثلاثہ میں جو سلوک روا رکھا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۴۔ مقتدر اور صاحب اثر صحابہ کو مدینہ سے دور دور بھیج دیا گیا تاکہ عام مسلمانوں کی ہمت شکستہ ہو جائے اور ان میں حکومت وقت کی کار فرمایوں کو چیلنج کرنے کی قوت باقی نہ رہے۔

۵۔ قریش کے وہ ممتاز اکابر جو سابقہ حکومتوں کے دور میں بڑے اقتدار کے مالک تھے مکمل طور پر نظر انداز کئے جانے لگے تاکہ عوام پر ان کا جو اثر ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے۔

اموی سیاست کی یہ تدبیر بڑی حد تک کامیاب ہوئی چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ چند ہی سال میں مسلمانوں کی ہمت ٹوٹ گئی۔ ان کا نظم برباد ہو گیا۔ ان کی جرات سلب ہو گئی۔ ان کا عزم حیات مردہ ہو گیا۔ ان کی ایمانی جہالت اور ان کا انقلابی ولولہ سرد پڑ گیا اور وہ ایک ایسی مفلوج سرپاں جمود اور مردہ جماعت میں تبدیل ہو گئے جو کسی اصولی جنگ میں حصہ لینے کے قابل نہیں کہی جاسکتی جسے انقلاب اور اس کے اعلیٰ مقاصد سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی جو اس بلند تر نظام حیات کا تصور بھی کھو بیٹھی جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اور جو اخلاقی اور انتہائی اعتبار سے ایک ایسی مردہ اور فنا پذیر جماعت بن گئی جو ایک انقلابی تحریک میں معاونت کرنا تو درکنار کسی ایسی تحریک کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یقین نہ ہو تو حضرت عثمان کے دور حکومت کے آخری ایام پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔ حالت یہ تھی کہ خلیفہ وقت کا مکان مٹھی بھر مصریوں نے گھیر رکھا تھا اور وہی مدینہ کے لوگ جنہوں نے ایران، مصر و شام کی حکومتوں کے تختے الٹ دیئے تھے، جنگی تلواروں کی کٹ سے ساری دنیا لرز رہی تھی اور جنہوں نے قیصر کا فرور اور کسریٰ کی حکمت خاک میں ملا دی تھی ان مٹھی بھر مصریوں سے خائف گھروں میں زنجیریں دیئے بیٹھے تھے اور ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ خلیفۃ المسلمین کی کوئی مدد کر سکیں۔ اسی سے ان کے عزم و ہمت کی شکستگی اور ان کے عسکری نظم کے خاتمہ کا اندازہ کر لیجئے اور پھر سوچئے کہ بنی امیہ کے دس سالہ دور حکمرانی نے مسلمانوں کو کس حد تک مردہ اور ان کی سیرت کو کس حد تک مسخ کر دیا تھا۔

بنی امیہ مسلمانوں کو مسخ کر چکے تھے لیکن ابھی اسلام پر وار کرنا ان کے لئے ممکن

نہیں تھا۔ اس کے لئے ابھی کچھ اور وقت درکار تھا کہ اچانک ایک ذرا سی غلطی نے ساری بساط الٹ کر رکھ دی۔ محمد بن ابی بکر اور مصریوں سے وعدہ خلافی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس کے نتیجہ میں بنی امیہ کے اقتدار کا عمل لرز اٹھا۔ معاملہ چھوٹا سا تھا، چنگاری معمولی تھی لیکن اسی معمولی سی چنگاری سے ایک عظیم انقلاب کے شرارے بھڑک اٹھے۔ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے اور عثمان اقتدار ان سے انقلاب پسندوں کے ہاتھوں میں آ گئی جو پیغمبر اسلام کے دوش بدوش اسلام کے ذہنی روحانی اور الہی انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے جان و دل کی بازی لگا چکے تھے اور آج بھی اس الہی نظام کے قیام کے شدت سے آرزو مند تھے جسے نبی کریمؐ وہ جو میں لانا چاہتے تھے۔ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام خلیفہ بنا دیئے گئے اور اس طرح اسلامی سیاست میں ایک عظیم انقلاب رونما ہو گیا۔

اسلامی دنیا کے لئے یہ انتہائی نازک وقت تھا اور مسلمان اس موقع پر پانچ طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

۱۔ اسلامی انقلاب اور الہی نظام زندگی کے سچے پرستار جو اسلامی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر قسم کی قربانی پیش کرنے پر تیار تھے۔ اس طبقہ کی قیادت وفات رسولؐ کے بعد سے آج تک ہمیشہ علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں رہی تھی اور یہی رسول اللہؐ کے اس عظیم روحانی ورثہ کے امین تھے جن پر الہی نظام کی کامیابی کا انحصار تھا۔

۲۔ وہ ماجرین و انصار جو سابقہ حالات سے بددل ہو کر اپنا ذوق جماد اور اپنا ولولہ انقلاب بڑی حد تک کھو چکے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی جاہلی نظام کی بازیابی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

۳۔ شکست خوردہ ذہنیت کے مسلمان جو نہ انقلاب پسندوں کے ساتھ مل کر بھائے

اسلام کی جدوجہد کرنے پر تیار تھے اور نہ رجعت پسندوں کے مقابلہ میں لب کشائی کی جرات رکھتے تھے۔ یہ طبقہ ابو موسیٰ اشعری اور ان کے امثال کا تھا جو کٹھے رہنے کے مقابلہ میں بیٹھنے کو، اور بیٹھنے کے مقابلہ میں بیٹھنے کو اور لوہے کی تلوار کے مقابلہ میں لکڑی کی تلوار کو ترجیح دینے لگے تھے۔

۳۔ زر پرست اور مفاد پرست طبقہ جسے حق و باطل کی کسی اصولی کشمکش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ان کو صرف اپنے ذاتی اقتدار اور حصول دولت سے دلچسپی تھی۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسلام کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ان کی ساری جدوجہد کا مرکز خود ان کی ذات تھی۔ ظلم و زبرد وغیرہ اسی طبقہ کے لوگ تھے جن کو کوفہ اور بصرہ کی گورنری حاصل نہیں ہوئی تو وہ اس کا لحاظ کئے بغیر کہ دمشق کے گوشوں سے اسلام کے خلاف ایک زبردست طوفان اٹھ رہا ہے۔ امیر المومنین کے مقابلہ میں صف آرا ہو گئے۔ ان کا یہ اقدام بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان کو اسلام کی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ان کی ساری سرگرمیوں کا محور خود ان کا ذاتی اقتدار اور نفع تھا۔

۵۔ اسلامی انقلاب کے دشمن رجعت پسند عناصر جو پرانے جاہلی نظام کو واپس لانے کے خواہش مند تھے اور امیر معاویہ کی سرکردگی میں شام کو اپنا سب سے طاقتور مورچہ بنا چکے تھے، امیر معاویہ وہی بزرگ تھے جو بدر و احد و احزاب وغیرہ میں اپنے والد ابو سفیان کے ساتھ ہنرمند اسلام کے مقابلہ میں صف آرا ہو چکے تھے اور اسلامی تحریک انقلاب کو مٹا ڈالنے کا وہی جذبہ اپنے دل کے اندر رکھتے تھے جو خود ان کے والد اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے دلوں میں موجزن تھا۔

خلافت عثمانی کا خاتمہ ہوتے ہی رجعت پسند اور انقلاب دشمن طبقہ کے سامنے

تین راہیں آئیں:-

۱۔ جمہور مسلمین کے فیصلہ کے مطابق امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنی جائے لیکن ایسا کرنے کے معنی یہ ہوتے کہ اسلامی نظام نہ صرف یہ کہ قائم ہو جاتا بلکہ اتنا مضبوط بھی ہو جاتا کہ پھر اسے مٹانا محال ہو جاتا۔ ایسی حالت میں رجعت پسندوں اور ان کے پسندیدہ اصولوں کا ختم ہو جانا یقینی تھا جسے ظاہر ہے کہ وہ قبول نہیں کر سکتے تھے۔

۲۔ کچھ عرصہ تک خاموشی اور انتظار کی پالیسی پر عمل کیا جاتا لیکن اس میں اندیشہ یہ تھا کہ نظام اسلامی کے داعیان کے قدم جم جاتے عوام میں ان کا اثر و رسوخ بڑھ جاتا۔ سوئے ہوئے مسلمان بیدار ہو جاتے۔ کھوئی ہوئی ہمت بازا بھو جاتی اور اسلامی نظام حکومت و معاش کی عملی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جانے کے بعد مسلمان دوبارہ اس جاہلی نظام سیاست کو ہرگز قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتے جسے بنی امیہ اور رجعت پسند دنیا پر نافذ کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ تیسرا راستہ صرف یہ تھا کہ حضرت عثمان کے قتل اور حضرت عائشہ کی مخالفت کے نتیجہ میں مسلمانوں میں ذہنی اور سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوری طور پر امیر المومنین حضرت علی کے خلاف بغاوت کر دی جائے اور اس طرح اسلامی انقلاب کے داعیان کو اپنے قدم مضبوط بنانے سے روک لیا جائے۔ سیاسی اعتبار سے یہی تیسرا طریقہ صحیح اور مفید ہو سکتا تھا چنانچہ امیر معاویہ نے قصاص خون عثمان کا نعرہ بلند کر کے سلطنت اسلامی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ سچے مسلمان اور نظام اسلامی کے شیدائی سمجھ گئے کہ امیر معاویہ کا مقصد حضرت عثمان کے خون کا انتقام لینا نہیں بلکہ اصل مقصد اسلام کی انقلابی تحریک کو فنا کر دینا ہے چنانچہ انہوں نے وہی کیا جو اسلام دشمنوں کے مقابلہ

میں دور رسالت میں کیا جاتا تھا، وہ معاویہ شامی کے مقابلہ میں مروں سے کفن  
باندھ کر میدان میں کود پڑے اور صفین کے میدان میں حق و باطل، الوہیت و  
شیطنیت کا وہی معرکہ گرم ہو گیا جس کی مثال بدر و احد کے میدانوں میں مل سکتی  
تھی۔ اس معرکہ میں امیر المومنین کو مساجرین و انصار کے اس طبقہ کا پورا اقلون  
حاصل ہوا جو دور عثمانی میں بے عملی کا شکار ہو چکا تھا لیکن نظام باطل کا قلبہ  
برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس طرح مسلمانوں کے اول الذکر دو طبقے  
امیر المومنین کے پرچم تلے متحد ہو گئے۔ باقی رہے تین طبقے تو ان میں سے ایک تو  
کمزور رجعت پسندوں کا طبقہ تھا جو حکومت الیہ اور نظام اسلامی کے تمام تصورات کو  
مٹا دینے کا آرزو مند تھا۔ وہ تمام تر امیر معاویہ کے ساتھ تھا۔ زرباشی کی مدد سے  
امیر معاویہ نے زبردست مسلمانوں کو بھی خرید لیا اور شکست خوردہ ذہنیت کے  
بزدل لوگ شامیوں کا پلہ بھاری دیکھ کر رفتہ رفتہ خود ہی امیر معاویہ کے ساتھ ہو  
گئے۔ امیر معاویہ کے عروج کے ساتھ اسلام میں بادشاہت، جاگیر داری،  
ذرائع و زرعی، عشرت پسندی، غرض ایام جاہلیت کی تمام برائیاں عود کر آئیں اور بنی  
امیہ کی حکومت انقلاب اسلامی کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن گئی۔ یہ تھے مختصراً  
حالات جن میں آل رسول کے محترم ارکان کو بقائے اسلام کی سچی وجہ کرنا تھی  
اور ان کے عظیم مجاہدات کا مطالعہ کرتے وقت اس پس منظر کو نگاہ میں ضرور رکھنا  
چاہیے کیونکہ تب ہی ہم ان شاندار کامیابیوں اور کامیابیوں کا صحیح احساس کر  
سکیں گے جو اس مجاہدہ حق و باطل میں آل رسول کو نصیب ہوئیں۔



## آل رسول کا مقصد

تاریخ اسلام کی یہ انتہائی بد قسمتی ہے کہ آل رسول کی تحریک کو بادشاہوں کی سسی  
کشور کشائی کے چنانہ سے ٹپا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعد  
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی علیہ السلام سرور آرائے خلافت نہیں  
ہوئے۔ امام حسن علیہ السلام تخت حکومت چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے یا امام حسین علیہ  
السلام کے مقابلہ میں تاج شامی یزید کے سر پر جگمگا تا رہا تو ہم یہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ آل  
رسول کو ناکامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ چودہ سو سال تک شامی و سلطانی کے  
نظام میں زندگی بسر کرتے رہنے کے نتیجہ میں ہماری یہ کچھ عادت سی ہو گئی ہے کہ ہم آل  
رسول کے ہر اقدام کو ناکامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنا پڑی۔ چودہ سو سال تک شامی و  
سلطانی کے نظام میں زندگی بسر کرتے رہنے کے نتیجہ میں ہماری یہ عادت سی ہو گئی ہے کہ  
ہم آل رسول کے ہر اقدام کو حصول سلطنت کی ایک کھلی یا ڈھکی اعلانیہ یا خفیہ کوشش  
تصور کرنے لگے ہیں۔ یہی وہ فطرتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم نہ صرف یہ کہ اسلامی تحریک  
کے حقیقی ضد و خال سے نا آشنا رہتے ہیں بلکہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح تاریخ  
اور ان کے عظیم کارناموں کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے دشوار ہو جاتا ہے۔

ہمارے لاشعور میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہے کہ حکومت بنی ہاشم کا حق تھی اور وہ  
اپنے اس حق سے محروم کر دیے گئے۔ انہوں نے چند مرتبہ یہ کوشش بھی کی کہ تاج  
خلافت ان کو نصیب ہو جائے لیکن بنی امیہ نے روپے اور تلواریں کے بل پر ہر کوشش ناکام  
بنادی اور ان حکیم ناکامیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر آئمہ اہل بیت اس باب میں قطعاً

ماہوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے لیکن ظالموں نے ان کو پھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ بار بار امیر کے گئے، نشانہ ستم بنائے گئے اور ایک ایسی حسرت انگیز ویاس آگیں زندگی بسر کرتے رہے جو تاریخ و ردوالم میں اپنی نظیر آپ ہے۔

یہ تصور بجائے خود آل رسول پر ایک ہولناک ظلم کے مترادف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آل رسول کے مقدس افراد کو بادشاہی کے ملعون تصور سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ سرے سے اس انسانی حاکمیت کے قائل ہی نہیں تھے جس کا ایک نمونہ بادشاہت ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب بنی امیہ کو بنی عباس کے ہاتھوں شکست ہوئی اور حکومت آل ہاشم کے ہاتھوں میں آگئی تو اس ہاشمی حکومت سے بھی جسے بنی عباس کی حکومت کہا جاتا ہے آئمہ آل رسول کا اسی طرح ٹکراؤ جاری رہا جس طرح آل امیہ سے جاری رہ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض امام زادوں نے حصول حکومت کی کوشش کی لیکن ہمارے آئمہ نے ان کی کوئی امداد نہیں کی۔ ان مواقع پر آئمہ کی خاموشی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بنی امیہ یا بنی عباس کے مظالم سے خائف تھے بلکہ حقیقت صرف یہ تھی کہ جو امام زادے حصول حکومت کے لیے جنگ کر رہے تھے وہ بھی انسانی حاکمیت کے داعی تھے اور چونکہ آئمہ اہل بیت کو اس اصول سے قطعاً اختلاف تھا اس لیے وہ ان لوگوں سے بھی اس طرح علیحدہ رہے جس طرح انسانی حاکمیت کے ان علمبرداروں سے دور رہے جن کو بنی امیہ یا بنی عباس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آئمہ علیم السلام خلافت امیہ کے دعویدار رہے اور اس دعوے پر وہ شدت سے اٹل تھے کہ سخت سے سخت مظالم کے باوجود انہوں نے اپنے اس دعوے کو ترک نہیں کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امیہ اور دعوئی بادشاہت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی فرق جتنا کہ تاجور مامون الرشید اور یورپہ نشین امام رضا میں تھا خلافت ایک منصب دینی ہے جس میں صاحب امر اللہ کی جانب

سے معاشرہ اسلامی کی تنظیم، سرحدوں کی مدافعت و اجابت امیہ کی وصولیابی، شریعت حقہ کی حفاظت اور دین الہی کی تبلیغ و اشاعت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ انسانوں پر "حکومت" نہیں کرتا اس لیے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو ہے۔ وہ صرف شریعت کی راہ پر انسانوں کی "قیادت" کرتا ہے جس کے لیے وہ مامور ہوتا ہے وہ بادشاہ نہیں ہوتا قائد یا امام ہوتا ہے۔ آل رسول کو یہ منصب من جانب اللہ حاصل تھا اسے ان سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ اس لیے اس مسئلہ پر ان کو کسی سے کوئی تنازعہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کو بنی امیہ یا بنی عباس سے خلافت امیہ کے مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں تھا اس لیے کہ مادی قوت اور ظاہری شوکت کے باوجود یہ سلاطین ان سے ان کا الہی منصب نہیں چھین سکتے تھے۔ اختلاف تھا تو اس سوال پر کہ ان سلاطین نے مسلمانوں پر انسانی حاکمیت کا اصول نافذ کر کے ان کی آزادی کو قلمی میں تبدیل کر دیا تھا اور مسلمانوں کے سچے قائدین اس صورت حال کو برداشت کرنے پر تیار نہیں تھے وہ لڑتے تھے مسلمانوں کی حقیقی آزادی کے لیے شریعت کی بقاء کے لیے اسلامی نظام کے قیام کے لیے اور اس حکومت امیہ کو وجود میں لانے کے لیے جس کے قیام کی خاطر خاتم المرسلین نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی وہ اسلامی تحریک انقلاب کے داعی تھے اور ان کا ہر قدم اسی انقلاب کے نکلنے کے لیے اٹھا کرتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو ان کے کردار پر ایک طلبکار سلطنت کے کردار کی حیثیت سے نظر ڈالی جاسکتی اور نہ جملہ زندگی میں ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ اس حیثیت سے کیا جاسکتا ہے۔

آل رسول کے محترم ارکان کی حیثیت اسلامی تحریک انقلاب کے قائدین کی ہے اور ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ان کی اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی نظام کو اغیار کی دست برد سے محفوظ رکھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ اسلام کے سیاسی معاشی اور تمدنی نظریات کو لٹ



جانے سے کہاں تک محفوظ رکھا؟ حکومت الیہ کے جس تصور کو شیطان مٹا دینا چاہتا تھا اسے سلاطین کی دست برد سے بچانے میں کس حد تک کامیاب ہوئے شریعت اسلامی کو اس کے اصلی خدو خال کے ساتھ برقرار رکھنے کا فریضہ کہاں تک انجام دیا؟ ملت اسلامیہ کی رہنمائی کے فرائض کس حد تک انجام دیے؟ تبلیغ و اشاعت اسلام میں کس حد تک معاون ہوئے؟ اور اسلامی تحریک انقلاب کو پروان چڑھانے میں ان کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی؟ اور انہیں امور کا اندازہ کرنے کے بعد ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ آل رسول کے محترم ارکان جلاوطن و باطل میں کامران و پامرد ثابت ہوئے یا ناکام و پامرد!

بد قسمتی سے اسلامی تاریخ کبھی کسی اصول کو سامنے رکھ کر نہیں لکھی گئی بلکہ اسے محض چند بادشاہوں کی کہانی بنا دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی سیاسی معاشی اخلاقی اور تمدنی تحریکات کو سمجھنا آسان نہیں رہا ہے۔ آل رسول کا کردار چونکہ ایک خاص اصول اور ایک خاص روحانی اخلاقی اور انقلابی تحریک سے وابستہ تھا اس لیے بادشاہوں کی کہانی میں اس کا صحیح موقف تلاش کرنا سخت دشوار ہو گیا ہے اور جب تک تاریخ پر گہری نگاہ نہ ڈالی جائے حالات کی پوری چھان بین نہ کی جائے واقعات کے پس منظر پر نظر نہ رکھی جائے ذہنی اور سیاسی کیفیات کا تجزیہ نہ کیا جائے پس پردہ عوامل اور نفس انسانی کے محرکات کا پتہ نہ چلایا جائے تب تک آل رسول کا حقیقی کردار تاریخ اسلام میں ان کا صحیح مقام اور اسلامی معاشرہ میں ان کا اصلی موقف معلوم کرنا قطعاً ناممکن ہے۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے اس کی پشت پر کچھ عوامل ہوتے ہیں کچھ خاص محرکات ہوتے ہیں۔ ایک مخصوص ذہنی پس منظر ہوتا ہے ایک خاص طرز فکر اس کا خالق ہوتا ہے اس لیے جب تک کسی دور کے فکری رجحانات کا اندازہ نہ ہو

سیاسی معاشی تمدنی اور فکری پس منظر معلوم نہ ہوں۔ تاریخی شخصیتوں کی ذہنی کیفیات اور ان کے مقاصد کا پتہ نہ چلایا جائے۔ ان کی نفسیاتی کیفیت پر نظر نہ رکھی جائے اور ان عوامل کو معلوم نہ کیا جائے جو اس وقت کار فرما تھے تب تک کسی واقعہ کی حیثیت یا تاریخ میں اس کے مقام کا فیصلہ کرنا قطعاً فضول سی بات ہے آل رسول کی تاریخ کے سلسلہ میں یہ غلطی اور زیادہ شدت سے نمایاں ہے اس لیے کہ کچھ تو دور فقیر کے اثرات کے نتیجے میں اور کچھ ذہنی انحطاط کی بدولت آل رسول کی تاریخ مرتب کرتے وقت ان امور کا بہت کم لحاظ رکھا گیا اور یہی وجہ ہے کہ نسل انسانی کے ان مخصوص من اللہ قائدین کی جو عظمت ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے تھی ان کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کا جو احساس ہمارے قلوب پر ہونا چاہیے تھا اور ان کی امامت کبریٰ کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کو جو عظیم تاثیر فوائد نصیب ہوئے ان کا جو نقش ہمارے ذہنوں پر ہونا چاہیے تھا وہ بہت کم نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ہم ان کی محبت کو سرنامہ ایمان اور ان سے عقیدت کو پروانہ نجات تصور کرتے ہیں لیکن عشق و عقیدت کی داوی سے ذرا دور ہو کر ان کی جو فکری عظمت ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے اس سے کم اذکم ہمارے عوام قطعاً بے بہرہ ہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آل رسول کی تاریخ کو آج تک صحیح طور پر مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس مقالہ میں ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم آل رسول کی تاریخ مرتب کرنے کا ایک ڈھنگ بتادیں۔ ایک راستہ تیار کریں جس پر چل کر دوسرے ارہاب فکر و قلم آل رسول کی کھلی تاریخ مرتب کریں اور ہمیں امید ہے کہ اگر اس طریقہ پر تاریخ از سر نو ترتیب ہو گئی تو نہ صرف یہ کہ آل رسول کی عظمت کے ہزاروں نئے گوشے دنیا کے سامنے آجائیں گے بلکہ جلاوطن و باطل میں حق پرستوں کی شاندار کامیابیوں کی یہ داستان خود ہماری نسل میں حق پرستی کا وہ ولولہ اور وہ عزم پیدا کر دے گی



## سیاست علویہ کا پہلا مظاہرہ

پیغمبر اسلامؐ نے اپنی حیات طیبہ کے دوران ہی اسلام کا پیغام عرب کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا تھا لیکن ایک عالمگیر دین کی حیثیت سے اسلام کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک مختصر سی زندگی میں ساری دنیا کو مسلمان بنانا ناممکن تھا چنانچہ حضرت سرور کائناتؐ نے احتمالی بصیرت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے مستقبل میں بھادو اشاعت اسلام کا — نیز خود عربستان میں منافقین کے مقابلہ میں اسلام کے تحفظ کا ضروری بندوبست فرما دیا۔ آپ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر غدیر خم کے میدان میں اپنے وصی و جانشین کی نامزدگی فرمادی تاکہ آپ کے بعد اسلام کی دعوت انقلاب افرا تفری کا شکار ہو کر تباہ نہ ہو جائے اور کاروان حق ایک ایسے قائد کی سرکردگی میں برابر آگے بڑھتا رہے جس کی عظیم صلاحیتوں کا خود دور رسالت میں کافی شائد ار اور کامیاب تجربہ کیا جا چکا تھا۔ میدان غدیر میں من کنت مولانا لهذا علی مولانا کے تاریخی ارشاد کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمان اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ:-

سرور کائناتؐ کے بعد اسلام کی انقلابی تحریک کو اندرونی دشمنوں سے محفوظ رکھنے اور دنیا کے گوشہ گوشہ تک اس تحریک کو عام کرنے کی صلاحیت علیؑ کے علاوہ اور کسی دوسرے شخص میں نہیں ہے اس لیے بلا شہادت کا تاج خواہ کسی کے سر پر جگمگائے لیکن جہاں تک اسلامی تحریک کا تعلق ہے اسلام کی دعوت انقلاب کا تعلق ہے، شریعت اسلامیہ کو اس کی تمام خوبیوں کے ساتھ قائم

رکھنے کا تعلق ہے اور قومی یا عربی سیاست سے قطع نظر خود دین اسلام کے مفاد کا تعلق تھا مسلمانوں کی قیادت و لہارت کا مستحق علیؑ کے سوا کوئی دوسرا نہیں، وہی سفینہ اسلام کا ناخدا ہو گا، وہی ملت کے دینی مفاد کا پاساں ہو گا اور دین کا مستقبل اسی کی ذات گرامی سے وابستہ ہو گا۔

اسی ارشاد کی روشنی میں حضرت فتنی مرتبت کی آنکھ بند ہوتے ہی تحریک اسلامی کی قیادت کا بار گراں حضرت علیؑ علیہ السلام کے کندھوں پر آ گیا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ نے اس گرانقدر ذمہ داری کو کما حقہ پورا فرمایا جو اللہ، رسولؐ اور اسلام کی جانب سے آپ پر عائد کی گئی تھی۔

حضرت علیؑ علیہ السلام نے تحریک اسلامی کی قیادت جس وقت سنبھالی وہ تاریخ اسلام کا انتہائی نازک، حوصلہ شکن اور پر آشوب دور تھا اس لیے کہ —

۱۔ حضرت فتنی مرتبت کے انتقال کی وجہ سے مسلمانوں کو جو صدمہ عظیم پہنچا تھا اور اس کے نتیجے میں ملت کو ہولناک دھچکا لگا تھا اس نے یقینی طور پر مسلمانوں کے ذہنوں کو پر آگندہ دلوں کو افسردہ اور قلوب کو متضلل کر دیا ہو گا۔ اس سانحہ عظیمی کا لازمی نتیجہ ایک فکری انتشار اور ایک ذہنی کرب ہی کی صورت میں نمایاں ہو سکتا تھا چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا مسلمان مرگ رسولؐ کی اطلاع پاتے ہی اس کھو بیٹھے اور ان کو مستقبل بالکل تاریک اور غیر یقینی نظر آنے لگا۔ مملکت اسلامی کی شامی سرحدوں سے پہلے ہی وحشت خیز خبریں آچکی تھیں۔ مقابلہ کے لیے رسولؐ نے جو لشکر تیار کیا تھا اس میں افراتفری پھیل ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں مسلمانوں میں جتنی بھی گھبراہٹ نہ پھیل جاتی وہ کم تھی۔ موقع پرستوں نے اسی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور عین اس وقت جب کہ نبی ہاشمؐ مدین رسولؐ

میں مصروف تھے حضرت ابو بکر کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ پر آگندہ ذہن، افسردہ دل، فلکت عرم اور خوفزدہ مسلمانوں نے اس فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح ایک حواس باختہ قوم اپنی قیادت کے سلسلہ میں ایک اتنا فلفلہ اور ملک فیصلہ کر بیٹھی جس کا بھنگان آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

۲۔ اسلامی حکومت ایسے ہاتھوں میں چلی گئی جو اس حکومت کو اسلامی دعوت کے عام کرنے اور الٹی انقلاب کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنانے پر تیار نہیں تھے بلکہ اس حکومت کے نتیجے میں عربی شہنشاہیت و جود میں لانے کے خواہش مند تھے۔

۳۔ عرب میں ارتداد کا فتنہ سر اٹھا رہا تھا اور مرتدین کی فوجیں مدینہ کی طرف کوچ کر رہی تھیں۔

۴۔ شام میں قیصر کی فوجی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں اور مسیحی قوتوں سے مسلمانوں کے ٹکراؤ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

۵۔ سعد بن عبادہ اور لن کے ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا تھا اس کے نتیجے میں انصار کے ایک بڑے طبقہ میں حکومت و وقت کی جانب سے ایک عام بد دلی اور افسردگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے ابھی اس بد دلی کا محض آغاز تھا لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ اتنی بڑھی کہ انصار اسلامی سیاست سے قطعاً بے تعلق ہو گئے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم کے بعد ہمیشہ مہاجرین اور قریش سلطنت اسلامی کے کرنا دھرنا بنے رہے اور انصار کا بہ حیثیت مجموعی سیاسی مسائل سے تعلق صفر سے زیادہ نہیں رہا۔ ملت اسلامیہ کے اتنے بڑے اور پر جوش حصہ کے مسائل ملی سے کنارہ کش ہو جانا تاریخ اسلامی پر جتنے ہولناک اثرات چھوڑ سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

۶۔ ابوسفیان اور اس کے اسلام دشمن ہاتھی خود مدینہ میں موجود تھے اور اس

موقع کے خطر تھے کہ مرتدین کو ذرا بھی غلبہ نصیب ہو تو مسلمانوں کی بیٹھ میں چھرا گھونپ دیں۔

۷۔ انقلاب اسلامی کے سچے شیدائی اور دعوتِ ایہ کے حقیقی نقیب ہمت کم تھے اور زمانہ نے ایک ایسی پر آشوب کروٹ لے لی تھی کہ وہ خاموش رہنے پر مجبور تھے۔

۸۔ حکومت جن مفاد پسندوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تھی وہ اپنے استحکام کے لیے رجعت پسندوں کا تعاون بھی قبول کر سکتے تھے اس لیے حکومت اسلامی کی اصولی اساس متزلزل ہو گئی تھی۔

۹۔ خلافت کے سلسلہ میں ایک غلط اصول وضع کر لیے جانے کا نتیجہ یہ تھا کہ خود مسلمانوں کے گمراہ ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں غیر ممالک میں تبلیغ اسلام کرنے کے مقابلہ میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ خود ان مسلمانوں پر احتیاق جن کر دیا جائے جو مفاد پسندوں کی کوشش کے نتیجہ میں خلافتِ ایہ کو عربی ملوکیت سمجھ کے دین کے باب میں ایک شدید غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔

امیر المؤمنین "طلب گار سلطنت ہوتے تو اس نازک موقع پر تلوار نکل کر قسمت آزادی کے لیے میدان میں اتر آتے لیکن آپ کو سلطنت عزیز نہیں تھی۔ آپ "بادشاہ" نہیں تھے جو حصول حکومت کے لیے قوم کے مفاد کو نظر انداز کر دیتے۔ آپ امام تھے۔ قوم کے منصوص من اللہ قائد دین کے پاس بان اور ملت کے محافظ۔ آپ کی توجہ سلطنت پر نہیں تھی بلکہ اس دین کی بقاء پر مرکوز تھی جس کی کامیابی کے لیے آپ شب بھر تہاں چار سو گنگی تلواروں کے سائے میں آرام کی نیند سو گئے تھے یا جس کی خاطر آپ نے اپنی جوانی کے پر ہمارا ایام خیر و خندق کے خون نشاں مورچوں کی نذر کر دیے تھے۔ آپ نے حالات کا مدبرانہ جائزہ لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ۔

مسئلہ خلافت پر نہ صرف یہ کہ جنگ نہ کی جائے بلکہ حکمران طبقہ سے محدود تعاون کی پالیسی اختیار کی جائے۔

آپ کے اس مدبرانہ فیصلہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ۔

۱۔ ابوسفیان اور اس کے اسلام دشمن ساتھی مسلمانوں میں جس خانہ جنگی کا خواب دیکھ رہے تھے وہ وجود میں نہیں آئی اور رجعت پسندوں کی مثالوں کی دل ہی تمنا میں نہ گئی۔

۲۔ مفاد پسند حکمران طبقہ کو آپ کی جانب سے جنگ کا جو خطرہ تھا وہ دور ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں اس نے جیشِ اسلامہ کو شام کی طرف روانہ کر دیا۔ اس طرح قیصر کی جانب سے مسلمانوں کو جو دھڑکا لگا ہوا تھا وہ دور ہو گیا اور اسلام کے لیے بیرونی دشمنوں کی جانب سے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ رفع ہو گیا۔

۳۔ مسلمانوں نے اپنی حکومت کے باب میں جو فیصلہ کر دیا تھا وہ چاہے کتنا ہی غلط سی مگر جو ننگ اسے چھینچ نہیں کیا گیا تھا اس لیے مسلمانوں کو سکون کے چند لمحات میسر آ گئے، ان کو ایک طاقتور حکومت بن جانے کا احساس پیدا ہو گیا جس کے نتیجہ میں ان کی گھبراہٹ، ان کا انتشار، ان کا خوف اور سرور کا خاتمہ کی چانک انتقال کے نتیجہ میں پھیلی ہوئی سراپا سنگی دور ہو گئی۔ ان میں پھر ایک بار ہمت، خود اعتمادی، جرات اور جذبہ للبقاء کے جوہر بیدار ہو گئے اور قوم کے نظم (MORALE) پر جو خراب اثرات پڑے تھے ان کا خاتمہ ہو گیا۔

۴۔ حکومت وقت سے نکلنے کے نتیجہ میں پیغمبر اسلام کے بلند مرتبت شاگردوں، تحریک اسلام کے سچی طلبہ و اوروں، الہی نظام نو کی حقیقی معرفت رکھنے والوں اور دعوت انقلاب کے صحیح مفہوم کو جاننے اور سمجھنے والوں کی وہ مختصر سی جمعیت نقل ہو جاتی جس پر آئندہ اسلامی تصور حیات کو عام کرنے کا انحصار تھا۔ امیر المؤمنین

نے خاموشی برت کے اس جماعت کو بچالیا اور اس طرح مشغول میں حقیقی اسلام کی اشاعت کا بندوبست کروایا۔

۵۔ خانہ جنگی وجود میں نہ آنے کی وجہ سے حکمران طبقہ آسودہ ہو کر مرتدین کے مقابلہ میں صف آرا ہو گیا اور اس طرح عربستان کے اندر اسلام کو جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس کا استیصال ہو گیا۔ مسلمانوں کے اتحاد کے نتیجہ میں جہاں مرتدین کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ وجود میں آ گیا وہیں منافقین کی ہمت بھی ٹھکت ہو گئی جو مرتدین کو غلبہ پاتے دیکھ کر مسلمانوں کی پیشہ میں چھرا گونپ دینے کی فکروں میں مشغول تھے۔

امیر المومنین نے اس موقع پر اسی سیاست کا مظاہرہ فرمایا جس کی تعلیم آپ نے حضرت ختمی مرتبت سے حاصل فرمائی آپ کا یہ دستور تھا کہ آپ منافقین اور مولفہ القلوب کو اپنے ساتھ رکھتے تھے تاکہ یہ لوگ مال قیمت اور دولت دنیوی کے لالچ میں کفار سے رزم آزا رہیں اور اسلام کو فتح و ظفر نصیب ہو۔ امیر المومنین نے بھی یہی کیا آپ نے "سلطنت کے شیدائی مفاد پسندوں" کو ملک و مال پر قبضہ کیے رہنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ اپنی سلطنت کے تحفظ کے لیے مرتدین سے جنگ کریں اور اسلام کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا وہ دور ہو جائے۔

مرتدین کا استیصال وراصل سچے مسلمانوں کا کام تھا لیکن امیر المومنین نے یہی کام مفاد پسندوں سے لے لیا اور دولت یا حکومت کی خواہش میں مسلمان ہونے والوں کے ذریعے دشمنان اسلام کی کمر توڑ دی۔ مرتدین سے سچے مسلمانوں کی جنگ ہوتی تو اسلامی دعوت انتحاب کا حقیقی مفہوم جاننے والے بھی کافی تعداد میں مارے جاتے اور اس طرح ان لوگوں کی تعداد کم ہو جاتی جن پر حقیقی اسلام کی اشاعت کا دار و مدار تھا سیاست علویہ نے ان سچے مسلمانوں کو جنگ سے بھی محفوظ رکھا اور مرتدین کا قلع قمع بھی

کر دیا سیاست معاملہ ختمی دور اندیشی اور اعلیٰ حکیمانہ قیادت کا اس سے بڑھتا ہوا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ سیاست کی اس سے اعلیٰ مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ مرتدین کی طاقت مفاد پسندوں کے ہاتھوں ختم کر دی گئی اور جن دونوں طبقوں کو اسلام کے مقابلہ میں متحد ہونا چاہیے تھا ان کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اسلام کے سرے ایک بلا دور کر دی گئی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس زمانہ میں مرتدین کے خلاف جنگ جاری تھی تو حضرت علی علیہ السلام راتوں کو مدینہ کا پہرہ دیتے تھے اور طلباء یہ پھرتے تھے بعض کو تاہ بین اور بصیرت نا آشنا حضرات اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ امیر المومنین اس دور کے مسند فقہین خلافت سے پورا انکسار رکھتے تھے اور آپ کا یہ تعاون "مسلمانوں کی خانہ ساز تعمیر خلافت کا ایک جواز تھا۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا واقعہ یہ تھا کہ تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت سے مرتدین کا استیصال اور قلب اسلام یعنی مدینہ کی حفاظت وراصل امیر المومنین کا فرض تھا اور آپ نے یہ فرض اس طرح پورا فرمایا کہ نام نہاد مسلمانوں کے ذریعہ مرتدین کا استیصال بھی ہو گیا اور مدینہ کی تاریخی کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ بھی آپ کے نام کی بیعت اور آپ کی شب گھٹ کے نتیجہ میں ختم ہو گیا۔

اب اسے چاہیے یوں کہ لکھتے کہ امیر المومنین "حکمران وقت سے تعاون کر رہے تھے اور چاہیے یوں سمجھ لیجئے کہ جس طرح کفار کے مقابلہ میں رسول "مولفہ القلوب کا تعاون حاصل کیے رہتے تھے اسی طرح مرتدین کے مقابلہ میں علی "مفاد پسندوں کا تعاون حاصل کیے رہے اور جس طرح رسول نے منافقین اور مولفہ القلوب کو اپنے ساتھ رکھ کر کفار میں ایک دہشت پیدا کر رکھی تھی اسی طرح امیر المومنین نے دولت اور حکومت کے شیدائی عربوں کی طاقت سے مرتدین کا سر کچل دیا۔

امیر المومنین "مسئلہ خلافت پر خاموش نہ رہتے تو سلطنت کے شیدائی محض اپنی حکمرانی باقی رکھنے کے لیے مرتدین سے مل جانے میں بھی ہاک نہ رکھتے اور منافقین جب

یہ صورت دیکھتے تو وہ بھی اس اتحاد میں شامل ہو کر اسلام کی موت کا سلمان فراہم کر دیتے، امیر المومنین نے اپنی خاموشی کے نتیجہ میں ان تینوں طبقوں کا اتحاد ناممکن بنا دیا اس لیے کہ سلطنت کے شیرانی جو کچھ چاہتے تھے وہ ان کو مل گیا وہ "دیائے اسلام" کے مالک قرار پا گئے اور اب ان کو مرتدین سے لڑنا ضروری ہو گیا جو ان کے اقتدار کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ رہا ابو سفیان اور اس کا گروہ منافقین تو وہ مسلمانوں کا اتحاد دیکھ کر دست بردار ہو گئے کہ ان کو مرتدین کا ساتھ دینے کی صحت نہیں ہو سکی اور اس طرح سلطنت کے شیرانیوں، مرتدوں اور منافقوں کا جو اتحاد خلافت وجود میں آسکتا تھا اس کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔

حسن تدر کے اس بے مثل مظاہرہ کو حکمت ربانی کے علاوہ اور کس لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

اور پھر اس "فتح مبین" کی امیر المومنین کو قیمت کیا اور کتنا پڑی؟  
صرف وہ "بادشاہت" جس کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں تھی وہ  
"انسانی حاکمیت" جو خود آپ کے اصول کے خلاف تھی اور دنیوی  
ظہور شہانہ جس کا ذات پور آپ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا  
تھا۔

رہی وہ امامت کبریٰ وہ خلافت الہیہ اور وہ قیادت ملی جو قدرت نے آپ کو عطا فرمائی تھی وہ نہ کوئی چھینے جانے والی چیز تھی اور نہ چھینی جاسکتی وہ آپ کو بدستور حاصل رہی اور اسی کا ایک مظاہرہ یہ حسن تدر تھا کہ آپ نے مرتدین اور منافقین کی بلخار سے اسلام اور مسلمانوں، دونوں کو بچا لیا۔ بلاشبہ امیر المومنین کو دنیوی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس حکومت سے جو بجا طور پر آپ کا حق تھی یہ ایک عظیم قربانی تھی جو آپ کو دینا پڑی لیکن اس قربانی کے نتیجہ میں مرتدین ختم ہو گئے اور عرب میں اسلام کا آئینہ

اس شان سے چمکا کہ آج بھی ریک ڈار عرب کے ذرات اس ہی رحمت پاش کرنوں سے جھلکاتے نظر آ رہے ہیں۔

منافقین کی آخری امیدیں بھی ٹوٹ گئیں اور وفات رسولؐ سے قاعدہ اٹھا کر جن اسلام کو تاراج کر ڈالنے کے جو منصوبے دلوں کے پردوں میں پروان چڑھ رہے تھے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے مسلمانوں کے لرزے ہوئے دل اور خوف سے کلپتے ہوئے قلب ٹھہر گئے۔ ان میں امت اور خود اعتمادی کے جو ہیڈ لائن ہو گئے وہ جو برجن کے نتیجہ میں مسلمان قوم اس شان سے ابھری کہ سات سو سال تک اقوام عالم پر اس کے اقتدار کا پرچم لہراتا رہا اور آج کے اس مٹے ہوئے عالم میں بھی دنیا کے ایک چوتھائی حصہ پر وہ داد حکمرانی دے رہی ہے۔ اسلام کی جہاں اور آہنی دعوت انقلاب کے فنا ہو جانے کا جو خطرہ وفات حضرت ختمی مرتبتؐ کے وقت پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اسلام کا انحصار پورا کفر و ارتداد کی چیز و تمدن سوم کے ہولناک جھوٹوں سے بچ گیا۔ امیر المومنین نے اسے گر جانے سے بچا لیا۔ آپ کی اولاد اچھلنے سے اپنے لوہے سے بچ کر ایک ستارہ درخت کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

یہ تھی ایک "خاموشی" کی قیمت جو تحریک اسلام کے قائد امیر المومنین علیؑ نے وصول کی اور کون کہہ سکتا ہے کہ دنیوی حکومت کے مقابلہ میں یہ قیمت کم تھی۔

## احقاق حق

حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے وقت دو قسم کے خطرات ابھرے تھے۔

۱۔ ایک خطرہ شامیوں، مردوں اور منافقوں کا تھا، جو ملت اسلامیہ کی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔

۲۔ اور دوسرا خطرہ مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں ایک غلط اصول وضع کر لینے جانے کا تھا جس سے خود اسلام کے اصول برباد ہو جانے کا خوف تھا۔

ملت اسلامیہ کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسے ملت اسلامیہ کے قائد اعظم اور قوم کے مخصوص من اللہ امام نے دور کر دیا۔

رہا اصول اسلام کے لیے خطرہ تو اسے دور کرنا امامت کا نہیں رسالت کا کام تھا۔ چنانچہ اصول کی حفاظت و اشاعت کے لیے وہ ذات آگے بڑھی جسے خود رسولؐ جزو رسالت (بمختہ مثنیٰ) قرار دے کر اسی دن کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے دوران میں بار بار مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح فرمادی تھی کہ آپ کے بعد آپ کا وصی اور جانشین کون ہو گا۔ دعوتِ عیشیہ سے لے کر میدانِ فدک تک علیؑ کی خلافت و وصایت کا بار بار اعلان کیا جا چکا تھا لیکن وصایت کے باب میں آپ کے احکام کا نفاذ چونکہ آپ کی وفات کے بعد ہی ہو سکتا تھا اور یہ خطرہ شدت سے موجود تھا کہ آپ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کمزور عقیدہ مسلمان اس اہم منصبِ شریعت کے باب میں شدید غلط روی کا شکار ہو

جائیں گے اس لیے سرکارِ دو عالم نے اپنے بعد ایک ایسی شخصیت کو چھوڑا جو ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے آپ کا جزو تھی اور مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں حق اور باطل کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دینے کی پوری صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ شخصیت تھی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی جو حیاتِ رسولؐ میں بھی اس اعتبار سے شریکِ الرسولؐ رہ چکی تھی کہ عورتوں سے متعلقہ احکامِ شریعت کی توضیح و تشریح آپ ہی کی ذلتِ بابرکات سے متعلق تھی۔ مردوں سے متعلق شرعی احکام کی عملی تفسیر خود حضرت ختمی مرتبتؐ پیش فرمادیتے تھے، لیکن عورتوں کے مخصوص احکام پر عمل کرنا چونکہ حضور اکرمؐ کے لیے ممکن نہیں تھا اس لیے ان احکام کی عملی توضیح کے لیے ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو معصومہ ہو، تاکہ مسلمان خواتین اس کی ماسیٰ کر سکیں معصومہ عالم اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے وجود میں آئی تھیں اور دورِ حیاتِ رسولؐ میں اپنے عظیم المرتبت والد کے فرائض میں ان کا ہاتھ بٹائی رہیں لیکن ابھی آپ کو ایک فریضہ انجام دینا تھا۔ وہ فریضہ جس میں آپ کو عورتوں کے ساتھ مردوں کی قیادت بھی فرمانا تھی۔ جس میں آپ کو شریعتِ اسلامیہ کے ایک اہم رکن یعنی مسئلہ خلافتِ اسلامیہ کی توضیح و تشریح فرمانا تھی۔ جس منزل پر آپ کو احقاقِ حق و باطل کے لیے ایک عظیم الشیرِ جواد فرمانا تھا۔ ایسا جواد جس کے نتیجے میں حق اور باطل ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہو گئے کہ آج تک تلبیس و تدلیس کا کوئی حربہ اس باب میں سچے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کر سکا ہے۔

خلافت کے باب میں حضرت سرور کائناتؐ نے جتنی بھی ہدایات فرمائیں مسلمانوں نے ان کی مختلف توجیہ و تفسیح کر کے انہیں اپنے مطلب کے مطابق ڈھال لیا۔ حتیٰ کہ فدک کے کھلے ہوئے اعلانِ وصایت کے سلسلہ میں بھی طرح طرح کے مطالب پیدا کر دیے گئے اور اس طرح حق پر باطل کے اتنے خلاف چڑھا دیے گئے کہ

حق اور باطل میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا۔ اس سلسلہ میں حاشیہ آرائیوں، غلط بیانیوں اور جھوٹے دلائل کا اتنا طوفان ہاندا ہوا گیا کہ خود حضرت امیر المومنینؑ پر یہ تصمت عائد کر دی گئی کہ آپ نے رسولؐ کے بعد منصب خلافت پر قبضہ کر لینے والوں کی بیعت فرمائی تھی۔ حق پر یہ ایک انتہائی مسلک وار تھا جو باطل کی جانب سے عائد کیا گیا تھا اور شیطان کی اس ضرب نے ملت اسلامیہ کو گمراہی اور شریعت کے ایک اہم رکن کے حقائق شدید غلط فہمی کا شکار کر دیا تھا۔ حق و باطل کا یہ انتہائی اہم کراؤ تھا جو وفات رسولؐ کے بعد ہی وجود میں آیا اس موقع پر رسولؐ زادی حق کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئی اور اس نے اپنے خاموش مجاہدہ کی مدد سے باطل کو وہ دندان شکن شکست دی کہ پوری ملت اسلامیہ کو گمراہی کا شکار کر دینے کا شیطانی خواب ہمیشہ کے لیے سمار ہو گیا۔

مگر کہ حق و باطل میں خاتونِ جنتؑ کی اس بے حد میل کامیابی کی داستان دلچسپ بھی ہے اور عبرت خیز بھی۔

دینا جانتی ہے کہ شاہزادی ایک انتہائی دولت مند ماں کی اکلوتی وارث تھی اور اس اعتبار سے اسے دنیوی دولت کی کوئی کمی نہ تھی لیکن یہ ساری دولت اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کر دی گئی اور شاہزادی اس پر خوش تھی کہ اس کی دولت کی بدولت دنیا دولت اسلام سے مالا مال ہو گئی۔ شاہزادی اس رسولؐ کی پیارہ جگر تھی جو امت کا شفیق باپ اور رحمت عالم تھا اور اس علیؑ کی شریک حیات تھی جو اپنے بچوں کو بھوکا رکھ کر بھی نقرائے مدینہ کی لید اور کرنا ضروری تصور کرتا تھا خود شاہزادی کا کردار یہ تھا کہ اس نے شب عروسی بیچند وار لباس میں بسر کی اور پلایا کا دیا ہوا لباس نو ایک فقیر کو عطا کر دیا۔ شاہزادی کے اس کردار کو نظر میں رکھیے اور پھر یہ سوچئے کہ یہی عورت ایک جائیداد کے لیے اپولن خلافت میں مقدمہ دائر کرتی ہے گولہ پیش کرتی ہے اور جب اس کا دعویٰ خارج کر دیا جاتا ہے تو خلافت مآب اور ان کے شیر خاص سے اس حد تک ناراض ہو

جاتی ہے کہ ان سے گفتگو نہ کر دیتی ہے اور یہاں تک ہدایت کر دیتی ہے کہ اسکی میت پر بھی یہ لوگ نہ آئے پائیں۔

// عمومی حالات ہوتے تو شاید شاہزادی کو اس کی پروا بھی نہ ہوتی کہ مسلمانوں نے آپ کی ایک جائیداد لے لی۔ ممکن ہے کہ اگر کوئی غریب مسلمان آپ سے اس جائیداد کا سوال کر لیتا تو آپ بھینٹا یہ دشمن لے عطا فرما دیتیں ایسی حالت میں جس عورت نے اپنی ماں کی بے شمار دولت مسلمانوں پر قربان کر دی تھی وہ ایک لونی سی جائیداد کے لیے مسلمانوں سے ہرگز تادمہ نہیں کر سکتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ شاہزادی نے فدک کا سوال اس لیے نہیں اٹھایا تھا کہ آپ اس جائیداد کو مسلمانوں سے عزیز رکھتی تھیں یا خدا انخواستہ اسے اپنی روزی کا ذریعہ خیال فرماتی تھیں، ایسا خیال بھی کفر کے مترادف ہے اس لیے کہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے آپ فدک کو اپنے رزق کا سارا نہیں مانتی تھیں بلکہ رزق کے باب میں صرف اللہ پر توکل فرماتی تھیں ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ آپ نے فدک کا سوال کسی اور غرض سے اٹھایا تھا اور وہ غرض تھی باطل کو بے نقاب کر دینا۔

آپ نے فدک کا دعویٰ دائر کیا تو اس میں آپ کی حیثیت مدعیہ کی تھی اور حاکم وقت مدعا علیہ تھے قانون اور انصاف کا ایک لونی طالب علم بھی یہ کہہ دے گا کہ مقدمہ کا فیصلہ ہمیشہ ایک غیر جانبدار عدالت کو کرنا چاہیے لیکن باب فدک میں ہم یہ تماشادیکھتے ہیں کہ خود مدعا علیہ حج کے فرائض انجام دے رہا ہے چنانچہ خلافت مآب نے جو مدعا علیہ کی حیثیت رکھتے تھے اپنی جانب سے کوئی ثبوت یا شاہد پیش کیے بغیر مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر دیا اور اس طرح تاریخ عدل و انصاف میں ایک ایسے باب کا اضافہ فرما دیا جس پر شاید انصاف قیامت تک ماتم کٹاں نظر آئے گا۔

خلافت اسلامیہ کا بنیادی اصول عدل ہے لیکن مسلمانوں نے جس شخص کو خلیفہ



غضب کیا تھا وہ عدل و انصاف کے اس بنیادی اصول سے بھی ناواقف تھا کہ کسی مدعا علیہ کو مقدمہ فیصل کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ ہر مقدمہ کا فیصلہ ایک غیر جانب دار ثالث ہی کر سکتا ہے۔

اور پھر عدل و انصاف کا یہ کرشمہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ مدعیہ تو اپنے دعوے کے حق میں گواہ پیش کرتی ہے اور وہ گواہ ناقابل قبول قرار دے کے مسترد کر دیے جاتے ہیں۔ اور مدعا علیہ اپنے حق میں کوئی گواہ بھی پیش نہیں کرنا بلکہ صرف ایک ایسے قول کی اساس پر جسے اس کے سوا اور کسی نے نہیں سنا تھا، مقدمہ کا فیصلہ اپنے حق میں کر دیتا ہے۔

اگر انصاف یہی ہے تو شاید قانون اور عدل کی ساری کتابیں ویرا بڑ کر دینا چاہیں گی اور یہ بات مان لینا پڑے گی کہ مطلق العنان بادشاہوں کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون اور آمرین کی ہر جاہلانہ خواہش کا نام انصاف ہے۔

مقصود عالم کے اس اقدام نے ہمارے سامنے یہ صاف اور سیدھا سوال پیش کر دیا کہ آیا وہ شخص بھی جو انصاف کے مبادی تک سے ناواقف ہو منصب خلافت کا اہل کہا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ ہے ”نہیں“ اور ہمیں سے ہر سلیم العقول انسان پر حق واضح ہو جاتا ہے۔

سیدہ عالم نے لبطل باطل کے معاملہ میں اسی پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ باطل پر ایک اور ضرب بھی عائد کی۔

آپ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے اپنی ناراضگی کا اعلان کر دیا اور ان حضرات پر ایسی غضب ناک ہوئیں کہ ان کو اپنے جنازہ تک پر آنے کی ممانعت کر دی۔

دنیا جانتی ہے کہ سرکارِ دو عالم یہ ارشاد فرما چکے ہیں کہ قاطعہ میری پارہ جگر ہے جس نے اسے ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی۔ جس نے مجھے ایذا دی اس نے خدا کو ایذا

دی اور جس نے خدا کو ایذا دی وہ کافر ہو گیا۔ اب اس اعلان رسالت کی روشنی میں یہ دیکھیے کہ قاطعہؓ کو کورہ بالا حضرات سے ناراض ہیں۔ اتنی ناراض کہ اپنی میت پر بھی ان کا آنا گوارا نہیں کر سکتیں، اب ایسی حالت میں ان حضرات کا خلیفہ رسولؐ کہلانا تو درکنار مسلمان ہونا بھی کہاں تک تسلیم کیا جاسکتا ہے!

مقصود عالم کے اس احتجاج کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ خلیفہ وقت کی ذات اس منصب عظمیٰ کے لائق نہیں ٹھہری بلکہ وہ اصول بھی عمل قرار پا گئے جن کے نتیجہ میں منصب خلافت ان حضرات کو حاصل ہوا، اس لیے کہ جن اصول کے نتیجہ میں خلافت ان حضرات کو نصیب ہو سکتی ہو جن کا ایمان بھی بہ نص رسولؐ مشتبہ قرار پائے وہ ہرگز صحیح اور اسلامی نہیں کہے جاسکتے۔

ایک جائیداد کا سوال اٹھا کے مسلمانوں کی خود ساختہ خلافت کا قہر منہدم کر دینا، جملہ حق و باطل کی تاریخ کا ایک ایسا فلور روزگار کا رنامہ ہے جس پر آل رسولؐ کی تاریخ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے۔

مقصود کو عین کی فتح عین سے بھلا کسے انکار کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ آل رسولؐ کی دور رس نگاہیں یہ تماشا بھی دیکھ رہی تھیں کہ آگے چل کر یہ دعویٰ کیا جائے گا کہ امیر المؤمنینؓ نے خلفائے وقت کی بیعت کر لی تھی اور اس طرح امامت حق پر پورے ڈال کر باطل کو فروغ دیا جائے گا۔ شریکۃ الرسولؐ نے اس فتنہ کا بھی خاتمہ کر دیا اور وہ اس طرح کہ دنیا کا کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کرنا کہ جناب قاطعہؓ نے حضرت ابو بکر کی بیعت کی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مقصود عالم نے حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی تو پھر آپ کے اپنا امام تصور فرمائی تھیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حقیق علیہ ہے کہ من ملت ولم يعرف اعلام زمانہ منبتہ الجاہلیہ (جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کیے بغیر مر گیا وہ کفر

کی موت مراد اس ارشاد گرامی کی روشنی میں یہ لازمی ہے کہ سیدہ عالم جو مسلمان ہیں،  
مگی مومنہ ہیں، خاتونِ جنت ہیں، سیدہ زنانِ بہشت ہیں ضرور اپنے امامِ زمانہ کی معرفت  
کامل رکعتی ہوں گی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے نہ صرف یہ  
کہ حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کی بلکہ ان سے ناراض رہیں، ایسی حالت میں وہی  
صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ یا تو جناب سیدہ کے ایمان سے ہاتھ دھویا جائے اس لیے کہ آپ نے خلیفہ  
وقت کی بیعت نہیں کی تھی اور

۲۔ یا پھر یہ مان لیا جائے کہ وہ شخص سرے سے امامِ زمانہ تھا ہی نہیں جس کی بیعت  
سے آپ نے احتراز فرمایا تھا بلکہ امامِ زمانہ کوئی اور شخص تھا اور آپ اسی کی بیعت  
میں تھیں!

ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی مسلمان جناب سیدہ کے ایمان سے انکار نہیں کر سکتا بلکہ  
ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ سیدہ زنانِ بہشت ہیں ایسی حالت میں صرف دوسری  
ہی صورت صحیح قرار پاتی ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ حضرت ابو بکر کی خلافت کا ماحول  
ختم ہو جاتا ہے بلکہ امیر المومنین کی امامت حقہ کا بھی ناقابل انکار ثبوت مل جاتا ہے اس  
لیے کہ وہ ذاتِ پاک جو شریکہ الرسول تھی، معصومہ تھی، سیدہ زنانِ بہشت تھی آپ  
ہی کو امام تسلیم کرتی تھی اور صرف آپ ہی کی بیعت کو جائز قرار دے رہی تھی۔

جناب فاطمہؑ سے زیادہ فضائے رسالت کو جاننے اور سمجھنے والا بھلا اور کون ہو سکتا  
ہے؟ ایسی حالت میں جب یہ عارفہ فضائے رسولؐ بفتح الرسولؐ شریکہ رسولؐ علیؑ  
کی امامت کو حق قرار دے رہی ہے تو پھر اس کے حق ہونے سے بھلا کسے انکار ہو سکتا  
ہے؟

استقرارِ حق کے سلسلہ میں معصومہؑ کی یہ سنی بلیغ معرکہ حق و باطل کی تاریخ کا

ایسا شہزادہ ہے جس پر خود حق بجا طور سے ناز کر سکتا ہے۔

جناب سیدہؑ نے تیغ و سنان سے جنگ نہیں کی اس لیے کسی نے اس ”جنگ“ میں  
آپ کی فتحِ عینین پر غور نہیں کیا جس میں خون کا ایک قطرہ بمائے بغیر حق کو فتح نصیب ہوئی  
اور باطل کی شہِ رگ کاٹ دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ معصومہؑ کا یہ مجاہدہ بھی حق و باطل کی  
جنگ کا ایک جزو تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ خونیں جنگ نہیں تھی۔ ”صرد جنگ یا  
اعصابی جنگ“ تھی جس میں آل رسولؐ نے فتحِ عینین حاصل کی اور اس قرآنی اعلان کو سچ  
کہہ رکھا کہ حق ہمیشہ مظفر و منصور ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ ناکام و نامراد۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوتے ہی آل رسولؐ کو  
دو مورچے سر کرنا پڑے۔ ایک بیرونی حملہ آوروں کا مورچہ جسے تحریکِ اسلامی کے قائد  
اعظم نے مغادر پرستوں کو مرتدین کے مقابلہ میں صف آرا کر کے ختم کر دیا اور دوسرا  
اندرونی خطرہ جس میں مسلمانوں کے عقائد برباد ہونے کا احتمال تھا اسے رسولِ زاوی نے  
اپنے خاموش مجاہدہ سے دور کر دیا!

مسلمان بھی بچا لیے گئے اور اسلام کو بھی بچا لیا گیا۔ شیطان کے دونوں وارِ خالی  
گئے اور حق کی اتنی بڑی جنگ جیت لی گئی۔

اور مزہ کی بات تو یہ ہے کہ اس ”جنگ“ میں نہ تو وارِ چلی نہ خونِ بمانہ قربانیاں  
پیش کرنے کی نوبت آئی، نہ حق پرستوں کو جان دینے کی ضرورت محسوس ہوئی بلکہ  
صرف امیر المومنینؑ کی خاموشی اور معصومہؑ کے آنسوؤں نے یہ دونوں مورچے سر کر  
لیے۔

اللہ اللہ! آل رسولؐ کی کیا شان ہے؟ کہ ان کا ایک مودچہ رہتا ہے تو حق کے  
پرچم کھل جاتے ہیں اور ایک عورت پکار اٹھتی ہے تو قصرِ باطل کے سنگرے منہدم ہو  
جاتے ہیں۔

حق پرستی کی تاریخ کتنی ہی شاندار کیوں نہ سہی لیکن اس پایہ اور اس شان کے  
فاتحین پیش کرنے سے بہر حال قاصر ہے اور یہ عظمت و شرف صرف خاتم النبیین کی آلہ  
ہی کو نصیب ہے کہ ان کی لب کشائی میں بھی حق کے لیے نظر ہے اور ان کی خاموشی میں  
بھی حق کی فتح!



## تبلیغ اسلام

مرتدین، منافقین اور مفاد پسند مسلمانوں کے سلسلہ میں سیاست طلویہ کو بے پناہ  
کامیابی نصیب ہوئی۔ لیکن ابھی دوسرے عظیم مسائل موجود تھے اور تحریک اسلامی کے  
قائد کو ان امور میں بھی اپنی بصیرت، معاملہ فہمی اور حکمت و سیاست کا امتحان دینا تھا۔  
مرتدین کے استیصال کے ساتھ اندرون ملک کا خطرہ رفع ہو گیا تھا لیکن سلطنت اسلامی کی  
سرحدوں پر طوفان اٹھتے نظر آ رہے تھے۔ ایران کا کسری اور روم کا قیصر اسلام کی ابھرتی  
ہوئی قوت سے خائف تھے اور اسے کچل دینے کی آرزو مند ایران اور شام کی سرحدوں  
سے جنگی ہارے بچنے کی صدائیں آنا شروع ہو چکی تھیں اور یہ یقینی تھا کہ آج نہیں تو کل  
مسلمانوں کی نئی سلطنت کو دنیا کے ان قدیم حکمرانوں سے ضرور ٹکر لینا پڑے گی۔ ملت  
اسلامیہ کا ناخدا اور دعوت اسلامی کا قائد اس صورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔  
اسے معلوم تھا کہ قیصر اور کسری ریگ دار عرب سے ابھرتی ہوئی اس نئی طاقت کا وجود  
برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ دنیا پر اسلام کا اثر اسی وقت غالب ہو سکتا  
ہے جب ان قوتوں کو شکست دے کر مسلمان صف اول کی بین الاقوامی طاقت بن  
جائیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھا کہ عربستان کے باہر اسلام کی آواز جیسی  
پہنچائی جاسکتی ہے جب قیصر کسری کی تیار کردہ سید سکندری جس نے جزیرہ نمائے عرب کو  
گھیر رکھا تھا توڑ ڈالی جائے اور انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کر کے اللہ کی عہدیت  
میں دے دینے کا اسلامی تصور اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب انسانی حاکمیت کے ان  
دونوں سب سے بڑے ہتوں کو جنہیں دنیا قیصر کسری کے نام سے یاد کرتی تھیں پاش پاش

کر ڈالا جائے۔ یہ تھی وہ صورت حال جو مرتدین کے استیصال کے بعد انقلاب اسلامی کے داعی کے سامنے تھی اور اسے اس حکمت ربانی کے ساتھ اس کا بھی مقابلہ کرنا تھا جس کا مظاہرہ وہ مرتدین کے باب میں کر چکا تھا۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مرتدین کے خاتمہ کے بعد امیر المومنین نے حصول خلافت کے لیے جنگ کیوں نہیں کی؟ لیکن یہ اعتراض دراصل تاریخ اسلامی اور خود امیر المومنین کی صحیح موقف کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے یہ لوگ امیر المومنین کو بھی انہیں دعویدار ان خلافت و طلبکاران سلطنت کی سطح کا انسان تصور کرتے ہیں جنہوں نے ہر ہر قدم پر حصول حکومت کے لیے بخت و عشق کر کے مسلمانوں کی سطوت و شوکت کا جواز نکال دیا ان کے اتحاد کو پانہ پارہ کر ڈالا اور ان کی اس عظیم سلطنت کو خانہ جنگیوں کا لاشعری سلسلہ جاری کر کے برباد کر ڈالا جس کی سرحدیں بنگالہ سے لے کر مراکش تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دراصل یہ لوگ امیر المومنین کی حیثیت، آپ کے مقاصد آپ کے طریق کار تاریخ اسلام میں آپ کے موقف اور اسلامی تحریک سے آپ کے تعلق کو قطعاً نہیں سمجھتے اور آپ کے افعال و اعمال پر ایک معمولی طلبکار سلطنت کے افعال کے زاویہ سے نظر ڈالتے ہیں۔ چودہ سو سال تک شاہی و سلطانی کے مکروہ نظام زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کے فکرو نظر کے سانچے ہی بگڑ گئے ہیں۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہی غلط ہو گیا ہے اور وہ مقام علوی کی عظمت و رتبت سمجھنے کی اہلیت ہی کھو چکے ہیں وہ اس حقیقت کو سرے سے نظر انداز کرتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام بادشاہت کے آرد مند نہیں تھے بلکہ وصی رسول تھے اور اس لحاظ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی تکمیل آپ کا مقصد حیات تھی۔ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریک اصلاح و انقلاب کے سلسلہ قائم تھے اور اس اعتبار سے اس تحریک کو کامیاب بنانا آپ کی زندگی کا نصب العین تھا۔ آپ اشاعت اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے دست راست رہ چکے تھے۔ اس لیے آپ کو اگر کچھ فکر تھی تو اسلام کا پیغام عالمگیر بنانا دینے کی — آپ خلافت کا دعویٰ ضرور فرماتے تھے لیکن حکومت آپ کے لیے مقصود بالذات نہیں تھی۔ صرف منہاج متھد کی حیثیت رکھتی تھی۔ آپ کو حکومت سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ اس کے ذریعہ سے آپ ایک طرف تو مسلمانوں کی اعلیٰ اخلاقی و روحانی تنظیم قائم رکھ سکتے تھے اور دوسری طرف اس کی مدد سے اشاعت اسلام کا فریضہ انجام دے سکتے تھے۔ خلافت سے آپ کا مقصد نہ ذاتی عیش تھا اور نہ حصول شہرت، ایسی حالت میں آپ تمام معاملات پر اپنے مشن اور اسلام کی بھلائی کے نقطہ نظر سے غور فرماتے تھے اور وہ راہ عمل اختیار فرماتے تھے جو دعوت اسلامی کو عام کرنے کے لیے ضروری اور سود مند ہو کر تھی اس موقع پر بھی آپ نے وہی کیا جو آپ کے مقصد حیات کے اعتبار سے ضروری تھا اور جس سے ان مقاصد کے حصول میں مدد مل سکتی تھی جو آپ کو دل و جان سے عزیز تھے۔

اگر اس موقع پر آپ حصول خلافت کے لیے شمشیر کھنٹ ہو جاتے تو اس کے دو ہی نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو شکست ہو جاتی اور وہ مقدس ہتھیار شہید ہو جاتیں جن پر تبلیغ و اشاعت اسلام کا انحصار تھا اور دوسرے یہ کہ آپ کامیاب ہو جاتے اور تخت خلافت آپ کے قدموں تلے آجاتا اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کا مجموعی نتیجہ کیا برآمد ہوتا؟ ظاہر ہے کہ اگر مومنین صالحین کی یہ جماعت ختم ہو جاتی تو اسلام مجموعہ نہ جاتا منافقین کا، ان سابق مرتدین کا جن کو ابھی ابھی بزور شمشیر مسلمان بنایا گیا تھا اور ان جلال عربوں کا جنہوں نے صحیح طور پر اسلامی دعوت و انقلاب کو سمجھا بھی نہیں تھا۔ ان لوگوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ دنیا کو اسلام کے صحیح تصور سے آگاہ کرتے یا اسلامی نظام کو دنیا میں قائم کرتے قطعاً ممکن ہی بات تھی اور یہ لازمی تھا کہ امیر المومنین کی شہادت کے ساتھ ہی اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔ ایسی حالت میں

شہادت کا مقصد ہوتا اسلام کی موت اور ظاہر ہے کہ امیر المومنین اس صورت حال کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ برباد امر کہ جنگ میں آپ کو کامیابی ہوتی تو اول تو بظاہر اس کی کوئی امید ہی نہیں تھی اور دوسرے اگر آپ کامیاب بھی ہو جاتے تو آپ ایک ایسی قوم پر حکمران ہوتے جو اصولی اور بنیادی طور پر آپ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی تھی۔ جو تلوار کی نوک پر آپ کی اطاعت تو کرتی لیکن تبلیغ اسلام کی جہم میں آپ کا ساتھ نہ دیتی جو آپ کو ”بادشاہ“ تو مانتی لیکن امام کی حیثیت سے قبول نہ کرتی جس کے سر اسلام کے سامنے جھکتے اور دل صنم کدوں کا طواف کرتے اور جس پر آپ ساری دنیا کو مسلمان بنانے کے لیے تو کیا خود سرحد اسلامی کی ممانعت کے لیے بھی اٹھو نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی حالت میں آپ کو اپنی تمام تر توجہ خود عربوں میں اسلام حقیقی کی اشاعت پر مرکوز رکھنا پڑتی اور قیصر کسریٰ کو شکست دے کر ساری دنیا تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا کام دھرا رہ جاتا۔ ایسی حالت میں آپ نے وہی کیا جو حکمت ربانی کے امین کو کرنا چاہیے تھا۔ جو صرف سیاست اسیہ کے وارث عمل میں لاسکتے تھے اور جس حسین مدثر کی مثال اولیاء اللہ کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں ہو سکتی تھی آپ نے حکومت کے باب میں اپنی خاموشی جاری رکھی اور ایسا طرز عمل اختیار فرمایا جس کے نتیجے میں فرماں روا ایمان سلطنت اسلامی میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اب یہ سلطنت ان کی ”اپنی“ ہے، ان کی طاقت کو اب کوئی چیلنج کرنے والا نہیں ہے اور اس لحاظ سے اس مملکت کے تحفظ کی ذمہ داری اب خود انہیں پر ہے۔

اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ”اپنی مملکت“ کو قیصر کسریٰ کے خطرہ سے محفوظ رکھنے کی تیاری شروع کر دی اور جن اسلام دشمن قوتوں کا استیصال خود امیر المومنین اور مومنین صالحین کا فرض تھا ان کو ختم کرنے، ان کے مقابلہ میں سچ آنا ہونے کی ذمہ داری ان مفاد پسند مسلمانوں پر ڈال دی گئی جو سلطنت کے لیے تو کفار سے لڑ سکتے

تھے لیکن ایک مجبور اصول کی خاطر میدان جنگ میں بھیجے جاتے تو وہی منظر پیش کرتے جو احد اور حنین میں پیش کر چکے تھے۔

امیر المومنین نے تخت و تاج کے شیدائیوں کو سلطنت کا کھلونا دے کر جو فائدہ اٹھایا وہ سیاست علویہ کا ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ آپ کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱۔ ان عرب فوجوں نے جو منافقین، سابق مرتدین، مال قیمت کے شیدائیوں، دولت کے پرستاروں اور عربی مملکت کے فداکاروں پر مشتمل تھیں تو وسیع سلطنت اور حصول دولت کے جذبہ میں ان قیصر کسریٰ کی کمر توڑ دی جن سے اسلام کو شدید خطرہ تھا حکمران خوش تھے کہ ان کو ”تاج اعظم“ کا لقب حاصل ہو گیا سپاہی مسرور تھے کہ ان کو کافی مال قیمت میسر آ گیا اور تحریک اسلامی کا قائد، علیٰ خوش تھا کہ مومنین صالحین کو قربانی دینے بغیر دعوت اسلام کے محترم ارکان کو آگ اور خون کی بھیٹی میں جھونکے بغیر اور سچے مسلمانوں کو تلوار کی آج سے محفوظ رکھتے ہوئے اسلام کے دو خطرناک دشمنوں کا خاتمہ کرا دیا گیا۔

۲۔ ایران، مصر، شام، فلسطین اور عراق پر عربوں کا پرچم فتح لہرانے لگا جس کے نتیجے میں ان ممالک میں اس صحیح اور سچے اسلام کی تبلیغ آسان ہو گئی۔ جس کے علمبردار حضرات علی مرتضیٰ تھے۔ کفر کی قوت ٹوٹ گئی اور سچے مسلمانوں کو ان علاقوں میں دعوت اسلام عام کرنے کا پورا موقع حاصل ہو گیا۔

۳۔ قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں جو لڑائیاں لڑی گئیں ان میں ہزاروں مسلمان مارے گئے لیکن حضرت علی علیہ السلام کی ذہانت کے نتیجے میں وہ حقیقی اور سچے مسلمان جو اسلام کے مقصود حقیقی کو سمجھتے تھے جو رسول کی دعوت انقلاب کا سچا نمونہ تھے جو اسلام کی اعلیٰ اخلاقی و روحانی قدروں کے امین تھے اور جنہوں نے

لسان فیض ترجمان رسالت سے اسلام کی حقیقی تفسیر و تشریح معلوم کی تھی ان جنگوں سے دور رہے اور اس طرح وہ لوگ سچ گئے جو مشرقہ علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کے حقیقی معنوں میں لٹل تھے۔

۴۔ قیصر کسریٰ کی ذلت آمیز شکست نے ساری دنیا کی نگاہیں اسلام کی طرف موڑ دیں اور پہلے جس دین کا مذاق اڑایا جاتا تھا اب دنیا بڑی سنجیدگی کی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ غیر ممالک کے لوگوں کو بھی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کے سب سے بڑی بین الاقوامی طاقت بن جانے کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ دنیا بھر میں اسلام کو جاننے کا شوق بیدار ہو گیا۔ اسی طرح اسلام کے پیغام کو عام کرنے کے لیے زمین تیار ہو گئی اور ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو گئی جو تبلیغ میں بے حد معاون ہو آ کر تھی۔

۵۔ امیر المومنین اور دوسرے علمائے امت کو منافقین کی سازشوں سے آزاد ہو کر مدینہ میں قرآن و حدیث اور شریعت کی تعلیم عام کرنے کا موقع حاصل ہو گیا تاریخیں شاید ہیں کہ امیر المومنین اور دوسرے علمائے امت اس زمانہ میں جبکہ فرمانروایان وقت تغیر ملکی کی جہم میں مصروف تھے مدینہ میں وعظ و تبلیغ و ہدایت کا کام پوری سرگرمی سے انجام دیتے رہے اور اس تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ مدینہ علوم اسلامی کا گوارہ بن گیا۔ مدینہ کو فقہ اور حدیث میں جو مرکزیت حاصل ہوئی وہ دوران فتوحات ملکی میں امیر المومنین کی انہی علمی کاوشوں کا نتیجہ تھی منافقین مکہ اور مدینہ میں موجود رہتے تو وہ اسلامی علوم کی اشاعت میں پیشہ رخسہ اندازی کرتے رہتے اور ہرگز اسے پسند نہ کرتے کہ اس دین کا علم عام ہو جسے وہ اپنے دل کے پردوں میں ٹاپند کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ مال قیمت کی تمنا میں مدینہ سے دور ایران و مصر میں مصروف جنگ تھے اس لیے امیر المومنین کو یہ موقع مل

گیا کہ صدر اسلام کو مستحکم کر دیں اور مکہ اور مدینہ کو جو مفاد پسندوں کے اثرات کے نتیجہ میں عربوں کی سیاسی اور عسکری قوت کے مرکز بن گئے تھے اپنے اثرات کے ماتحت علوم و تمدن اسلامیہ کا مرکز بنادیں۔

۶۔ اندرون عربستان میں اسلام کی تبلیغ کھل کر لی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور حیات میں عربوں نے اسلام قبول کر لیا تھا لیکن اس قبولیت اسلام کی حقیقت اس اتنی تھی کہ پیغمبر اسلام کا انتقال ہوتے ہی عربوں کا بیشتر حصہ مرتد ہو گیا تھا۔ ان مرتدین کو دوران خلافت اول دوبارہ بنو کب شمشیر مسلمان بننے پر مجبور کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ تلوار کے خوف سے مسلمان ہونے والے سچے مسلمان نہیں کہے جاسکتے۔ ضرورت اس کی تھی کہ عربوں میں اسلام کی صحیح تبلیغ کی جائے فرمانروایان وقت چونکہ تغیر ممالک میں مصروف تھے اس لیے وہ یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ امیر المومنین پر چونکہ حکومت یا جنگ کی ذمہ داریاں نہیں تھیں اس لیے آپ اور آپ کے ساتھی خاموشی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربستان میں اسلام کے قدم ہمیشہ کے لیے جم گئے۔

مشرقہ ممالک میں جو اسلام پھیلا وہ ان مسلمان فوجوں کی بدولت نہیں پھیلا جو ان علاقوں کو فتح کرنے گئی تھیں اس لیے کہ ان فوجوں میں چاہے کتنے ہی اچھے سچے ذہن کیوں نہ شامل ہوں لیکن اسلام اور اس کے اعلیٰ نظام زندگی کو جاننے والے بہت کم تھے پھر اس حقیقت سے بھی انکار ناممکن ہے کہ جزیب سوراخوں کی تلواریں سروں کو تو جھکا سکتی تھیں لیکن دلوں کو نہیں جھکا سکتی تھیں۔ دلوں پر قبضہ شمشیر کی نوک سے نہیں ہوتا علم، اخلاق، محبت اور روحانیت کی طاقت سے ہوا کرتا ہے۔ یہ کام جنگ آزما سپاہیوں کا نہیں ہے پر امن مبتنی اور علمائے امت کا ہے۔ امیر المومنین ایک اعلیٰ درجے کے مبلغ

اور نفسیات انسانی کے ایک بے پناہ ماہر کی حیثیت سے اس حقیقت کو خوب جانتے تھے چنانچہ آپ نے تلوار کی فتح کو محبت کی فتح میں اور سروں کے جھکاؤ کو دلوں کی تغیر میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ادھر مسلمان ایک ملک فتح کرتے تھے اور صلح نامے امت اس ملک میں تبلیغ کرنے پہنچ جاتے تھے اور آج اسی سیاست کا یہ کرشمہ ہے کہ ایران و مصر و شام سینکڑوں سیاسی انقلابات کے باوجود اسلام کے حلقہ گوش نظر آرہے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ جن علاقوں پر مسلمان جو کبھی شمشیر قبضہ کریں گے وہاں کے لوگوں میں فطری طور پر مسلمانوں کی مخالفت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ ان میں یہ احساس عام ہو گا کہ مسلمانوں نے ان کی سلطنت اور آزادی کا خاتمہ کر دیا ہے ان کے تہذیب و تمدن کو فنا کر دیا ہے ان کے معاہدہ کو پر لٹن اور ان کے مذہب کو تاراج کیا ہے اور محض قوت کے تل پر ان کو عرب سلطنت کا غلام بنا دیا ہے اس احساس کے نتیجے میں وہ اپنے دل کے پردوں میں مسلمانوں کے دشمن رہیں گے۔ مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف رہیں گے اور جیسے ہی ان کو موقع ملے گا وہ مسلمانوں کے خلاف جھانڈت رکے عربوں کے ساتھ ہی اسلام کو بھی اپنے ملک سے بے دخل کر دیں گے۔ عرب فاتحین اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے چنانچہ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ اگر امیر المومنین نے مفتوحہ ممالک میں تبلیغ کا بندوبست نہ کر دیا ہوتا تو عربوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی ان علاقوں سے اسلام کا بھی خاتمہ ہو جاتا۔

ہمارے اس دعوے کا ثبوت خود اسلامی تاریخ ہے۔

تلوار کی فتح اتنی بے اثر اور عارضی ثابت ہوئی کہ مصریوں نے محض چند ہی سال کے اندر تیسری خلافت کا خاتمہ کر کے مجازی عربوں کے طمطراق کو خاک میں ملا دیا اور وہی مصری جن کو ابھی چند روز قبل عربوں نے شکست دی تھی مدینہ کے سیاہ و سفید کے مختار بن گئے۔ یہی نہیں بلکہ مصریوں نے "فاتحین" کے پورے گروہ کو جو مصریوں

کے خوف سے گھروں میں کنڈیاں لگائے بیٹھا تھا نظر انداز کرتے ہوئے اس شخص کو تخت خلافت سوئپ دیا جسے یہ جماعت پورے چالیس سال تک اپنے مقاصد کی راہ میں سنگ گراں تصور کرتے ہوئے ٹھکرائی رہی تھی۔ اور نام "ملاو عرب" "فاتحین" کا یہ عالم تھا کہ ان کو چار و ناچار اسی شخص کی بیعت کرنا پڑی جسے وہ اپنے شہنشاہیت پسندی کے عزائم کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے تھے۔

شامیوں نے تلوار کی فتح کا جو بدلہ دیا وہ اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی خطرناک افسانہ ہے۔ دنیا نے یہ تماشہ دیکھا کہ وہی شامی جن کو مدینہ والوں کی شمشیر برقیاب نے اپنا محکوم بنایا تھا محض تیس سال کی مختصر مدت میں خود مدینہ کے حاکم ہو گئے۔ اسلامی سیاست کا مرکز مدینہ سے دمشق منتقل ہو گیا اور مکہ اور مدینہ کو شامیوں کی شمشیر انتقام کی بدولت بار بار تاراجی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایرانیوں نے اپنی شکست کا انتقام اس طرح لیا کہ ایک صدی کے اندر ہی اندری عباس کے پردہ میں عربوں پر ایرانیوں کا تسلط قائم ہو گیا!

ان تاریخی حقائق سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے؟

یہ واقعات بجائے خود اس کا ثبوت ہیں کہ امیر المومنین نے جلالت کا بہت صحیح اندازہ لگایا تھا اور آپ کا یہ فیصلہ بالکل صحیح تھا کہ تلوار کی فتح چونکہ عارضی اور بے اثر ہے اس لیے اخلاقی، علمی، روحانی اور ذہنی فتح حاصل کی جانی چاہیے تاکہ مفتوحہ ممالک پر اسلام کا اثر قائم رہ سکے۔ آپ پیشہ اسی کوشش میں مصروف رہے چنانچہ آپ کی کاوشوں کا جو نتیجہ لکھا وہ آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔

عرب فاتحین نے قادیسیہ، نمداند اور برموگ میں خون کی ندیاں بہا کر ایران و مصر و شام و عراق پر جو پرچم فتح لڑ لیا تھا وہ تو چند ہی سال میں سرگرم ہو گیا لیکن امیر المومنین نے روحانی، ذہنی اور ذہنی میدان میں جو پرچم فتح نصب کیا تھا وہ آج تک پوری شان سے

جلوہ کر ہے۔ چنانچہ ایران چلے جائے۔ آج وہاں سعد بن وقاص کی فتح کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ نہ گوند کے میدان میں جو خون بہا تھا وہ تیس ہوئیں خشک ہو چکا نہ معلوم کتنی سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں چودہ سو برس میں نہ معلوم کتنے بادشاہ آئے اور گئے لیکن ایران پر امام علی رضی اللہ عنہ کی حکومت بدستور قائم ہے اور امیر المومنین کے اس فرزند کو وہ داعی حکمرانی حاصل ہے جو صرف دلوں کی تسخیر سے حاصل ہو سکتی ہے۔ عراق پر شی بن حارث شہبانی کی لشکر کشی اور خالد بن ولید کی یلغار آج تاریخ کا ایک ورق پارہیہ ہے اور اسلامی تاریخ کے طلبہ کے علاوہ اس عارضی ملک گیری کی داستان بھی کسی کو معلوم نہیں لیکن نجف، کربلا، کاظمین اور سامرہ طوی فتح روحانی کے وہ نقوش جمیل ہیں جو آج بھی دنیا کو آل رسول کی فتح مبین کے مشاہدہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ آل رسول کے ان مآثر حبر کے علاوہ سلمان، جابر بن عبد اللہ انصاری اور حذیفہ یمنی کے مزارات اپنی مرجعیت کے ذریعہ امیر المومنین کی اصابت لگ کر گواہی دے رہے ہیں۔

شام میں یرموک کی فتح بھلائی جا چکی، خالد کی تلوار کسی جانب گھریں بھی موجود نہیں لیکن زینب، ام کلثوم کے ناموں سے منسوب مزارات آج بھی مرجع خلافت ہیں۔ اور امیر المومنین کی حقانیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج شام میں جا کے دیکھ لیجئے کہ اس ملک میں جو آل رسول کے دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز کہلاتا تھا اسلام کے مآثر کس ذات پاک سے تعلق رکھتے ہیں؟ آج شام پر مدینہ کی قرشی حکومت نہیں مدینہ والوں کی سلطنت کا کوئی عکس موجود نہیں تلوار کی فتح کی کوئی نشانی موجود نہیں لیکن آل رسول کی مظلومانہ تبلیغ کے آثار پہ پہ پر موجود ہیں۔ حضرت زینب، حضرت ام کلثوم، حضرت سیدہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت مقداد، حضرت جبر بن عدی، حضرت بلال، حضرت ابی بن کعب، حضرت رقیہ بنت الحسین، حضرت عبداللہ ابن جعفر، حضرت عبداللہ بن امام زین العابدین، حضرت فاطمہ بنت الحسین، اور حضرت عبداللہ بن امام جعفر صادق کے

مزارات قید خانہ شام، مشد راس الحسین، منبر سید سجاد، بازار شام کا پھاٹک اور سرہانے مشد کے کربلا، آج بھی شام میں اسلام کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں۔ تلوار کی فتح کے آثار مٹ گئے لیکن امیر المومنین اور خاندان رسالت کی روحانی فتح شام کو اسلامی ممالک کا گوارا بنانے ہوئے ہے۔

لبنان میں محض ایک تاریخی عمارت ہے اور وہ ہے امیر المومنین کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ کا روضہ جو لبنان کے مسیحی ماحول میں بھی اسلام کی یاد تازہ کرنا رہتا ہے۔

مصر میں مشد راس الحسین کو جو مرجعیت حاصل ہے وہ کسی دوسری عمارت کو حاصل نہیں۔

یمن تلوار سے فتح نہیں ہوا، امیر المومنین کی تبلیغ سے فتح ہوئی۔ لیکن طوی تبلیغ کا اثر کچھ اتنا گہرا تھا کہ اسے اسلام سے وابستہ رکھنے کے لیے سرزمین یمن پر نہ تو کوئی قربانی دینا پڑی اور نہ علی کے بعد کسی دوسرے کو اس علاقہ میں تبلیغ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ آج یمن میں اسلام کی بقا اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اسلام کو کسی عسکری فتح کی ضرورت نہیں تھی۔ اسلام پر امن طریقہ پر ہی پھیل سکتا تھا اور پھیلا شام و ایران و عراق اگر آج مسلمان ہیں تو اس لیے نہیں کہ ان علاقوں کو بیورو شمشیر اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا بلکہ ان علاقوں میں اسلام کا وجود آل رسول کے روحانی اور تبلیغی مجاہدات اور ان کی بے مثل قربانیوں کا صدقہ ہے یمن چونکہ تبلیغ سے مسلمان ہوا تھا اس لیے وہاں کسی قربانی کی ضرورت نہیں تھی۔ عراق، ایران اور شام تلوار سے فتح ہوئے تھے اس لیے وہاں دلوں کی تسخیر ضروری تھی۔ یہ کام قاضیوں نے نہیں کیا، خاندان رسالت نے انجام دیا چنانچہ آج اگر یہ ممالک اسلام کے حلقہ بگوش ہیں اور عرب سلطنت کے خاتمہ کے ساتھ ہی دوبارہ اپنے آبائی مذہب کی طرف نہیں پلٹ گئے تو یہ



لیض ہے اس دلوں کی فتح کا۔ اس روحانی اقتدار کا اس جی مقلوبانہ تبلیغ کا جس کے علمبردار امیر المومنین تھے۔

مزید یقین کی ضرورت ہو تو اندلس پر نظر ڈال لیجئے، مہدیہ کو دیکھ لیجئے، قبرص اور دودی کینز کو ملاحظہ فرما لیجئے، جنوبی اطالیہ کے حالات پر نگاہ ڈال لیجئے۔ ان علاقوں میں صرف تلواری کی فتح ظہور میں آئی۔ تبلیغ علوی کا مظاہرہ نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جیسے ہی مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت میں زوال پیدا ہوا ان علاقوں سے اسلام کا بھی خاتمہ ہو گیا شام و ایران و عراق و مصر کا بھی یہی حال ہوا لیکن آل رسول نے دلوں کی فتح کا جو بندوبست کیا تھا اسی کے نتیجہ میں یہ علاقے سینکڑوں سیاسی انقلابات کے باوجود مسلمان ہیں اور اس خاموشی سنی و جہد کی گواہی دے رہے ہیں جو امیر المومنین اسلام کے لیے فرما رہے تھے۔

امیر المومنین کی فتح یمن کا اس سے زیادہ کھلا اور روشن مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن ممالک کو ان لوگوں نے فتح کیا تھا جو امیر المومنین کو مسند خلافت سے دور رکھ کر آل رسول گوشہ گمنامی میں پھینک دینا چاہتے تھے انہیں ممالک کے عوام آل رسول کے مزارات، الور کی خاک کو تو تپائے چشم بنا رہے ہیں اور آج جبکہ عرب فاتحین اور ان کے سرداروں کے نام صرف ارباب تاریخ کو یاد رہ گئے ہیں عوام نجف و کربلا و خراسان کی روحانی عظمت کے سامنے سرنگوں نظر آ رہے ہیں یہ ہے دلوں کی اس فتح کا مظاہرہ جو امیر المومنین نے حاصل فرمائی اور جس کے نقوش انتہائی ظلم و ستم کے باوجود آج تک اسلامی عالم میں ہیرے کی طرح جگمگاتے نظر آ رہے ہیں۔

تحریک اسلامی کے قائد کے عظیم تدر اور اس کی بے پناہ تبلیغی صلاحیتوں کا اس سے شاندار مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے تحریک اسلامی کے جو اہر پاروں اور اسلام کے پر امن مہلتوں کو خانہ جنگی کی ہیئت چڑھنے سے بچایا اور چند سال تک تحت

خلافت سے محروم ہونے پر صبر فرمایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دولت اور سلطنت کے پروانوں نے قیصر کسریٰ کے سے دشمنان اسلام کی کمر توڑ دی، دور دراز ممالک اسلام کے ظاہری ڈھانچے سے واقف ہو گئے اور آل رسول کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے خاموش مجاہدات اور پر امن تبلیغ سے ان علاقوں کو ہمیشہ کے لیے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیں۔

اگر تحریک اسلامی کا قائد اعظم دور فتوحات میں مسلمانوں سے ظاہری تعاون کا مظاہرہ نہ کرنا تو تبلیغ اسلام کے یہ ذریعے مواقع سے ہرگز نصیب نہ ہوتے یہی وجہ ہے کہ اس حکیم اسلام نے اس کا لحاظ نہیں کیا کہ تاج شاہی کس کے سر پر جگمگا رہا ہے یا تاریخ کن شخصیتوں کے ساتھ فاتح ایران و شام کے الفاظ استعمال کرے گی، ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی فکر چھوٹے قلب و دماغ کے لوگ کرتے ہیں۔ حکمت ربانی کے امین ایسی اونٹنی باتوں پر نظر نہیں ڈالتے، ان کو صرف اپنے اعلیٰ مقاصد کی فکر رہتی ہے اور وہ ان مقاصد کے اعتبار سے ہی اپنے اقدام تجویز کرتے ہیں، امیر المومنین کے سامنے غیر ممالک میں اسلام کی تبلیغ کا سوال تھا قیصر کسریٰ کی ہی اسلام دشمن قوتوں کو ختم کر دینے کا مسئلہ تھا۔ اسلامی سرحدوں کو محفوظ بنا دینے کی ضرورت تھی اور آپ کو وہ طرز عمل اختیار کرنا تھا جو آپ کے ان مقاصد کو پورا کر سکے چنانچہ آپ نے ایک دور بین قائد کی حیثیت سے تخت خلافت کے حصول میں اپنی قوتیں ضائع نہیں کیں بلکہ وہ انداز کار اختیار فرمایا جس کے نتیجہ میں آپ کے تمام مقاصد خود بخود حاصل ہو گئے۔ مومنین کو آگ اور خون کی ہولی نہیں کھیلنا پڑی۔ مسلمان و ابوذر تلوار کی آغوش سے بھی محفوظ رہے۔ بچے، انقلابیوں کو قیصر کسریٰ سے نکلواؤ بھی نہیں لیتا پڑا اور دنیا نے دیکھا کہ دشمنان اسلام کی قوت پارہ پارہ ہو گئی۔ اسلام کی سرحدیں ان لوگوں نے جن کو انقلاب اسلامی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو صرف دولت کے لیے لڑ رہے تھے قائد اٹھایا تحریک اسلامی کے لیے ان شیرانیوں نے جو جنگ سے دور امن کی فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ لڑنے

والے سلطنت کے لیے مرتے رہے اور صلحائے امت بھائے اسلام کے لیے جیتے رہے۔ اس سے زیادہ مدبرانہ قیادت اور تحریک اسلامی کی بصیرت افزا لہڑی شہ نورد کیا ہو سکتی ہے؟

امیر المومنین علیہ السلام کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مفتوحین میں ہمیشہ فاتحین کے خلاف نفرت کا ایک جذبہ موجود رہتا ہے اور یہ نفرت صرف فاتحین کی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے مذہب، تمدن، تہذیب اور روایات تک سے مفتوحین کو شدید نفرت ہوا کرتی ہے یہ اور بات ہے کہ فاتحین کے رعب و دہشہ کے نتیجے میں مفتوحین خاموش رہیں لیکن یہ خاموشی رضامندی کا ثبوت نہیں ہوتی۔ مصر و عراق و ایران و شام بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ان ممالک میں بسنے والی قومیں بھی علم الاقوام کے اس دستور سے الگ نہیں چل سکتی تھی۔ وہ بھی اس نفسیاتی رد عمل کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھیں اور بہت ممکن تھا کہ ان ملکوں میں بھی اسلام کا وہی حشر ہو تا جو اسپین میں ہوا لیکن آل رسولؐ نے اپنی مظلومیت، حق پرستی، تلخ اور روحانی برتری کے سارے اس رد عمل کو جو جو میں آنے سے روک دیا اور ان ممالک پر یہ حقیقت آشکار کر دی کہ اسلام فاتحین کی خونریز تلواروں کا نام نہیں ہے۔ کربلا کی داستان مظلومی کا نام ہے۔ اسلام حرم کشاور کشتائی کا مظاہرہ نہیں ہے ایک بلند تراخلاق اور روحانی نظام کا نام ہے اور اسلام کا مقصد مفتوحین کی دولت پر ڈاکہ ڈالنا نہیں ہے۔ خوف بھوکے وہ کر غریبوں کا وہ شہ پانا اسلام کی تعلیم ہے، عراق، ایران، مصر و شام کی مفتوح قوموں نے یہ سمجھ لیا کہ اسلام کے حقیقی نمائندے وہ فاتحین نہیں تھے جنہوں نے ان ممالک کو روند ڈالا تھا بلکہ اسلام کی سچی تصویر وہ آل رسولؐ تھی جس نے خود اپنے خون میں نما کر عروس اسلام کے بیخ پر نور کو نکھار دیا تھا۔ اسپین اور قادیسیہ کے لوگوں کو یہ تجربہ نہیں ہوا انہوں نے صرف بنی امیہ کی تلواریں دیکھیں، آل رسولؐ کی قرآنوں اور ان کی محبت آفریں تلخ کا

مظہر نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے موقع ملنے ہی مسلمانوں کے ساتھ ہی اسلام کا بھی خاتمہ کر دیا لیکن عراق و ایران و مصر و شام نے آل رسولؐ کو دیکھا، سیاست علویہ کے سبے پناہ کمال کو دیکھا یعنی سچے اور گھرے ہوئے اسلام کو دیکھا اور یہی وجہ ہے کہ جمال انہوں نے مدینہ والوں کی فرمانروائی کا جلال توڑ ڈالا وہیں اسلام کی جبل التین میں خود اس طرح جکڑے گئے کہ آج تک وہاں آفتاب اسلام کی ضیاء پاشیاں جاری ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے جن عظیم مصلح کی بنیاد پر کوفہ کو اپنا دار الحکومت قرار دیا ان میں ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ عراق اور ایران کے لوگ جن کے دلوں میں اپنی سلطنت اور عجمی تہذیب کی برہادی پر غم و غصہ کے شرارے بھڑک رہے تھے اور جو اسلام کو عرب شمشادیت کا مترادف سمجھ رہے تھے اسلام کے پیکر حقیقی کو امیر المومنین اور آل رسولؐ کی شکل میں دیکھ لیں، ان لوگوں نے اب تک مسلمانوں کی تلوار کو دیکھا تھا اور حرم کشاور کشتائی کو اسلام سمجھا تھا اب ان کے سامنے آل رسولؐ کے مجرم افزاؤ پیش کیے گئے تاکہ وہ سمجھ لیں کہ اسلام نام ہے اس اعلیٰ اور برتر ذہنی، روحانی، علمی اور انقلابی تحریک کا جس کا مظہر اتم علیؑ، جنہیں "حسین" اور ان کے ساتھی ہیں۔ اسلام کا یہ روپ پیش ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ گمبھوں کے دل اسلام کے لیے جیت لیے گئے اور مسلمان فاتحین کی عارضی شمشادیت اسلام کی دائمی فتح میں تبدیل ہو گئی۔

شام کا معاملہ البتہ بہت تیز تھا۔

یہ صحیح ہے کہ شام خلافت دوم کے ابتدائی عہد میں فتح کر لیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی کہ ابتدا سے ہی شام اس آل ابوسفیان کے ہاتھوں میں رہے اور کیا تھا جسے اسلام ظاہری تک سے دلچسپی نہیں تھی اور جس نے خود مسلمانوں کی تلوار کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا۔ ایسی حالت میں شام میں حاکم اور محکوم، راعی اور رعایا دونوں وہ تھے جو اسلام سے اپنی ٹھکست کا بدلہ لینے کے

خواہش مند تھے اور یہ چاہتے تھے کہ جس طرح مسلمانوں نے ان کے اقتدار، ان کی سلطنت، ان کے تمدن اور ان کے مذہب کو مٹایا ہے اسی طرح وہ اسلام اور اس کے تمام آثار کا خاتمہ کر دیں شامی آل ابوسفیان کے محض اس لیے فدائی تھے کہ وہ یہ جانتے تھے کہ ابوسفیان نے خلافت کا لشکر قائم ہوتے ہی جنت و نار کا محکمہ اڑایا ہے اور حاکم شام کا فرزند کھلم کھلا وحی کا مذاق اڑاتا ہے۔ ایسی حالت میں شامی یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ آل ابوسفیان کے پروردہ میں اسلام اور مسلمانوں سے اپنی شکست کا پورا پورا انتقام لے سکیں گے۔ اسی طرح امیر معاویہ کو شامی عزیز تھے اس لیے کہ موصوف یہ جانتے تھے کہ کفار مکہ کا خاتمہ ہو جانے کے بعد اب شامی لشکروں کی مدد سے ہی اسلام کی انقلابی تحریک کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، اسی حالت میں راعی اور رعایا دونوں کا عقائد دونوں کا مقصد نصب العین ایک تھا دونوں اسلام دشمنی کے مسئلہ پر متحد تھے یہ صحیح ہے کہ دونوں کے چہروں پر اسلام کی نقاب پڑی ہوئی تھی لیکن دلوں کا حال تو بس خدا ہی کو معلوم تھا شامی عیسائی محض تلواریں کے بل پر اسلام کو حق نہیں مان سکتے تھے اس لیے پشیمانوں پر ہلال آوریاں کر لینے کے باوجود ان کے دل کے کلیسا صلیب سے معمور تھے۔ ان کی زبانوں پر توحید کا کلمہ ضرور تھا لیکن دل تثلیث کے پرستار تھے۔ وہ ظاہر میں بہ خوف شمشیر اسلام کے آئے تھے لیکن باطن میں مسیحیت کے شیدائی تھے اس لیے کہ یہ تو ایک حقیقت ہے کہ جبر سے دل یا مذہب تبدیل نہیں ہوا کرتا عقائد نہیں بدلا کرتے۔ تلوار کی طاقت زبان سے چاہے کچھ کہلو الے لیکن تصورات کی دنیا پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ عربوں کی تلوار نے شامیوں پر اسلام "مسلط" کر دیا تھا لیکن ان کے دلوں سے مسیحیت ختم نہیں کی تھی۔ امیر معاویہ اس حقیقت کو خوب جانتے تھے چنانچہ انہوں نے شامی عیسائی کی دلجوئی کے لیے ہی وہ رویہ اختیار کیا تھا جس پر حضرت عمر کو یہ تاریخی جملہ ادا کرنا پڑا تھا کہ "معاویہ عرب کا قیصر ہے" امیر معاویہ کے صلیب گلے میں ڈال کر مرنے میں بھی یہی رمز پوشیدہ

تھا، موصوف خوب جانتے تھے کہ آپ کی رعایا کا اصلی مذہب کیا ہے اور ایک ہوشیار سیاستدان کی حیثیت سے رعایا کے جذبات سے کھینچا بھی خوب جانتے تھے "آپ نے اپنی ان تدابیر سے شامیوں پر اچھی طرح سے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں جنہوں نے شام کی مسیحی سلطنت، مسیحی تہذیب، قدیم شامی زبان اور مسیحی تمدن کو مٹایا ہے بلکہ آپ بھی دارصل انہیں لوگوں کے زخم خوردہ ہیں اور صرف اسی حد تک مسلمان ہیں جس حد تک تمہارے شامیوں کو مسلمان بنانا ہے۔ ایسی حالت میں بنی امیہ اور شامیوں میں جس حد تک بھی اتحاد نہ ہو جاتا وہ کم تھا اس اتحاد نے پہلے تو یہ کیا کہ خلافت دوئم و سوم کے زمانہ میں اسلام حقیقی کے علمبرداروں کو شامی سرحد میں داخل ہونے سے روکے رکھا چنانچہ ابوذر شام گئے تو نکالے گئے اور جو دوسرے ممتاز صحابہ رسول اسلامی نظام زندگی کو سمجھتے تھے ان کو بھی شام سے دہس نکلا دے دیا گیا تاریخ میں بے شمار واقعات اس قسم کے بھرے ہوئے ہیں جس کا مکی چاہے دیکھ لے اور جب دولت کی فراوانی اور ایمانی جذبہ کی کمی نے مرکز اسلام کو کمزور کیا تو یہی اتحاد شامی و عیسائی اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالنے صدر اسلام کو فدا کر دینے اور اسلامی انقلاب کا نام و نشان محو کر ڈالنے کے لیے سفین کے میدان میں خیمہ زن ہو گیا۔

شام کا مکار عیسائی یہ جانتا تھا کہ اگر اس نے اسلام کی زواہر کے مسیحیت کا جامہ پہن لیا تو سارے مسلمان شامیوں کے مقابلہ میں صف آرا ہو جائیں گے اور اس مرتبہ پر موک سے بھی زیادہ دولت، امیر شکست کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے وہ اسلام کی نقاب لوزھ کے اسلام پر حملہ کرنا چاہتا تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے نبی اور آل نبی کو مٹانے کا نام لیا تو مسلمان مشتعل ہو جائیں گے اس لیے اس نے نبی اور خانوادہ نبوت کے بجائے علی اور آل علی کا لفظ گھڑ لیا اور یہ اعلان کیا کہ وہ علی اور ان کی آل سے لڑ رہا ہے وہ جانتا تھا کہ رسول و آل رسول اور علی و آل علی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علی و آل

علی کو مٹا دیا تو رسولؐ اور ان کے خاندان کا نام تاریخ سے محو کر دیا لیکن پیغمبر اسلامؐ کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے میں یہ خطرہ تھا کہ سارے مسلمان مقابلہ میں صف آرا ہو جاتے علیؑ و آل علیؑ کے خلاف اعلان جنگ کرنے میں یہ خطرہ باقی نہیں رہتا تھا بلکہ یہ یقین تھا کہ وہ منافقین رجعت پسند اور دولت کے ہرے جو پیشہ علیؑ کو اپنے عزائم کی راہ میں سگ گراں سمجھتے رہے ہیں نہ صرف یہ کہ علیؑ کے ساتھ نہیں آئیں گے بلکہ اپنے دل کے پردوں میں شامیوں کی طرف داری کریں گے اس طرح عرب و عجموں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ اسلام کا درد رکھنے والے علیؑ کے ساتھ ہوں گے اور بقیہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہیں گے۔ نتیجہ میں علیؑ کو شکست ہو جائے گی۔ اسلام کے شیرانی مارے جائیں گے اور شامی عیسائی مکہ اور مدینہ میں داخل ہو کر آثار اسلامی کا خاتمہ کر دیں گے۔ شامیوں کی خوش قسمتی کہ اسی زمانہ میں حضرت عائشہ اور ان کے ساتھیوں نے قصاص خون عثمان کا دعویٰ کر دیا جو یہ چیز بھی شامی عیسائی کے لیے مفید مطلب تھی۔ اس لیے کہ قصاص خون عثمان کا نام لے کر وہ ان پر ستار ان دولت کو بھی تحریک اسلامی کے قائد اعظم کا ساتھ دینے سے روک سکتا تھا جو حضرت عثمان کے ہمنوا اور ہوا خواہ تھے چنانچہ مکہ کے بت پرستوں کے سردار ابو سفیان کے بیٹے اور شامی عیسائیوں نے بل کے اس موقع کو اسلام کے مٹا دینے کا بہترین موقع تصور کرتے ہوئے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔

تحریک اسلامی کے قائد اعظم کے سامنے اب مندرجہ ذیل سوالات تھے۔

۱۔ شام کے عیسائی اور وہ بنی امیہ جو بدر احد و خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھا کر صرف تلوار کی طاقت سے مسلمان ہوئے اسلام کو مٹا دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور ایک ایسا لشکر تیار ہو گیا جو اپنے مذہب کا بدلہ لینے کے جذبہ میں آگے بڑھ رہا تھا ایسی حالت میں ان سپاہیوں کی حالت ان سپاہیوں سے مختلف

تھی جو کسی بادشاہت یا دنیوی سلطنت کے لیے لڑتے ہیں مذہب کے لیے لڑنے والا سپاہی جان پر کھیل جانا تو لب جانتا ہے اس لیے اس کا موریل (کردار) اعلیٰ ہوتا ہے اور وہ آخری دم تک لڑتا رہتا ہے۔

۲۔ شامی لشکر نے قصاص خون عثمان کا نعروں لگا کر اپنی جنگ کا اصلی مقصد مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اس کا مقصد اصلی تو تھا اسلام کو ختم کر دینا اور مکہ و مدینہ کو نیست و نابود کر دینا لیکن اگر یہ مقصد اصلی مسلمانوں کے سامنے آجاتا تو سارے مسلمان ظیفہ وقت کی پشت پر جمع ہو جاتے اس لیے اس نے قصاص خون عثمان کا نعروں لگایا تاکہ مسلمان اس دعوے میں رہیں کہ علیؑ اور معاویہ میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور اس حقیقت کو نہ سمجھتے پائیں کہ عجمین کے میدان میں دراصل اسلام اور زخم خوردہ مسیحیت میں جنگ ہو رہی ہے اس سے شامیوں کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا ایک سمت بڑا طبقہ جنگ سے الگ رہا اور اسلام کی حفاظت و صیانت کی ساری ذمہ داری صرف کوفہ اور عراق کے لوگوں پر آگئی۔

۳۔ شامی علیؑ و آل علیؑ کو اپنا حریف قرار دے کر ان مسلمانوں کو بھی اسلام و کفر کے اس سنگین معرکہ سے علیحدہ کر دینے میں کامیاب ہو گئے جو امیر المؤمنینؑ کو عرب شنشاریت کا مخالف جانتے تھے اور اس اعتبار سے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ یہ لوگ اگر یہ سمجھتے کہ شامی عیسائی عربوں کے سیاسی اقتدار اعلیٰ کو چیلنج کر رہا ہے تو اپنی قومی حیثیت کے نتیجہ میں یہ ضرور میدان میں آجاتے لیکن ان کو یہ سمجھا کے چپ کر دیا گیا کہ لڑائی مدینہ والوں یا عربوں کی سلطنت کے خلاف نہیں ہے صرف علیؑ اور آل علیؑ سے ہے جنہ کو یہ لوگ خود بھی اپنی شنشاریت کا مخالف جانتے تھے۔

۴۔ شامی لشکروں کو اگر عربستان میں داخل ہو کر جنگ کرنے کی اجازت دے دی تو

کعبہ اور قبر رسول کو مٹا دینے کا جذبہ شامی عیسائی میں جیز تر ہو جانا اور پھر وہ انتہائی طرف ناک طرفہ پر جنگ کرنا تاکہ اسلام کے ان ماثر حبر کہ کو مٹا کے اپنے کلیساؤں کی پوری سرانی کا بدلہ لے لے۔ بسرین اور طاب کی سرکردگی میں مکہ پر شامی چھاپہ ماروں کا حملہ ان کے اس جذبہ کی پوری نشانی کر رہا ہے اور بعد میں یزیدی فوجوں نے صدر اسلام کے ان شہروں کے ساتھ جو سلوک کیا کعبہ پر جس طرح آتش بازی کی گئی اور مدینہ کی جو بے حرمتی ہوئی وہ شامیوں کے ان عزائم کو واضح کر دینے کے لیے کافی ہیں جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھے۔

مدینہ میں بیٹھ کر شامیوں کا مقابلہ کرنے میں ایک اور قباحت یہ تھی کہ خود مدینہ اور مکہ میں جو مخالفین موجود تھے وہ عین اس وقت جبکہ امیر المومنین "اسلام اور مسیحیت کی یہ فیصلہ کن جنگ لڑ رہے ہوتے مسلمانوں کی بیٹھ میں چھرا گھونپ دینے سے نہیں چرکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مسلمان ہار جاتے، تحریک اسلامی کے سچے علمبردار قتل ہو جاتے مکہ اور مدینہ کے اسلامی آثار خاک و مٹی ہو جاتے اور دنیا سے اسلام کا خاتمہ ہو جاتا۔

بعض باقم حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امیر المومنین نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو دار الحکومت کیوں قرار دیا؟ لیکن اگر وہ ممالک اسلامیہ کے نقشہ پر چند لحاظ کے لیے بھی نظر ڈالیں تو ان کو خود یہ احساس ہو جائے گا کہ امیر المومنین نے دار الحکومت تبدیل کر کے اسلام پر احسان عظیم فرمایا تھا امیر المومنین اگر مدینہ میں موجود رہتے تو شامی لشکر جو کہ اور خیر کے راستوں سے گذرنا مدینہ پر حملہ آور ہو جاتا اور ایسی حالت میں صدر اسلام کو جس چاہی کا سامنا کرنا پڑتا اس کا تصور بھی ہمارے لیے محال ہے شامی عیسائی اپنی منزل کو قریب دیکھ کر جنگیں جانش لڑا دیتے اور لوہرا ان کا طولانی جوش دیکھ کر مکہ اور مدینہ میں جو مخالفین اور

مخالفین موجود تھے وہ بخلوت پر آمادہ ہو جاتے امیر المومنین کا لشکر وہ طرف سے رگڑ کے ختم ہو جاتا اور شامی مدینہ اور مکہ کا اس سے بدتر حشر کرتے جو مسلمہ بن عقبہ کی سرکردگی میں ان کی اس دوسری نسل نے کیا جو واقعی مسلمان ہو چکی تھی یا کم از کم مسلمان کہلاتے ہوئے پلے پھری تھی۔ آپ کا کوفہ کو دار الحکومت قرار دے دینا اور خود شام کی شمال مشرقی سرحدوں پر پہنچ جانا شامیوں کے اس عزم کی راہ میں حائل ہو گیا اور اب شامی مجبور ہو گئے کہ عراق کی سر زمین پر آپ سے جنگ کریں اس طرح ایک طرف تو مخالفین اور قریش کے بٹے ہوئے سرے شامیوں کی کوئی مدد نہیں کر سکے، دوسرے مراکز اسلام دور ہونے کی وجہ سے شامیوں کا جذبہ انتقام جیز تر نہ ہو سکا، تیسرے آپ کو عراق کے سورما و دفاع اسلام کے لیے مل گئے جو مدینہ میں ملنا محال تھے جس کا ثبوت اسی سے مل جاتا ہے کہ جنگ جمل کے لیے مدینہ سے آپ کو دو ہزار سے زیادہ آدمی نہیں ملے تھے مدینہ کے لوگ تھکن کا شکار تھے اور ان کا جذبہ جہاد سرد پڑ چکا تھا، اس لیے وہ ایک لاکھ چالیس ہزار شامی لشکر کو دیکھ کر سوا اس کے کہ گھروں میں بیٹھ رہتے اور مسجد نبویؐ کی پامالی کا نظارہ کرتے رہتے اور کچھ کرنے والے نہیں تھے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں شکست کے علاوہ اور کچھ نتیجہ نہ لکھنا مدینہ والوں کی اس بزدلی کے ثبوت کے لیے مدینہ پر یزیدی لشکر کے حملہ کے واقعات کافی ہیں۔

آپ نے کوفہ کو دار الحکومت قرار دے کر شامیوں کا سارا نقشہ جنگ پلٹ دیا کہ اور مدینہ کو تاراج کر کے شامی کلیساؤں کا انتقام لینے کے خواب دیکھنے والے عراق کے ریگ ڈاروں میں الجھا دیے گئے اور عراقیوں کی مدد سے یلغار اللہ کے معرکہ میں ان کو ایسی ہولناک شکست دی گئی کہ ان کے دلوں سے مکہ اور مدینہ کو تاراج دیکھنے کا خطا پیشہ کے لیے دور ہو گیا شمشیر آزادی کی قوتیں اسرود پڑ گئیں

اور حج و عمر کی جنگ کی جگہ سیاسی جنگ کا آغاز ہو گیا۔ حکم کن مقرر ہوئے دو مہ  
الجنہل میں حکم کن کا تفسیر چلنا رہا اور اس طرح وہ جنگ جو اسلام کو فنا کر دینے کے  
ہذبہ میں شروع ہوئی تھی بے نتیجہ طریقہ پر ختم ہو گئی۔

کوفہ کو دار الحکومت قرار دینے میں جہاں یہ مصلحت تھی کہ شامی  
سیاستیوں کا سیلاب عربستان میں داخل نہ ہو وہیں اس میں یہ مصلحت بھی تھی کہ  
شامیوں سے جنگ کے دور ان میں عراق اور مصر تسلط قائم رہے اور وہاں  
کے غیر مسلم مرکز اسلام میں جنگ و جدل دیکھ کر بخلاؤ تین نہ کریں۔ فرض کیجئے کہ  
اگر امیر المومنین مدینہ میں رہتے اور شامیوں کو تھوک یا خیر میں روک کر جنگ  
کرتے تو ظاہر ہے کہ عربستان اور مصر کے مابین رسل و رسائل کا راستہ منقطع ہو  
جاتا اس لیے مصری باستانی سلطنت اسلامی کے خلاف بغاوت کر کے عربوں کو اپنے  
ملک سے بے دخل کر دیتے۔ انہی جو خلیفہ ثالث کے زمانہ میں بھی بار بار بخلاؤ تیں  
کر چکے تھے اس موقع سے قائمہ اٹھاتے اور ان کی شہ پر عراق میں بھی بغاوت ہو  
جاتی۔ نتیجہ میں اسلامی سلطنت پارہ پارہ ہو جاتی اور دنیا سے اسلام کا نام و نشان  
مٹ جاتا امیر المومنین نے کوفہ کو دار الحکومت بنا کر اسلام کو بھی بچایا۔ اسلام کے  
مقدس آثار کا بھی تحفظ فرمایا اور اسلامی سلطنت کو بھی محفوظ فرمایا جو سیاست  
علویہ کا ایک عظیم انظیر مظاہرہ تھا۔

۶۔ شامیوں کو میدان جنگ میں شکست دے دینا بالوئے خیر ممکن کے لیے آسان  
کام تھا لیکن یہ فتح بھی تلوار کی ہوئی اور اسی طرح عارضی ہوئی جس طرح عربوں کی  
اپہرائی فتح عارضی تھی، شامی پھر کوئی بہانہ تراش کے بغاوت کرتے اور اسلام کو  
مٹانے کے لیے میدان میں آجاتے، ایسی حالت میں ضرورت اس کی تھی کہ  
شامیوں کے قلوب پر فتح حاصل کی جائے، ان کے سامنے اسلام کے حقیقی خدا و خالق

پیش کیے جائیں ان کو تظاہر جائے کہ اسلام وہ نہیں ہے جسے انہوں نے خالد کی  
تلوار یا آل ابو سفیان کے قبیری کروار میں دیکھا ہے بلکہ اسلام ایک اعلیٰ اخلاقی  
اور روحانی نظام ہے جس کی طہر واری رسول اللہ کی اولاد کر رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ  
یہ کام آسان نہیں تھا شامیوں کے دلوں میں بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالنا، مسیحیت  
کا رنگ دور کر کے ان کے دل کے پشیموں میں اسلام کا رنگ بھرتا آل ابو سفیان کی  
عیاریوں کا جال توڑ کے اسلام کی حقانیت کو واضح کرنا اور شامی پستی کو اسلام کا  
طہر واری بنانا اور وہ بھی اس وقت جبکہ نیزے چک رہے ہوں تلوار میں چمک رہی  
ہوں تیر سنسٹار ہے ہوں اور موت کا حضرت سروں پر منڈلا رہا ہو، بڑا وقت طلب  
کام تھا اس کے لیے قیادت کی ملکوئی اور مافوق البشری قوتیں درکار تھیں، یہ کام  
عام انسانی سطح سے بہت بالا تر سطح انسان کا تھا اور اسلام خوش قسمت تھا کہ اسے  
اپنی قیادت کے لیے امیر المومنین کی شکل میں ایسا ہی قائد میر تھا۔ چنانچہ آپ  
نے وہ کیا جو صرف حکمت ربانی کے امین سے ہی ممکن تھا اور دنیائے دیکھا کہ وہی  
فہم جس نے ہمیشہ قریش کے مشوروں کو چند گھنٹوں میں راہ فرار اختیار کرنے پر  
مجبور کر دیا جس نے جہل اور حموان کے معرکے ایک ایک دن میں سر کر لیے جس  
نے باب خیر کی چولیس ہلا کے ہودیوں کا غرور آنا، قانا، خاک میں ملا دیا وہی فہم  
تین چار سال تک شامیوں کے مقابلہ میں خیمہ زن ہے اور فیصلہ کن فتح حاصل  
نہیں کرنا وجہ صاف ظاہر ہے اگر فیصلہ کن ٹکراؤ کر کے شامیوں کو ایک دن میں  
شکست دے دی جاتی (جو امیر المومنین کے لیے مشکل نہیں تھا) یہ فتح تلوار کی  
ہوتی، طلی کی ہوئی، اسلام کی نہ ہوئی۔ اس کے برعکس جنگ کو طویل دیا گیا تاکہ  
شامی اسلام کا علوی روپ دیکھ لیں۔ شامیوں کو معلوم ہو کہ اسلام اس عظیم  
خلاقی اور روحانی تحریک کا نام ہے جس کے منظر اتم خود علی ہیں۔ اسلام خوریز

شہنشاہیت کا نام نہیں ہے ایک برتر نظام زندگی کا نام ہے۔ اسلام کا مقصد نبی امیہ کے شاہزادوں کی عیاشی کے لیے عوام کی دولت لٹانا نہیں ہے بلکہ تقسیم بالسویہ کے ذریعہ ایک عادلانہ معاشی نظام کو وجود میں لانا ہے۔ اسلام وحشی قبیح ذلوں کے مظاہرہ قوت کا نام نہیں ہے بلکہ آل رسول کی تہذیب نفس کا نام ہے۔ امیر المومنین نے فیصلہ کن جنگ نہیں کی، شامی کو تلوار سے زیر نہیں کیا بلکہ آپ نے جنگ کو طول دے کر شامیوں کو اسلامی تحریک کو سمجھنے اور اسلام کے حقیقی خدو خال معلوم کرنے کا موقع دیا اس سیاست کے نتیجے میں امیر المومنین قانع شام تو نہیں کھلائے لیکن شامیوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف جو زہر بھرا ہوا تھا اسے آپ نے کم کر دیا۔ علیؑ بہ حیثیت خلیفہ وقت تو جنگ نہیں جیتے لیکن مسیحیت کے مقابلہ میں اسلام ضرور جیت گیا اور یہی امیر المومنین کا مقصود تھا۔

امیر المومنین نے صرف یہی کامیابی حاصل نہیں کی کہ شامیوں کو خود لوں کی سرحد پر جنگ میں الجھا کے صدر اسلام کے مراکز کو محفوظ رکھا یا جنگ کو طول دے کر شامیوں کے سامنے اسلام کا اصلی روپ پیش کر دیا اور اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف جو نفرت تھی اسے جڑی حد تک دور کر دیا بلکہ جنگ کو طول دے کر ایک اور عجیب و غریب کامیابی حاصل فرمائی جس پر مورخین کی نظریا نکل نہیں جاتی ہے۔ اور وہ کامیابی یہ تھی کہ آپ نے۔

شامیوں کا مقصد جنگ تبدیل کر دیا!

شامی اور ان کے ہم نوا نبی امیہ و دراصل اس لیے میدان میں آئے تھے کہ اسلام کو مٹادیں، امیر معاویہ ہوں یا شامی ان کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ صرف اس لیے لڑ رہے تھے کہ اسلام کی انقلابی تحریک کو مٹانے کے پرانا جاہلی نظام واپس لے لیا جائے۔ یہ مقصد تھا وہ جو دلوں کے پردوں میں مستور تھا، زبانوں سے جو مقصد ظاہر کیا جا

رہا تھا وہ نکل عثمان کا قصاص تھا لیکن جنگ کو طول دیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔

امیر معاویہ نے خلافت کا دعویٰ کر دیا

ہادی النکری میں اسے امیر المومنین کی کامیابی سے تعبیر کرنا بہت عجیب سی بات ہے لیکن جو لوگ سیاست علویہ کے طریق کار اور اس کے مقصد کو سمجھتے ہیں کہ وہ اسے نہ صرف یہ کہ امیر المومنین کی کامیابی قرار دیتے پر مجبور ہیں بلکہ شاید اس امر کا اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہیں کہ یہ امیر المومنین کی درخشندہ حیات طیبہ کی سب سے بڑی کامیابی تھی!

وقت رسولؐ کے بعد امیر المومنین کو مدینہ کے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا وہ رجعت پسند منافقین کے علاوہ باقی سب کے سب مسلمان تھے یہ صحیح ہے کہ ان میں دولت کے شیدائی تھے بعض ستمی فکر رکھنے والے جو پورے تھے، بعض اسلام کے سچے فدائی تھے لیکن تھے سب مسلمان اور اسلام کی شوکت ظاہری مسلمانوں کے فہم و اقتدار اور کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کی حفاظت و ممانعت کے نام پر سب متحد ہو سکتے تھے۔ ان لوگوں سے اسلامی سرحدوں کی حفاظت کا کام لے لینا ان کے ذریعہ مرتدین کی قوت کا خاتمہ کر دینا اور ان کو قیصر کسریٰ کی اسلام دشمن قوتوں کے مقابلہ میں صف آرا کر دینا آسان کام تھا اور محض مسئلہ خلافت پر خاموشی اختیار کر کے ان سے یہ کام لے لیا گیا لیکن نبی امیہ اور شامی عیسائیوں کی اس قوت کو جو اسلام کو مٹانے کے لیے وجود میں آئی تھی اسلام کے اعلان پر مجبور کر دینا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا تھا جسے اللہ نے عقل و حکمت کی ان مافوق البشری منزلوں پر فائز کر دیا ہو جن تک انسان کی رسائی قطعاً محال ہے۔ امیر المومنین نے جنگ کو طول دیا جس کے نتیجے میں حالات نے ایسا پلٹا کھلایا کہ معاویہ خلافت کے مدعی ہو گئے اور ظاہر ہے کہ خلافت اسلامی کا دعویٰ اور خواہ ذاتی حیثیت سے کتنا ہی غلط اور خراب شخص کیوں نہ ہو اسلام اور سلطنت اسلامی کو فنا کر دینے کا

اعلان نہیں کر سکتا، وہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر مجبور ہے۔ اسلام سے ظاہری دلچسپی رکھنے پر مجبور ہے اور دکھاوے کے لیے ہی سہی لیکن ارکان اسلامی کی بجا آوری پر مجبور ہے۔ خلافت کا مطالبہ کر دینے کے بعد امیر معاویہ حضرت علی علیہ السلام کے خلاف تو جنگ جاری رکھ سکتے تھے لیکن اسلام کے خلاف جنگ کرنے ماثر اسلامی کو مٹا دینے، قرآن کو (جس کے وحی ربانی ہونے پر بنی امید کا جتنا ایمان تھا وہ جدیدے سر حسین دیکھنے کے بعد ظاہر کر دیا تھا) فنا کر دینے یا ارکان و عقائد اسلام کو ختم کر دینے کا اعلان ہرگز نہیں کر سکتے تھے، وہ آل رسول پر شام طرزی کا سلسلہ جاری کر کے اپنے دل کے پھپھولے تو پھوڑ سکتے تھے لیکن قبر رسول کو مسمار کر کے بدو احد کی شکست کا بدلہ لینے کی جرات نہیں کر سکتے تھے، وہ خانوادہ رسالت کے حامیوں اور سچے مسلمانوں کو توجیح ستم کا نشانہ بنا سکتے تھے اور اس طرح سرور کائنات کی روح کو تڑپا سکتے تھے لیکن ظاہری طور پر اسلام کو ختم کر کے اپنے آپ کو کفر و کجی کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ وہ "اسلامی خلافت" کے دعویدار تھے اور اس اعتبار سے اپنے آپ کو دنیا کی نگاہوں میں مسلمانوں اور اسلام کا مدد و ثابت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ کو میدانِ صفین میں شکست دے دی جاتی تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ بنی امیہ اور شامی عیسائی پھر مسلمانوں کی تلوار کے سامنے سرگوں ہو جاتے لیکن ان میں تختِ خلافت کی تفریق پیدا ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ:-

۱۔ شامی عیسائیت اور ابوسفیانی دورِ جاہلیت کے دوبارہ ابھرنے یا اسلام سے ٹکر لینے کا امکان ختم ہو گیا۔

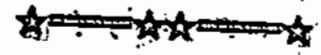
۲۔ شامیوں کو مسیحیت کی جانب لوٹ جانے کے بجائے مسلمان بننے رہنا پڑا اور اس طرح آل رسول کو کچھ عرصہ کے بعد یہ موقع مل گیا کہ وہ قید خانہ شام کی مقلوبانہ تبلیغ کے نتیجہ میں ان کو پیشہ کے لیے اسلام کا حلقہ بگوش بنائیں۔

۳۔ دنیائے اسلام کے اندر اسلام کے لیے جو عظیم خطرہ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کی شکل میں موجود تھا اور جس کے نتیجہ میں عرب کے دورِ جاہلیت کے دوبارہ ظہور میں آ جانے کا امکان تھا اس کا پیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، موکب کا مورچہ سر کرنے والوں نے مارضی طور پر شام کو عربی سلطنت کے لیے فتح کر لیا تھا لیکن شام کو اسلام کے لیے فتح کرنے کا سرا امیر المومنین کے سر ہے اگر آپ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کو صفین میں اسی طرح شکست دے دیتے جس طرح بدر اور خندق میں دے چکے تھے تو دنیا تاریخ کا یہ عجوبہ نہ دیکھتی کہ ابوسفیان کی نسل جو خود دل سے اسلام کی قائل نہیں تھی اسلام کے نام پر کافروں سے لڑتی رہی اسلام کے لیے ممالک فتح کرتی رہی اور شرک و الجلو کے ان مرکزوں کو مٹانے کا کام انجام دیتی رہی جس کی وہ خود اپنے دل کے پردوں میں علمبردار تھی۔

امیر معاویہ کا دعویٰ خلافت خود ان کی شکست تھی۔ اس لیے کہ یہ دعویٰ کر دینے کے بعد ان کو اسلام سے روگردان ہونے کا موقع باقی نہیں رہا اسی طرح ان کے حامی شامی جو اپنے دل کے پردوں میں عیسائی تھے اور مسلمان بننے کے تحریک اسلامی کے قائد کے مقابلہ میں جنگ کر رہے تھے اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے چروں پر اسلام کی نقاب ڈالے رہیں اس طرح بظاہر مسلمانوں اور باطن اسلام دشمنوں کی وہ نسل جو اسلام کو مٹانے کا تہیہ کر کے میدان میں آئی تھی۔ مسلمانوں کے سامنے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے مسلمان بنی رہی اور اس کے بظاہر مسلمان بننے رہنے کے نتیجہ میں ان کی اولاد میں اپنے آپ کو دین کو بھول کر واقعی مسلمان بن گئیں۔ تحریک اسلامی کے قائد کی یہ سمت بڑی کامیابی تھی اس لیے کہ امیر المومنین ہادشاہ نہیں تھے جن کو عسکری فتح کی ضرورت ہوتی آپ دراصل اسلام کے مبلغ اور اس اتنی تحریک کے داعی تھے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا اس لیے آپ کا اصل مقصد لوگوں کو مسلمان بنانا تھا نہ کہ ان



سے اپنی حکومت تسلیم کرنا یعنی کی جنگ عروانی ہو جانے کے نتیجے میں آپ کا مقصد حاصل ہو گیا شاہی مسلمان ہو گئے اور اس طرح سیاست علویہ کے نتیجے میں شام کو پیشہ کے لیے اسلام کا طبقہ گوش بنالیا گیا جو اسلام دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔



### اندرونی اصلاح

حزب اسلامی کے قائد کو جہاں مرتدین کی شورش مخالفین کی ہتکوتوں اور قہروں کی بھاری بھاری عسارت کا سامنا تھا وہیں عربوں کے دلوں میں اسلام کی تعلیمات پر ہی طرح راجح کر رہے اور صدر اسلام کو کہنے والے وہی عسارت سے محفوظ کر رہے کی ذمہ داری بھی اس عظیم المرتبت قائد پر تھی۔ اس کی ذمہ داری نکلانی ہے

۱۔ فتوحات کے نتیجے میں مسلمانوں کا واسطہ غیر اقوام سے پڑے گا۔ اس لئے ان کے تصورات مسلمانوں پر ضرور اثر انداز ہوں گے۔ آپ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ عرب خود ایک جاہل قوم تھے لیکن وہ جن ممالک کو فتح کر رہے تھے وہ علم اور فلسفہ کا خون تھے۔ ایران، شام اور مصر قدیم تعلیم کے گوارے تھے اور ان ممالک میں داخلہ کے بعد مسلمان ان ممالک کے علوم اور ان کے تصورات سے غیر متاثر نہیں رہ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں یہ قہمی تھا کہ ایران جانے والے مسلمان مہزرت کاہنوں اور نوظلم طوبیت کا شکار ہوں گے اور شام کی امریزوں اور یوں میں گنہگار بننے والے یہودیوں سے ملنے اور شامی فلسفہ کے بہانے ہر مہیبو ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عربوں کے عقائد متاثر ہوں گے۔ ان کا دین مٹا ہو جائے گا۔ اسلام کی نئی نئی تعبیرات وجود میں آئیں گی اور مسلمان پیمانوں کے سے بلند اور مضبوط عقائد رکھنے کی بجائے عجمی و یونانی فلسفہ کے شکار بنائیں گے۔ لیکن وہی قوم بن جائیں گے۔

۲۔ غیر لکھوں سے احتیاط کا نتیجہ یہ ہو گا کہ عربی زبان اپنی سابقہ خصوصیات کو

دے گی۔ اس میں زبردست تبدیلیاں ہو جائیں گی اور وہ زبان جس میں قرآن اترتا تھا عربوں کے لئے غریب ہو جائے گی۔ جس کے نتیجے میں آجپھر لہلوں کو قرآن سمجھنا مشکل ہو جائے گا۔

۳۔ جنگوں کے نتیجے میں احادیث اور مسائل فقہ کے جانے والے بیسیکڑوں صحابہ کمل ہوئے ہمارے ہاتھ تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ ابن علی جو اہل ہارون کو مضبوط نہ کر لیا گیا تو حدیث اور فقہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ جہاں ایک طرف راویان حدیث کو اوروں کی چھٹائیوں میں موت ہے ہکتا ہوتے چارے تھے وہیں دوسری طرف فرماؤ ایمان وقت اس پر مصر تھے کہ حدیث کی کتابت نہ ہونے دی جائے۔ روایت حدیث پر لوگوں کو سزائیں دی جاتی تھیں اور جو لوگ احادیث کو لکھتے تھے ان کے جمع کرنا بھیجنے جلائے جانے تھے۔ حکمران جماعت کا قول تھا کہ علم کو کتابوں میں قید کرنا حرام ہے اور اس عمل تصور کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلامی علوم فنا ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

۴۔ حکومت وقت کی جانب سے شرعی علوم تہذیب نفس یا تبلیغ احکام کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ عوام کو اسلام کے عظیم اخلاقی اور روحانی ورثے سے ملائیل کرنے کی کوئی سعی نہیں کی جاری تھی اور اندیشہ یہ تھا کہ دولت کی فراوانی مسلمان عسرت کی کفرت اور علم سے حق راہی عربوں کے انقطاع اور لوہاروں کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے کی گنتا۔

۵۔ حکمران طبقہ قرآن میں نکتہ عقل کا بھی حاشی نہیں تھا اور بعض حضرات ایسے بھی تھے جو تویل و تفسیر کو حرام جانتے تھے۔ اس کا انجام یہی ہو سکتا تھا کہ خدا کی ہستی تک کا وجود ہی کرنا جائے اور مسلمانوں میں ایسے عمل عقائد پیدا ہو جائیں جن پر اللہ

ہزاروں کلمت پر عملی

حکمران طبقہ کو اس درجہ جاہل رکھنے پر علاوہ تھا کہ تقریباً ایک صدی کے بعد عبدالملک بن مروان کو یہ تازہ نئی جملہ کتاب پڑا کہ "میں نے صدیوں حکومت کی لیکن ان کو کبھی عربوں کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی اور عرب ایک صدی بھی حکومت کا دربار نہیں کی مدد کے بغیر نہ چلا سکے۔" سلطنت اسلامی پر مجیوں کے اس بے پناہ اثر و نفوذ کی وجہ صرف یہی تھی کہ حکمران طبقہ کو فتوحات کی تو فکر تھی لیکن شرطوط پر اس کی کوئی توجہ نہیں تھی۔ آگے چل کر اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب تلوار کی جنگ توجیت گئے لیکن علم تہذیب اور فلسفہ کی جنگ اس بری طرح ہارے کہ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور سلطنت میں مسلمانوں میں نت نئے مذہب وجود میں آگئے اور عجمی و یونانی فلسفوں نے مسلمانوں کے عقائد تک تاراج کر دیے۔

تحریک اسلامی کا قائد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسند روحانی کا وارث اسلام کے ان داخلی تقویوں سے چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا وہ اسے ہرگز پروا نہ تھی کہ مسلمانوں کو اسلام کے عظیم اخلاقی اور روحانی ورثے سے ملائیل کرنے کی کوئی سعی نہیں کی جاری تھی اور اندیشہ یہ تھا کہ دولت کی فراوانی مسلمان عسرت کی کفرت اور علم سے حق راہی عربوں کے انقطاع اور لوہاروں کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے کی گنتا۔

۶۔ اس وقت تک اپنے دوش پر عہا نہیں ڈالوں گا جب تک کہ قرآن مجید نہ کر لوں۔

یہ وہ وقت تھا جب حضرت ابو بکر اور حضرت زید بن ثابت کے سے حضرت تدوین و کتابت قرآن کے متعلق یہ رائے فرما رہے تھے کہ نہ۔

۷۔ ہم وہ کام (تدوین و کتابت قرآن) کیسے کر سکتے ہیں جسے نبی کریم نے بھی اپنی زندگی میں انجام نہیں دیا۔

اس زمانہ میں جبکہ مسلمانوں کا بڑا سراسر انداز طبقہ تدوین و کتابت قرآن کی بھی

حکومت کر رہا تھا۔ امیر المؤمنین نے نہ صرف یہ کہ قرآن مجید کو ترتیب حزل کے مطابق جمع فرمایا بلکہ اس کے ساتھ ہی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تفسیری اور شواہد بھی حاشیہ پر جمع فرما دیئے تاکہ آنے والی نسلیوں میں ہم قرآن کے حقائق اختلافات پیدا نہ ہوں اور ع

احکام قرآن میں مگر ان کے مفسر تفسیر سے قرآن کو بنا دیتے ہیں یا وہ کی نوبت نہ آئے پائے لیکن ملت اسلامیہ کی بد قسمتی کہ قرآن حکیم کا یہ ثور لٹھ دنیا کے سامنے پیش نہیں ہو سکا اور تفسیر رسالت کم ہو جانے کے نتیجے میں مسلمان ہم قرآن کے سلسلہ میں ان اختلافات کا شکار ہو گئے جن سے تحریک اسلامی کا کام لینا کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

قرآن پاک کے سلسلہ میں آپ کی دو سری عظیم خدمت یہ تھی کہ آپ نے علم نحو کے اصول مرتب فرمائے اور اپنے شاگرد ابوالاسود دہلی کو ان اصولوں کے مطابق کتاب مرتب کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اس طرح آپ نے عربی زبان اور اس کے قواعد کو جو غیر لکھیوں سے اختلافات کے نتیجے میں برباد ہو سکتی تھی محفوظ فرمایا۔ ابوالاسود نے آپ کی اسی خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

”آپ نے ہم عربوں کو زندہ کر دیا اور ہماری زبان کو چھانے دوام عطا کر دی۔“  
قرآن پاک پر لفظی اور اعراب لگانے کی سعادت بھی ابوالاسود دہلی کو حاصل ہے۔

اجائے مطارف اسلامیہ کے سلسلہ میں آپ کی دو سری عظیم خدمت یہ تھی کہ آپ نے احادیث کا ایک صحیفہ مرتب فرمایا تھا جس میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ تمام احادیث جمع کر دی تھیں جن کی امت کو ضرورت تھی۔ یہ صحیفہ حدیث

یعنی پوست آہو پر تھری کیا گیا تھا۔ اللہ سوس ہے کہ یہ طبعی مجموعہ بھی ہماری نگاہوں سے لوجھل ہے ورنہ شاید حدیث ساری کے نتیجے میں مسلمانوں کو جو روزِ رستا کا پڑا اس سے وہ محفوظ رہتے۔

اس زمانہ میں جبکہ غلبہ وقت تدوین حدیث پر لوگوں کو مڑا نہیں دے رہا تھا اور جلیل القدر صحابہ نماز انہوں کے طرف سے سرایہ حدیث کو دولوں میں محفوظ رکھنے پر مجبور تھے یہ تحریک اسلامی کے قائد اعظم ہی کاہل جگر تھا کہ اس نے حدیث کے اس گراں قدر سرمایے کو کتبلی شکل دے دی جو بعد میں آئمہ آل رسول کے ذریعہ امت تک پہنچا رہا۔ اسلامیات کا وہ ثور روزگار خزانہ تھے علم فقہ سے موسوم کیا جاتا ہے امیر المؤمنین ہی کی کلاشوں کا ٹھکانا ہے چنانچہ شیعہ مولانا سنی دولوں کا سرمایہ فقہ جن حضرت کے ذریعہ فراہم ہوا ہے وہ امیر المؤمنین ہی کے خرمن علم کے خوشہ چمن تھے۔

اسلامی علم کلام کے موجد بھی امیر المؤمنین ہی ہیں چنانچہ بیخ لیل اللہ کے نام سے آج بھی اس حکیم ربانی کے ان منکرانہ اثر شواہد کا ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ زالیات جبروت قدر متعذر تخلیق انسانی، معاش و مخلوق تھا و قدر اور اسی قسم کے دوسرے شکیلوں مسائل علیہ میں اسلام کے نقطہ نظری صحیح ترین ترجمانی کرنا ہے۔ ابن ابی الحدید معتزلی نے اس مسئلہ پر پوری تعمیل سے بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ اسلام کے تمام نظریاتی حقائق و مضامین کے بانی ہیں امیر المؤمنین ہی کے کتب اللہ کے پروردگار اور فلسفہ و بحث کے سلسلہ میں آپ ہی کے خرمن علم کے خوشہ چمن ہیں۔

زمانہ قبل اسلام میں عربی شاعری کو کافی ترویج حاصل ہو چکا تھا لیکن شہر عربوں کی توجہ بالکل نہیں تھی، حالانکہ علامہ فون کی تدوین شہری کے سارے ہوا کرتی ہے۔ عربوں میں فصاحت و بلاغت کا سارا مظاہرہ علم ابن عربی تھا۔ ثقافت شکر بیولٹی کی دلیل تصور کی جاتی تھی۔ عربی شہری کی کلی شکل و کرا کتاب قرآن پاک ہے جس نے عربوں کو شہرہ

شاعری کے مقابلہ میں شریکِ قوت و صلاحیت سے آشنا کیا لیکن قرآن بہر حال کتاب الہی تھا۔ اس لئے عربوں کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ نثر میں عام انسان بھی اپنی صلاحیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے مکاتیب، خطبات، توحیدات اور فرامین کے ذریعہ عربوں کو شریکِ قدر و قیمت سے آگاہ کیا اور اس طرح عربی زبان کو جو محض شعر و شاعری تک محدود تھی ایک علمی زبان بننے میں مدد دی۔ آپ نے صرف یہ نہیں کیا کہ عربی نثر کو توجہ فرما کر خود چند علمی چیزیں تحریر فرمادیں بلکہ اپنے اصحاب اور شاگردوں کو توجہ دلائی کہ وہ عربی زبان میں کتابیں تصنیف فرمائیں۔ چنانچہ آپ کے زیر اثر دینائے اسلام میں مصنفین کی ایک اچھی خاصی جماعت تیار ہو گئی اور عربی زبان ایک علمی تحریک کا مرکز بن گئی۔ کج یہ عرض کرنا مناسب نہیں ہے کہ عربی زبان میں علوم و معارف کا جتنا بھی خزانہ موجود ہے وہ طفیل ہے امیر المومنین کا اس لئے کہ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جس نے عربوں کی توجہ شاعری سے ہٹا کر نثر پر مبذول فرمائیں۔ خود متعدد جہوں تصنیف فرمائیں اور عربوں میں تصنیف و تالیف کا لوق بیدار کر کے اپنے شاگردوں سے کرائیں لکھوائیں۔ اس طرح عربی زبان میں علمی تصانیف کا آغاز آپ ہی کا ارتقا ہے اور یہ آپ ہی کی دکھائی ہوئی راہ کا نتیجہ ہے کہ کج عربی زبان علوم و معارف کی خزینہ قرار نظر آتی ہے۔

ایک طرف وہ مسلمان تھے جو فتوحاتِ کل میں مصروف تھے اور زبان نے سمیٹ رہے تھے۔ سبیلِ قیمت بن رہے تھے اور تحریکِ اسلامی کو قسطاً فراموش کر چکے تھے اور دوسری طرف امیر المومنین تھے جو سچے ہونے کو نثر علم اور تبلیغِ اخلاق کا گوارا بنائے ہوئے تھے۔ آپ پابندیِ سب سے سب سے تہذیبی اور انسانی اخلاقیات، تفسیر، عقائد اور لغت وغیرہ پر تقریریں فرماتے رہتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کو ان کا وہ علم ہوا جسے یاد دلاتے رہتے تھے جسے وہ دولت اور صلاحیت کی ذمہ داری میں فراموش کر چکے تھے۔

ایک طرف شیطان تھا جو مسلمانوں کو دولت و مملکت کا فریب دے کر دولت ایمان لوٹ لینے پر ملامت اور دوسری طرف تحریکِ اسلامی کا کام تھا جو علم و معرفت کی نور آئیں، شعیں روشن کئے عربوں کو اس عظیم روحانی اور اخلاقی تعلیم کی جانب دعوت دے رہا تھا جو مزور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو دی تھی۔ شیطان دولت کی دیواریں کھڑی کر کے جمل کی غلٹ عام کرنا چاہتا تھا۔ علیؑ علم کا نور پھیلا کے ایمان و معرفت کی دولت لٹا رہے تھے۔ شیطان اپنی مہم میں ہار کر علیؑ جیتے اسلامی علوم باقی رہ گئے اور حق کو وہ فتح مبین حاصل ہوئی جس کے اثرات کج تک دنیا کے گوشہ گوشہ میں نظر آ رہے ہیں۔

نثر علم و تزکیہ اخلاق امیر المومنین کے نزدیک اتنی اہمیت کے مالک تھے کہ اپنی مہلکت ظاہری کے زمانہ میں بھی جب آپ کو حمل، زچہ اور مہمان کے معرکے درپیش تھے آپ روزانہ مسجد میں صبح کے وقت درس اور موعظہ ضرور فرماتے تھے اور مسلمانوں کو ان کے اندر علمی، اخلاقی اور روحانی تقاضا سے باخبر رکھتے تھے جن کا انجام ہی اسلام کا عطا و مخصوص تھا۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایسا ہی خلافتوں کے دور میں مسلمانوں میں جو بھی علمی نگاہیں ظہور پائی، ان میں وہ امیر المومنین کی مہم و مہمت، تخیل اور علوم اسلامیہ کی اشرا و شرافت کا کام تھا۔ آپ نے انہیں یہ اس طرح بتائے اور دعویٰ اصلاح کا کام جو بڑھتی ہی امام وقت اور بہ حیثیت جانشینانِ رسول آپ ہی کا فریضہ تھا۔ پوری طرح انجام دیا اور مسلمانوں کو اسلام کی باطنی ضرورتیں بتائی۔ ہر کام رکھنا جسے جمل کی حالت میں اور دولت کی فراوانی ان کی نگاہوں سے لو جھکن کر دینے پر تلی ہوئی تھی۔

انہوں نے اصلاح کا کام تبلیغ و ہدایت سے ہی انجام پایا سکتا تھا اور ان کی صلاحیت امیر المومنین کے برابر کسی میں نہیں تھی۔ آپ امت کے مخرجِ حلیہ اور زعم الخیر

مقرر تھے۔ آپ کے خطبات آج بھی مٹون شکل میں موجود ہیں اور ان سے آپ کی تبلیغی صلاحیتوں کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ اسلام پر یونانی اور عجمی فلسفہ کے زبردست اثرات مرتب ہوئے، ان غیر اسلامی افکار کے نتیجے میں مسلمانوں میں حدود فراتر و حدود میں آئے جن میں سے مشرب فتنم ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کے عقائد میں بھی ان عجمی و یونانی افکار کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ مسلمانوں کے عقائد میں کی تعابیر ان کے علوم اور ان کی تصانیف میں ان افکار باطلہ کا بڑا ذخیرہ شامل ہے۔

عہد حاضر کے مفکرین اسلام بھی اس حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس بے پروائی اور علم کی جانب سے اس چشم پوشی کا جو دور فتوحات میں برتی جا رہی تھی مسلمان ملک توجہ کرتے رہے لیکن ان کی سطح ذہنی میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، ان کا علمی و تمدنی معیار بلند کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور ان علوم اسلامیہ کو مدون و منضبط کرنے پر کوئی توجہ نہیں کی گئی جو عجمی و یونانی افکار کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ نتیجے میں مسلمان ذہنی حیثیت سے پیچھے رہ گئے اور مغتوحہ علاقوں کے جاہلی و غیر اسلامی افکار کا شکار ہو گئے۔ امیر المومنین کی دور رس نگاہیں یہ متاثر دیکھ رہی تھیں چنانچہ آپ نے اس دور میں جسے آپ کی سیاسی خاموشی کا دور کہا جاتا ہے مغارب اسلامی کی اشاعت کا دور قرار دیا اور آپ کی اسی کاوش علمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایل رسول سے علم دین کی تعلیم حاصل کرنے والے پیشہ غیر اسلامی افکار اور تصورات کے اثر سے آزاد رہتے چنانچہ آج ہم پورے فخر کے ساتھ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں صرف فرقہ شیعہ اثنا عشری ہی وہ فرقہ ہے جس کے عقائد و افکار پر کسی غیر اسلامی افکار کا اثر غالب نہیں ہوا اور یہ فرقہ ہی ہے اسلام کے پاکیزہ اور اصلی روپ پر قائم رہا جو سرور کائنات نے دنیا کے سامنے پیش فرمایا تھا۔

## سیاسی خلفشار

مدینہ اسلامی دنیا کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا اور اسلامی تاریخ میں اس شہر کی اہمیت ناقابل انکار تھی۔ اسلامی سلطنت کے دار الخلافہ ہونے کے علاوہ یہی وہ شہر تھا جہاں کے لوگوں نے لیلین رسالت سے تعلیم اسلام حاصل کی تھی۔ یہی وہ شہر تھا جو حدیث اور فقہ کا مرکز تھا۔ اسی شہر میں قرآن پاک کے وہ احکام نازل ہوئے تھے جن پر شریعت اسلامیہ کا انحصار تھا اسی لئے یہ ضروری تھا کہ اس شہر اور اس کے رہنے والوں کی پوری حفاظت کی جاتی اور اسے تحریک اسلامی کا سب سے بڑا مرکز بلکہ اس کا گوارا ملتی رکھا جاتا لیکن پتھر اسلام کی آنکھ بند ہوتے ہی حکومت کے سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑی قریش نے سرکار رسالت سے اپنی قرابت کا فائدہ لے کر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ انصار پس پشت ڈال دئے گئے اور مسجدین عہد نے ہی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو وہ کسی بیچین کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار گئے۔ تاریخ اسلام میں یہ پہلے و عہد رسالت تھے جن کو موت کا شکار ہونا پڑا۔ اس سے انصار پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے اسلامی سلطنت کے دعوے سے صحت بردار ہو گئے۔ لیکن انصار کی یہ دوش راضی خوشی کا سودا نہیں تھی بلکہ یہ نتیجہ تھا اس سیاسی شکست کا جو ان کو قریش کے ہاتھوں اٹھانا پڑی تھی اور جس کے نتیجے میں ان کو حکومت کے ساتھ ہی مسجدین عہد کی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ انصار پر عمل بدولی طاری ہو جاتا اور ان کا اسلامی سیاست سے کنارہ کش ہو جاتا مدینہ کی زندگی پر کوئی اچھا اثر مرتب نہیں کر سکتا تھا اس لئے کہ مدینہ کی اکثریت بہر حال انصار پر مشتمل تھی اور اس اکثریت کا اسلامی دنیا

کے تمام مسائل سے بے تعلق ہو جانا جو خراب اثرات پیدا کر سکتا تھا وہ سیاسی بصیرت رکھنے والے کسی فرد سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ پھر انصار نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ مال قیمت کی تقسیم میں نیز بیت المال سے تقسیم ہونے والے اموال میں بھی ان سے امتیازی سلوک برتا جاتا ہے چنانچہ خلیفہ دوم نے مہاجرین قریش کا عقیدہ انصار سے زیادہ مقرر فرمایا تھا۔ ان سب واقعات نے انصار کو حد درجہ بددل کر دیا اور وہ طبقہ جس نے پیغمبر اسلام کو ان کی روحانی تحریک کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ مدد دی تھی۔ سیاسی اور علمی دونوں میں ایک عضو مفلوج نظر آنے لگا۔ بظاہر یہ معمولی سی بات تھی لیکن بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدینہ کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور اقتدار حکومت مہاجرین قریش کے ہاتھوں سے نکل کر اسلام کے دشمن بنی امیہ کے ہاتھوں میں منتقل ہو گیا۔ وہ مہاجرین قریش جو دنیائے اسلام کے تاج بخش بنے ہوئے تھے دولت اور حکومت کے باب میں کتنے ہی آگے کیوں نہ تھے لیکن وہی جوش اور مذہبی جذبہ میں انصار سے بہت کم تھے جس کا ثبوت خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے عزائم و سرگت سے مل سکتا ہے جن میں اپنی جانیں دے کر اسلام کو کامران و منصور کرنے کا سراپا پیشہ انصار کے سر رہا اور مہاجرین نے بار بار فرار کے ایسے درونگ مظاہرے پیش کیے جن پر آج تک ہمارا سر زبانت سے جھک جاتا ہے۔ پھر بنی امیہ ان کے رشتہ دار تھے اس لئے اگر اسلامی حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں جاری تھی تو ان کو اس ہولناک سیاسی و مذہبی تبدیلی کی مخالفت کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ انصار البتہ اس صورت حال کی مخالفت کر سکتے تھے۔ وہ بدر و احد و خندق وغیرہ میں بنی امیہ کے مقابلہ میں تلوار کھینچ چکے تھے اور اس گروہ کی اسلام دشمنی کا خوب تجربہ رکھتے تھے ایسی حالت میں وہ مدینہ کی سیاسی اور علمی حیثیت کو بچانے کے لئے میدان میں ضرور آسکتے تھے لیکن ان کو چلا جا چکا تھا۔ مفلوج بنایا جا چکا تھا۔ اسلامی مسائل سے بے دخل کیا جا چکا تھا۔ چنانچہ وہ بھی

چھپ رہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا مرکز مدینہ سے دمشق منتقل ہوا اور وہاں سے بغداد منتقل ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام کے جاننے والے مدینہ میں تھے لیکن ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ کسمپرسی کا شکار ہو گئے اور اسلام ان عقائد و افکار کا نام بن گیا جو دمشق اور بغداد کے حکمرانوں کو پسند تھے۔ ان حکمرانوں کی مصلحت ہوئی تو مسلمانوں نے مسئلہ جبر و قدر کو مان لیا اور ان کی خواہش ہوئی تو خلق قرآن کا عقیدہ راجح کر دیا گیا۔ غرض اسلام مدینہ سے نکل کر سلاطین کا کھلونا بن گیا۔ لسان رسالت سے تعلیم پانے والے افراد مدینہ کا چونکہ عوام پر کوئی اثر نہیں رہا تھا اس لئے دمشق اور بغداد سے اشقی ہوئی ہر صدائیں دین مان لی گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام بعد میں یونانی و عجمی فلسفہ اور اسرائیلی غزوات کا نام بن گیا۔ یہ نتیجہ تھا سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ حکومت کا۔ انصار کے پس پشت ڈال دیئے جانے کا اور اسلامی سیاست پر ان مہاجرین قریش کے حاوی ہو جانے کا جو سیاسی جھڑپوں میں باکمال سی لیکن اپنی بزدلی حکومت پرستی اور زرطلی کے لحاظ سے ہرگز اس قابل نہیں تھے کہ اسلام کی حثان اقتدار ان کے ہاتھوں میں سونپ دی جائے۔ سعد بن عبادہ کے "جن کے ہاتھوں قتل ہونے سے انصار کی کمر تو ضرور ٹوٹ گئی لیکن دنیائے اسلام میں سیاسی خونریزیوں (Political Murders) کا دروازہ بھی کھل گیا۔ چنانچہ قریش نے جو بویا تھا وہی کاٹا اور چند ہی سال کے اندر قریش کے دوست یعنی حضرت عمر اور حضرت عثمان تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے اور ایک ایسی قبیح رسم کا آغاز ہو گیا جس کے نتیجہ میں اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ قتل و خون کی ایک بھیاں تک داستان بن گئی۔ رسول اللہ کے انتقال کے بعد دنیائے اسلام کی نئی سیاست کا یہ پہلا رخ تھا جو امیر المومنین کے سامنے آیا لیکن ابھی بہت سی سیاسی کونٹیں باقی تھیں اور امیر المومنین ان سب کا ایک ساتھ تدارک کرنا چاہتے تھے چنانچہ سقیفہ بنی ساعدہ کے

فیصلہ پر احتجاج کر لینے کے بعد آپ خاموش ہو گئے اور ان حالات کا مطالعہ کرنے لگے۔  
اس فیصلہ خلافت کے نتیجہ میں دینائے اسلام میں پیدا ہونے والے تھے۔

## جمہوری فیصلہ

مگر اردو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی پھر بھی مابعدہ میں  
انصار کے فیصلے بنی لوں اور بنی خزرج اس جھگڑے میں ہوتے کہ آئینہ بکرن کا فیصلہ  
کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقریر و گفتگو میں جوڑ کر انصار کا اس طرح  
خاموشی سے رہنے سے اہل جانا اور دوسرے مسلمانوں کو خیر کے بغیر حکمت اسلام کے  
مستقبل کا فیصلہ کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ انصار کو مجاہدین پر کوئی اہمیت نہیں تھا اور ان  
کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر حکومت مجاہدین کے ہاتھوں میں آگئی تو ان سے انصاف نہیں برتا  
جائے گا۔ انصار یہ جانتے تھے کہ اسلام کو جو کچھ عروج حاصل ہے وہ ان کی جانفشانیوں کا  
نتیجہ ہے۔ انہوں نے اسلام کے لئے زبردست قربانیاں دی تھیں۔ مجاہدین کو نہ صرف  
یہ کہ پناہ دی تھی بلکہ برسوں ان کے اذوقہ تک کا بندوبست کیا تھا۔ خود بھوکے رہ کر  
قریش کو پالا تھا لیکن وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مجاہدین کا یہ طبقہ کھانا خود غرض اور مطلب  
پرست ہے۔ اس کے دل میں انصار کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ اسلام قبول کر لینے  
کے باوجود اپنی قبائلی حیثیت میں اتنا فرق ہے کہ انصار سے مساواتہ سلوک کرنے پر تیار  
نہیں ہے۔ وہ میدان جہاد سے تو گریز پائی اختیار کرتا ہے لیکن حال ہیبت کی تحسیم کے  
وقت ان موجود ہوتا ہے۔ اسے اسلام سے زیادہ ہونا قبائلی اقتدار ہے اور وہ ہر  
موقع پر یہ چاہتا ہے کہ جو توڑے کام لے کر دینائے اسلام کی قیادت اور حکومت اپنے  
ہاتھوں میں رکھے۔ وہ حصول اقتدار کی ہمیشہ میں پھیر اسلام کی مخالفت کرنے سے بھی  
میں چھوٹا ہے اور نئی کو قدم قدم پر ذہنی لگتے ہیں جیسا کرتا رہتا ہے اس نے میدان

خدیجہ کا اتنی فیصلہ بھی قبول نہیں کیا ہے اور اس حکومت پر قبضہ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہے جس کی تعمیر و تکمیل میں اس کا ہمت ہی کم حصہ ہے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ انصار کے دل مہاجرین کی جانب سے صاف نہیں تھے اور وہ قریش پر کوئی اہتمام کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں ان کا اجتماع ان کے اسی جذبہ کی پوری عکاسی کرتا ہے۔

انصاری کی پہلی بد قسمتی تو یہ ظاہر ہوئی کہ ان کے اس اجتماع کی خبر حضرت عمر کو ہو گئی اور وہ حضرت ابو بکر کو ساتھ لے کر سقیفہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ابو سعید خدری جرح لے گئے تو ان کو بھی ساتھ لے لیا گیا۔ چنانچہ قریش کے طرف میں عین گوی تھے جو سقیفہ پہنچے اور انہوں نے جتنی ہی انصاری کی بازی الٹ دینے کا بندوبست کر سکا۔ انصاری کی دو بہری بد قسمتی یہ تھی کہ ان میں خود بھی اتحاد نہیں تھا۔ بنی خزرج نے سعد بن عبادہ کو خلافت کے لئے باوجود کیا تھا اور بنی اوس کے ذوالوں میں اس تجویز سے حسد کی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر نے اس صورت حال سے بڑا کامیاب اٹھایا۔ بنی اوس کو خوب بھڑکایا گیا اور پھر یہ دلیل پیش کر کے کہ:

”حکومت رسول اللہ کی تھی اس لئے اس کے وارث ان کے اعزہ ہی ہوسکتے

ہیں۔“

سعد بن عبادہ کے حق حکمرانی سے انکار کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ حضرت عمر نے سعد بن عبادہ پر تلوار کا وار بھی کر دیا جس سے حاضرین پر سناٹا پھٹا گیا۔ بنی خزرج قسم لگے انصار و ہشت روزہ ہو گئے اور جب لوہے کی پتھری گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

”وراثت“

کا سوال اٹھا کہ حضرت عمر نے حضرت ابو بکر کی بیعت کرنے کی اوس کو چھوڑنا ہی خیر ہے

کے اقتدار کے خلاف شدید حسد پیدا کر لیا جا چکا تھا اس لئے انہوں نے بھی ”وراثت“ کے اصول کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے حضرت ابو بکر کی بیعت کرنی اور اس طرح سقیفہ کا وہ مایہ ناز الیکشن ختم ہو گیا جس کی اساس پر آج اسلام کو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری مذہب قرار دیا جاتا ہے۔

اس الیکشن کے سلسلہ میں جو امور خاص طور پر قابل لحاظ ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱۔ جس وقت یہ الیکشن ہوا اس وقت حجاز، یمن، بحرین، عمان، حضرموت، خیبر اور تیوک و غیرہ کے سارے علاقے مسلمان ہو چکے تھے، سیکڑوں قبائل دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ان میں سے سقیفہ بنی ساعدہ میں مدینہ کے صرف دو انصاری قبائل کے چند افراد اور تین قریش حاضر تھے جن کی حاضری میں خلیفہ کا تقرر عمل میں آیا۔ ایسی حالت میں اسے دینائے اسلام کا انتخاب ”قرار دینا قطعاً“ مہمل سی بات ہے۔

۲۔ ان چند حاضرین میں سے بھی جن پر اس الیکشن کا مدار رکھا جاتا ہے بنی خزرج اس انتخاب کے مخالف تھے۔

۳۔ مخالف امیدوار پر تلوار چلا کے حاضرین کو دہشت زدہ کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں اسے آزادانہ انتخاب کرنا غلط ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے اس دہشت زدگی کا جو حق آزادی کے ذریعہ پیدا کر دی گئی تھی۔

۴۔ اسلام کے دو قبیلوں میں پھوٹ ڈال دینی گئی اور اس طرح سازش کی مدد سے کام نکالا گیا جو ایک اچھے انتخاب کی شان نہیں ہو سکتی۔

۵۔ دلیل یہ تراشی گئی کہ حکومت رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم کی املاک تھی اس لئے ان کے ورثاء کو ملنا چاہیے اور ”وراثت“ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اولاد کے بجائے



خسر کو وارث ہونا چاہیے۔

۶۔ اس دلیل کا مقصد یہ ہوا کہ رسولؐ کے گھرانے کے علاوہ اسلامی دنیا پر کبھی کوئی دوسرا شخص حکمران نہیں ہو سکتا۔ ہمیں سے اس جمہوریت کا خاتمہ کروایا گیا جس پر مسلمان بڑا ناز کرتے ہیں اس لئے کہ حق حکمرانی جمہور اسلام کو نہیں دیا گیا بلکہ صرف قبیلہ قریش کو عطا کر دیا گیا۔

۷۔ مدینہ کے علاوہ اسلامی دنیا کے کسی حصہ کے افراد کو الیکشن میں حصہ لینے کا حق عطا نہیں کیا گیا۔ گویا ووٹ کا حق بھی صرف مدینہ تک محدود کر دیا گیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ سے واپسی پر مدینہ والوں کے سامنے اس ”جمہوری فیصلہ“ کا اعلان کر دیا گیا اور ان کی بیعت کی دعوت دی گئی۔

مجاہدین نے اس لئے بیعت کر لی کہ وہ ابھی ابھی انصار کے افتراق باہمی کا نتیجہ دیکھ چکے تھے اور یہ جانتے تھے کہ اگر ان میں ذرا بھی پھوٹ پڑی تو حکومت انصار کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ پھر حکومت انہیں کے ایک فرد کے ہاتھوں میں آئی تھی اور یہ شخص ایسا تھا کہ جو قریش کے اجتماعی مفادات کی تکمیل میں پوری طرح معاون ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں مجاہدین کی جانب سے کسی اختلاف کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا۔

انصار میں بنی اوس نے تو بنی خزرج کے حسد میں بیعت کر لی تھی نہ مگھے تھے بنی خزرج تو ان کو مظاہرہ شمشیر سے حضرت عمرؓ نے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اس لئے اب ان کی جانب سے بھی مخالفت کا امکان نہیں تھا۔ سعد بن عبادہ نے الہتہ بیعت سے انکار کیا تو ان کو کسی نامعلوم ”جن“ نے قتل کر دیا اس طرح راہ گاہ کا ناکہ بھی دور ہو گیا۔

امیر المومنینؓ کے لئے یہ وقت نہایت نازک تھا اس لئے کہ امت ایک قطبہ فیصلہ کا درکاب کر رہی تھی اور کی دور رس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ اس فیصلہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بڑے روزہد کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ یہ سمجھ رہے کہ نہ۔

۱۔ اگر آج امت کے چند افراد کو حق حاصل ہو گیا کہ وہ خلافت کے سے اہم دینی امر کا فیصلہ خود اپنی رائے کر لے تو کل افراد امت کو یہ بھی حق حاصل ہو گا کہ وہ قرآن کی جو چاہیں تفسیر کر نقد میں جو چاہیں مسائل وضع کر لیں، شریعت کو جس طرف چاہیں موڑ دیں، عقائد میں جو چاہیں ترمیمات کر دیں، عبادت میں جو چاہیں انداز اختیار کر لیں۔ غرض یہ کہ دین کا وہ سارا ضابطہ جو سرکارِ دو عالم نے مقرر فرمایا تھا افراد امت کی مرضی کا شکار ہو جائے گا اور ملت اسلامیہ میکیزوں فرقول میں بٹ جائے گی۔

۲۔ اگر آج مدینہ کے چند آدمی جوڑ توڑ، سازش، نوردہشت انگیزی کے نتیجہ میں اپنی مرضی کا خلیفہ مقرر کر سکتے ہیں تو کل جس کا بھی چاہے گا وہ انہیں حروں کو استعمال کر کے خلافت پر قبضہ کر سکے گا اور اس طرح خلافت جو دین اور شریعت کا ایک اہم جزو تھی۔ تخت و تاج کے پروانوں کی باہمی کشمکش کا شکار ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خلافت کے نام پر مسلمانوں میں دائمی خانہ جنگی جاری رہے گی جس کا خاتمہ اسی وقت ہو گا جب مسلمان تنگ آکر خود خلافت کے تصور ہی کو ختم کر دیں گے۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مسلمانوں میں صدیوں خلافت کے نام پر جنگ جاری رہی اور آخر تنگ آکر مسلمانوں نے ۱۹۲۳ء میں خلافت ہی کا خاتمہ کر دیا۔

۳۔ خلافت کا فیصلہ کسی اصول کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا، سقیفہ میں جو کچھ ہوا تھا اسے نہ انتخاب کہا جاسکتا ہے اور نہ وراثت۔ وراثت اس لئے نہیں کہ رسول اللہؐ کی وراثت کسی قاعدہ سے حضرت ابو بکرؓ کو نہیں پہنچی اور الیکشن اس لئے نہیں کہ انصار کے مقابلہ میں قصہ چھیڑ کر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کا اعلان کر دیا تھا جو کسی حالت میں جمہوری انتخاب نہیں کہا جاسکتا۔ خلافت کے سلسلہ میں

یہ پہلی بے اصولی بعد میں ہر بے اصولی کو جائز قرار دینے کی دلیل بنی۔ چنانچہ مسلمان اس حد پر پہنچ گئے کہ جس کی لامحی اس کی بیخس کا اصول مدرب میں داخل کر لیا گیا اور قہر غلبہ کو دلیل خلافت مان لیا گیا۔

مسلمانوں نے غدر کے اتنی اور رسالت پناہی فیصلہ کے خلاف بغاوت کی اور اس طرح پیغمبر کی آنکھ بند ہوتے ہی مسلمانوں میں دین کے خلاف اللہ اور رسولؐ کے خلاف بغاوت کی عادت پیدا ہو گئی۔ بظاہر صرف ایک حکم کی مخالفت کی گئی لیکن جب احکام رسالت کی مخالفت کا مانہ قوم میں پیدا کر دیا گیا تو یہ ایک ہی بات تک محدود رہنے والا نہیں تھا۔ اس نغصے سے پورے نے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک تدار دور رفت کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کے انتقال کو ایک صدی بھی نہیں گزرنے پائی کہ مسلمانوں کے دارالامارہ شامی میں شراب پانی کی طرح پینے لگی، بیچ رنگ کی محفلیں آراستہ ہو گئیں اور مملکت اسلامیہ میں کھلم کھلا خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کی جانے لگی۔

امیرالمومنینؑ یہ سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ مستحکم آپ کے سامنے آئینہ کے مانند موجود تھا۔ اس فیصلہ کے نتائج سے آپ بخوبی واقف تھے اس لئے آپ نے ملت اسلامیہ کے سامنے جو حق تھا اسے پیش کر دیا۔ دوبار خلافت میں آپ نے بغیر کسی خوف اور جھجک کے اخطاق حق فرمایا اور ایسے حکم دلائل پیش فرمائے کہ بشیر بن سعد انصاری جن کے سارے عقیدہ بنی سادہ میں حضرت ابو بکر کو خلافت حاصل ہوئی تھی۔ خود پکار اٹھے کہ:

”اگر ہمیں پہلے یہ باتیں معلوم ہو گئی ہوتیں تو ہم آپ ہی کو اپنا امیر منتخب کرتے لیکن اب کیا کریں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“

یہی امیرالمومنینؑ کی جیت تھی، آپ کے جواب میں دوبار خلافت کی جانب سے

کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکی۔ خلافت کے ستون اعظم بشیر انصاری نے آپ کے حق کا کھلے الفاظ میں اعتراف کر لیا اور علامتہ المسلمین پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جو کچھ ہوا ہے وہ غلط ہوا ہے۔ اس سے زیادہ امیرالمومنینؑ کو کچھ اور ورکار بھی نہیں تھا۔ آپ بادشاہت کے تمنا ہی نہیں تھے جو اس موقع پر شمشیر کھت ہو جاتے۔ آپ تحریک اسلامی کے قائد تھے اور آپ کو اسلام کا مفاد و کھنا تھا۔ خانہ جنگی اسلام کے مفاد کے خلاف تھی اس لئے آپ نے وہ رخ اختیار فرمایا جو اسلام کے لئے مفید تھا اور اس سیاست علویہ سے قوم کو جو فائدے پہنچے ان کا ذکر ہم سابقہ ابواب میں کر چکے ہیں۔

☆————☆————☆

## اقتصادی پہلو

تاریخ کی تشکیل میں سیاست کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے لیکن خود سیاست کی تشکیل میں معاشی اور اقتصادی حالات کا بہت بڑا حصہ ہوا کرتا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کے سلسلہ میں معاملہ کے اس پہلو کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ کو سمجھنے میں زیادہ تر غلطیاں کی جاتی رہی ہیں۔

قریش کا ندر کے فیصلہ سے انحراف زیادہ تر مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ قریش کے بہت سے سردار امیرالمومنین کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اس لئے قریش

امیرالمومنین کے خلاف تھے۔

۲۔ امیرالمومنین قبیلہ بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے۔

۳۔ امیرالمومنین کی فتوحات اور خدمات جلیلہ کے نتیجہ میں لوگ آپ سے حسد کرنے

لگے تھے۔

۴۔ لوگ دنیا کی جانب مائل ہو گئے تھے۔

میں یہ عرض نہیں کرتا کہ یہ اسباب سراسر غلط ہیں، بے شک ان میں کافی حد تک صداقت ہے لیکن محض ان اسباب کی بنا پر امیرالمومنین کا خلافت سے محروم کر دیا جانا صحیح نہیں ہے اس لئے کہ:-

۱۔ چند قریشی کافروں کا امیرالمومنین کے ہاتھوں قتل ہونا زیادہ سے زیادہ ان کے

قریبی رشتہ داروں کو امیرالمومنین کا مخالف بنا سکتا تھا۔ قریش کی بڑی اکثریت کا اس بنیاد

پر آپ کا مخالف ہو جانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

۲۔ آپ کا بنی ہاشم سے ہونا بھی آپ کی مخالفت کی وجہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ایسی

حالات میں صرف بنی امیہ آپ کے مخالف ہو سکتے تھے جو بنی ہاشم کے دشمن تھے دوسرے

قبائل قریش کا اصل بنیاد پر آپ کا مخالف ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا پھر مزہ کی بات تو یہ ہے

کہ خلافت بنی تیم کے ایک فرد کو ملی تھی اور خلافت دلانے والے بزرگ بنی مدی سے

تعلق رکھتے تھے ان قبائل کی بنی ہاشم سے کوئی دشمنی نہیں تھی رہے بنی امیہ تو ان کو

اس انتخاب خلافت سے ابتدا کی طور پر کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کا ثبوت ابو سفیان کی وہ

گفتگو ہے جو اس نے امیرالمومنین سے کی تھی اور جس میں اس نے صاف طور پر بنی تیم

کے ایک فرد کے خلیفہ مقرر ہو جانے پر اظہارِ ناپسندیدگی کیا تھا۔ ایسی حالت میں آپ کا

بنی ہاشم سے ہونا قوم کے اس فیصلہ پر اثر انداز ہونا نظر میں آتا اس لئے کہ جن لوگوں

کو بنی ہاشم سے سخت دشمنی تھی یعنی بنی امیہ ان کا اس فیصلہ کے وجود میں آنے میں کوئی

حصہ نہیں تھا اور وہ اس فیصلہ کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔

تیسری وجہ البتہ کافی حد تک صحیح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے ایک

طبقہ میں امیرالمومنین کے خلاف حسد کے جذبات موجود تھے لیکن یہ حقیقت بھی ناقابل

انکار ہے کہ اس مرض میں صرف چند ہی افراد مبتلا ہو سکتے تھے۔ قوم کے بڑے طبقہ کا

حسد میں مبتلا ہو جانا درست نہیں کہا جاسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافت کے باب میں قریش کا جو فیصلہ تھا اس میں بڑی حد تک

اقتصادی عوامل کار فرما تھے۔ قریش پیشہ کے اعتبار سے تاجر تھے چنانچہ قدیمی عربی زبان

میں قریش کے معنی ہی تاجر کے تھے۔ یہ طبقہ نہ صرف یہ کہ اندرون ملک کی تجارت پر

حاکمی تھا بلکہ غیر ملکی تجارت میں بھی پیش پیش تھا۔ چنانچہ زمانہ قبل اسلام میں بھی قریش

کے تجارتی قافلے غیر ممالک میں جلیا کرتے تھے اور ان کی غیر ملکی تجارت اتنے اعلیٰ پیمانہ

کی تھی کہ غیر ملکی حکومتیں تک لن کا احترام کرتی تھیں۔ قیصر اور نجاشی تک سے لن کے تعلقات تھے اور لن کی اس بین الاقوامی حیثیت کا سارا انحصار لن کی تجارتی ترقی پر تھا۔ تاجروں کا مفاد ظاہر ہے کہ نفع اندوزی میں ہوتا ہے۔ لن کو اپنے مال کے لئے منڈیاں دور کار ہوتی ہیں اور اس مال کی قیمت دگنی چوگنی بلکہ موقع ملے تو سوگنی بھی دور کار ہوتی ہے۔ یہ تاجر کی فطرت ہے اور قریش اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور عرب قوم کی ابھرتی ہوئی طاقتوں نے اس تاجر طبقہ کے لئے حصول منفعت کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ طبقہ اس حقیقت سے کما حقہ واقف تھا کہ حکومت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں آگئی تو اسے تاجرانہ نفع اندوزی اور معاشی استحصال کے وہ مواقع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے جن کے وہ دور رسالت میں خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر اسے ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جو اس کے معاشی مفادات کی تکمیل کر سکے جس کی حکومت میں اسے حصول دولت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں جو اسے اپنے مال کی کھپت کے لئے زیادہ سے زیادہ منڈیاں دے سکے اور جو ایسی صورتیں پیدا کر سکے جن میں اس کے مال کی قیمتیں دگنی چوگنی ہو جائیں۔ یہ مقصد بھی پورا ہو سکتا تھا جب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے جو اس تاجر طبقہ کے مفادات پورے کر سکیں۔ چنانچہ جب قریش نے دیکھا کہ تخت خلافت پر ایک ایسا شخص متمکن ہو رہا ہے جو اسی تاجر طبقہ کا ایک فرد ہے تو وہ اس حکمران کے ساتھ ہو گئے اور اس حکومت کی تائید پر متعلق ہو گئے جو قریش تاجروں کے لئے ایک نعمت غیر مترقہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس حقیقت سے کئے انکار ہو سکتا ہے کہ اس حکومت سے قریش نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوئیں وہی لوگ جو دانہ دانہ کو محتاج تھے چند ہی سال میں کروڑ

پتی بن گئے۔ ظہ، زبیر، سعد بن وقاص، عبدالرحمن بن عوف اور دوسرے ارکان سلطنت نے اتنی دولت جمع کی جس کا جواب ظلم ہو شرما کی داستانوں میں ہی مل سکتا ہے۔ جسویزیوں میں رہنے والے محلات و قصور کے مالک بن گئے۔ لوگ ورع میں اتنا سونا چھوڑنے لگے جو کلناڑوں سے کاٹ کر ورع میں تقسیم ہوتا تھا اور قریش کے گھروں پر ہن برسے لگے۔ یہ نتیجہ تھا جنگ کے اس لائق سلسلہ کا جو غیر ممالک کے خلاف جاری کر دیا گیا تھا۔ لن جنگوں کے نتیجہ میں منگائی بیٹھ گئی۔ مال کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ ممالک فتح ہوئے تو سردار لن قریش کو بڑی بڑی جاگیریں مل گئیں۔ جگہ جگہ عربوں کی نوآبادیات قائم ہو گئیں۔ زر خیز علاقوں کی دولت حجاز میں آنا شروع ہو گئی۔ مفتوحہ ممالک کی شکل میں قریش تاجروں کو تھی اور اچھی منڈیاں حاصل ہو گئی۔ شام، عراق اور مصر کے بازاروں پر لن کا قبضہ ہو گیا۔ فوجی تسلط کے نتیجہ میں لن کو غیر ملکی مقابلہ سے نجات مل گئی۔ غرض یہ کہ نفع اندوزی کے ہزاروں دروازے کھل گئے اور عربوں نے اس کے نتیجہ میں اتنی دولت کمائی جس کی نظیر لن کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

عربوں نے جنگ اور فتوحات سے وہی فائدہ اٹھایا جو ہر شہنشاہیت پسند (Imperialist) قوم اپنی فتوحات ملکی سے اٹھایا کرتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ عراق، مصر اور شام کی دولت پر قبضہ کر لیا بلکہ ان ممالک کو مستقل طور پر اپنی نوآبادیوں میں تبدیل کر دیا۔ لن کی زبان، تہذیب اور رہن سہن کے طریقے تک بدل ڈالے اور ان کو پورے طور پر عرب ملکوں میں تبدیل کر دیا۔ ایرن میں یہ صورت تو نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی ایرانی زبان اور تہذیب پر عربوں نے جو نقوش چھوڑے وہ ایرانیوں کی شدید قومی حیثیت کے باوجود آج تک محو نہیں ہو سکے ہیں۔

دولت اور حکومت پر قبضہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اپنے آپ کو حکمران قوم تصور کرنے لگے اور جن ممالک پر انہوں نے قبضہ کیا تھا ان کو اسلام قبول کر لینے کے

کی تھی کہ غیر ملکی حکومتیں تک ان کا احترام کرتی تھیں۔ قیصر اور نجاشی تک سے ان کے تعلقات تھے اور ان کی اس بین الاقوامی حیثیت کا سارا انحصار ان کی تجارتی ترقی پر تھا۔ تاجروں کا مفاد ظاہر ہے کہ نفع اندوزی میں ہونا ہے۔ ان کو اپنے مال کے لئے منڈیاں دور کار ہوتی ہیں اور اس مال کی قیمت دگنی چوگنی بلکہ موقع ملے تو سو گنی بھی دور کار ہوتی ہے۔ یہ تاجر کی فطرت ہے اور قریش اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں اسلامی حکومت کے قیام اور عرب قوم کی ابھرتی ہوئی طاقتوں نے اس تاجر طبقہ کے لئے حصول منفعت کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ طبقہ اس حقیقت سے کما حقہ واقف تھا کہ حکومت حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں میں آگئی تو اسے ناجائز نفع اندوزی اور معاشی استحصال کے وہ مواقع ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے جن کے وہ دور رسالت میں خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر اسے ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جو اس کے معاشی مفادات کی بحال کر سکے جس کی حکومت میں اسے حصول دولت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں جو اسے اپنے مال کی کھپت کے لئے زیادہ سے زیادہ منڈیاں دے سکے اور جو ایسی صورتیں پیدا کر سکے جن میں اس کے مال کی قیمتیں دگنی چوگنی ہو جائیں۔ یہ مقصد بھی پورا ہو سکتا تھا جب حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے جو اس تاجر طبقہ کے مفادات پورے کر سکیں۔ چنانچہ جب قریش نے دیکھا کہ تخت خلافت پر ایک ایسا شخص متمکن ہو رہا ہے جو اسی تاجر طبقہ کا ایک فرد ہے تو وہ اس حکمران کے ساتھ ہو گئے اور اس حکومت کی تائید پر متعلق ہو گئے جو قریش تاجروں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی تھی۔

اس حقیقت سے کئے انکار ہو سکتا ہے کہ اس حکومت سے قریش نے جو امیدیں وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوئیں، وہی لوگ جو دانہ دانہ کو محتاج تھے چند ہی سال میں کروڑ

پتی بن گئے۔ ظہر، زبیر، سعد بن وقاص، عبدالرحمن بن عوف اور دوسرے ارکان سلطنت نے اتنی دولت جمع کی جس کا جواب طلسم ہو شرا کی داستانوں میں ہی مل سکتا ہے۔ جموں پڑوں میں رہنے والے علات و قصور کے مالک بن گئے۔ لوگ ورعہ میں اتنا سونا چھوڑنے لگے جو کلناڑوں سے کٹ کر ورعہ میں تقسیم ہوا تھا اور قریش کے گھروں پر ہن برسے لگا۔ یہ نتیجہ تھا جنگ کے اس لامتناہی سلسلہ کا جو غیر ممالک کے خلاف جاری کر دیا گیا تھا۔ ان جنگوں کے نتیجہ میں منگلی بیڑہ مٹی۔ مال کی قیمتیں چڑھ گئیں۔ ممالک فتح ہوئے تو سردار ان قریش کو بڑی بڑی جاگیریں مل گئیں۔ جگہ جگہ عربوں کی نوآبادیات قائم ہو گئیں، درخیز علاقوں کی دولت حجاز میں آنا شروع ہو گئی۔ مفتوحہ ممالک کی شکل میں قریش تاجروں کو مٹی اور اچھی منڈیاں حاصل ہو گئی۔ شام، عراق اور مصر کے بازاروں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ فوجی تسلط کے نتیجہ میں ان کو غیر ملکی مقابلہ سے نجات مل گئی۔ غرض یہ کہ نفع اندوزی کے ہزاروں دروازے کھل گئے اور عربوں نے اس کے نتیجہ میں اتنی دولت کمائی جس کی نظیر ان کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

عربوں نے جنگ اور فتوحات سے وہی فائدہ اٹھایا جو ہر شہنشاہیت پسند (Imperialist) قوم اپنی فتوحات ملکی سے اٹھایا کرتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ عراق، مصر اور شام کی دولت پر قبضہ کر لیا بلکہ ان ممالک کو مستقل طور پر اپنی نوآبادیوں میں تبدیل کر دیا۔ ان کی زبان، تہذیب اور رہن سہن کے طریقے تک بدل ڈالے اور ان کو پورے طور پر عرب ملکوں میں تبدیل کر دیا۔ ایران میں یہ صورت تو نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی ایرانی زبان اور تہذیب پر عربوں نے جو نقوش چھوڑے وہ ایرانیوں کی شدید قومی عصییت کے باوجود آج تک محو نہیں ہو سکے ہیں۔

دولت اور حکومت پر قبضہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اپنے آپ کو حکمران قوم تصور کرنے لگے اور جن ممالک پر انہوں نے قبضہ کیا تھا ان کو اسلام قبول کر لینے کے

بادجود محکوم قوم کا درجہ دیا جائے لگا۔ تمہیں کو عرب عورتوں سے شادی کی ممانعت کر دی گئی۔ غیر عرب بچوں کو میراث کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ عام عربوں کو قرشی خواتین سے عقد کی ممانعت کر دی گئی۔ حکمران نسل کے افراد کو محکوم قوموں کے افراد سے بیگار لینے کا حق عطا کر دیا گیا اور عبادہ بن صامت نے تو غضب ہی کر دیا کہ خلیفہ دوم کو یہ سمجھا دیا کہ کسی ذبی کے قتل کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اس قسم کی تہذیبوں نے عربوں کی سامراجی ذہنیت میں زبردست اضافہ کر دیا اور اسلامی دنیا حاکم اور محکوم ممالک میں تقسیم ہو گئی۔

آج مسلمانوں کا ایک طبقہ صدر اسلام کے مسلمانوں کی دولت اور خوشحالی پر بڑا فخر کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس فراوانی دولت کے اندر ہی اس سامراجی اور سرمایہ دارانہ نظام کے مقاصد کے جراثیم بھی پوری قوت کے ساتھ پودان چڑھ رہے تھے۔ سرمایہ کی زیادتی کے پردہ میں ہی سرمائے کی تباہی کے عناصر بھی ابھر رہے تھے اور مدینہ کے حکمران جس غلط راہ پر چل کھڑے ہوئے تھے وہی ان کے ذوال اور تباہی کا سبب بننے والی تھی۔ ایران، مصر اور عراق میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان ممالک کے عوام اس معاشی لوٹ پر غضبناک ہوتے جا رہے تھے اور قرشی حکمرانوں کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت کا ایک جذبہ بڑھتا جا رہا تھا جو آخر ایک دن رنگ لاکے رہا اور دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مدینہ کے جس تاج بخش طبقہ کا اقتدار افغانستان کی سرحدوں سے لے کر افریقہ کے ساحل تک مسلم قہارہ چھتیس سال سے زیادہ دنیا کے اسلام پر حکومت نہ کر سکا اور اسے ذوال کا وہ روز بد و گھنا پڑا کہ اس کے دو ہاں ابھرنے کے امکانات ہی ختم ہو گئے۔

قرشی تاجروں کی سرمایہ پرستانہ لوٹ اسلامی سیاست پر بھی اپنے اثرات ڈالے بغیر نہ رہ سکی چنانچہ حضرت ابو بکر نے یہ دیکھتے ہوئے کہ جنگ آزادی کی پالیسی نے جہاں

گرائی اور فتوحات کے ذریعہ قریش کے اونچے طبقہ کو مالا مال کر دیا ہے وہیں غریب طبقہ میں شدید بے چینی بھی پیدا کر دی ہے۔ خلافت کے سلسلہ میں انتخاب کا خطرہ مول لینے سے قطعاً انکار کر دیا اور حضرت عمر کو جو قریش کے تاجرانہ مغلوب کی حفاظت کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

حضرت ابو بکر یہ جانتے تھے کہ اگر خلافت کو انتخاب پر چھوڑ دیا گیا تو حکومت قرشی تاجروں کے ہاتھوں سے نکل جائے گی، اس لئے کہ جنگ اور گرائی کے نتیجہ میں غریب طبقہ اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ وہ کسی حالت میں سرمایہ دار قرشی سرداروں کو حکومت پر قبضہ کر لینے کی اجازت نہیں دے گا بلکہ اس شخص کو خلیفہ بنا دے گا جو عوام کو جنگ، گرائی اور معاشی لوٹ سے نجات دلا کے سکون کی زندگی عطا کر سکے۔ ایسی حالت میں امیر المومنین کے خلیفہ منتخب ہو جانے کا خطرہ پوری شدت سے پیدا ہو گیا تھا۔ عوام میں آپ کا اثر بڑھتا جا رہا تھا اور سقیفہ بنی ساعدہ کے فیصلہ کے دو سال کے اندر ہی عوام کو من کینت، مولاہ، فخر اعلیٰ مولاہ کی صحت و اصابت کا یقین پیدا ہونے لگا تھا عام مسلمان یہ سمجھنے لگے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اعلان کا مقصد حکومت کو اپنے گھرانے میں محدود رکھنا نہیں تھا جیسا کہ قرشی سرداروں نے عوام کو سمجھا رکھا تھا بلکہ اس فرمان رسالت کا مقصد مسلم عوام کی بھلائی تھی۔ مسلم عوام کے اس بڑھتے ہوئے احساس کا اندازہ حکمران طبقہ کو بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ خلافت کے باب میں

دلچسپی کی بجائے نامزدگی کا اصول اختیار کرنے میں اپنی عاقبت تصور کر رہا تھا۔ امیر المومنین کی سمت بڑی کامیابی تھی کہ سقیفہ کے فیصلہ کے چھ دو سال کے اندر بعد قریشی حکمران انتخاب کرانے یا عوام کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے اور انہوں نے اپنی لیڈان سے نہ سہی اپنے عمل سے یہ تسلیم کر لیا کہ اگر خلافت کے لئے انتخاب کی اجازت دے دی جاتی تو حکومت قرشی تاجروں کے ہاتھوں میں نہ

رہتی علیؑ کے ہاتھوں میں چلی جاتی جو معاشی استحصال کے خلاف اور عوام کی حقیقی خوشحالی کے علمبردار تھے۔

امیرالمومنینؑ کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی تھی کہ ابھی وہیں میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو قریش نے اس نامزدگی کے اصول کو ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس کے بجائے الیکشن کا نعرو بلند کیا تھا لیکن ﷺ میں ایسا نقشہ بدلا کہ نامزدگی کے اصول کی مخالفت کرنے والے خود اس کے علمبردار بن گئے اور حضرت عمر کی نامزدگی بے چون و چرا قبول کر لی گئی ظاہر ہے کہ یہ وہی حیثیت سے حضرت ابو بکر کو رسول اللہؐ پر فضیلت دینے کی کوئی جرات نہیں کر سکا۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ رسول اللہؐ کو خلافت کے سے شرعی معاملہ میں اپنا جائزین نامزد کرنے کی اس لئے اجازت نہیں دی گئی کہ ان کا فیصلہ غلط اور حضرت ابو بکر کا فیصلہ اس لئے مان لیا گیا کہ وہ صحیح تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شریعت نے اپنا جائزین مقرر کرنے کا حق نہیں دیا تھا اور حضرت ابو بکر کو یہ حق بھی حاصل تھا کیونکہ یہ باتیں تو وہی کہہ سکتا ہے جو اسلام کی بنیادوں کو حدم کر دے اس لئے ہمیں یہی ماننا پڑے گا کہ رسول اللہؐ کا فیصلہ اس لئے نہیں مانا گیا کہ وہ قریش کے تاجرانہ مفاد کے خلاف تھا اور حضرت ابو بکر کے فیصلہ کی اس لئے توثیق کر دی گئی کہ اس سے قرشی سرمایہ داروں کے مفادات وابستہ تھے۔

امیرالمومنینؑ علیہ السلام کی یہ بھی ایک بڑی کامیابی تھی کہ مسلم عوام نے اکابر قریش کی بے اصولی کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور یہ حقیقت ان کے سامنے آگئی کہ جن لوگوں کو قوم کاستوں اور ملت کا عمود تصور کیا جاتا تھا وہ اتنے بے اصول اور مطلب پرست دوست تھے کہ جس وقت جو بات ان کے مفید متعبد ہوتی تھی وہی کہنا شروع کر دیتے تھے اور عوام کے مفاد کو نظر انداز کرتے ہوئے ہر موقع پر خود اپنے مفاد کو

پیش نظر رکھتے تھے جس وقت وہ الیکشن کے نام پر حکومت حاصل کر سکتے تھے اس وقت انہوں نے رسول اللہ کے فیصلہ کی بھی پروا نہ کی اور جیسے ہی ان کو آزادانہ انتخابات میں اپنے اقتدار کو خطرہ نظر آیا ویسے ہی وہ خود نامزدگی کے دامن میں منہ پھپھانے لگے مسلم عوام کے سامنے اس حقیقت کا آجانا امیرالمومنینؑ کی ایک شاندار کامیابی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس اصول خلافت کی کھلی ہوئی فتح تھی جس کا اعلان آپ نے غدیر خم میں فرمایا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ مسلم عوام کے اس احساس کا کوئی عملی نتیجہ تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتا لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قیصر اور کسری کی قوتیں اسلامی سرحدوں پر موجود تھیں اور ایسے پر آشوب حالات میں مسلم عوام کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مسئلہ خلافت پر حکمران طبقہ سے کوئی اختلاف کر کے دشمن کو قوی اور اپنے آپ کو کمزور بنالیں یہی وجہ ہے کہ عوام نے اس نامزدگی کو خاموشی سے قبول کر لیا اور مسلمانوں کے اتحاد اور مملکت اسلامیہ کے دفاع کی خاطر قرشی تاجروں کی حکومت چند سال تک اور برداشت کرنے پر تیار ہو گئے لیکن مسلم عوام کی اس خاموشی کو خوشی یا ان کی رضامندی تصور کر لینا غلط ہے بے چینی کا مظاہرہ پارہ پارہ ہونا رہا ہے اور اس کا تدارک اس ”ورہ فاروقی“ سے کیا جانا رہا ہے جسے خلیفہ وقت کے ”جلال و جبروت“ کی فخر آفریں نشانی قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت خلیفہ دوم کے متعلق یہ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ کافی سخت گیر تھے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آپ عوام کے ”محبوب رہنما“ اور ”جمہوری قائد“ تھے تو آپ کو قدم قدم پر اپنے ”جلال“ کے مظاہرہ کرنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوا کرتی تھی؟ جلال اور غضب کا مظاہرہ یا تشدد پر عمل وہیں ہوتا ہے جہاں عوام میں حکمرانوں یا ان کے طرز عمل کے خلاف بے چینی ہو ا کرتی ہے۔ عرب کی دنیا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں

تھی چنانچہ وہاں بھی جو ”مظاہرہ جلال و جبروت“ ہو رہا تھا اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ مدینہ کے ظاہری سکون کی تمہ میں طوفان کی پرورش ہو رہی تھی عوام بے چین تھے قریش تاجروں کے اقتدار کی مخالفت بڑھتی جا رہی تھی اور حکمران طبقہ اسی بے چینی کو دور کرنے کے لئے اس دورہ فاروقی کا سارا لے رہا تھا جس پر عقیدت کے مارے مسلمان آج تک فخری ٹوپیاں اچھالا کرتے ہیں۔

حضرت عمر کو خلافت مل گئی لیکن ایک ہوشیار سیاستدان کی حیثیت سے ان کو اس چیز کا پورا احساس تھا کہ حکومت کی اساس مل چکی ہے عوام بے چین ہو رہے ہیں اور قریش کا اقتدار اعلیٰ متزلزل ہو رہا ہے اس لئے انہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے

۱ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور مسلمانوں کے لیے لیے وظیفے مقرر کر دیئے تاکہ ان کے اثرات سے قائدہ اثما کے عوام پر قابو رکھا جاسکے۔

۲ جنگ کے سلسلہ کو طول دے دیا تاکہ عوام کی توجہ لڑائیوں پر مبذول ہو جائے اور وہ فتوحات کی خبروں سے خوش ہو کے اپنی معاشی تباہ حالی اور مملکت پر قرشی سرمایہ داروں کی گرفت کو فراموش کریں۔

۳ بنی امیہ کو شام کی گورنری دے کر خرید لیا تاکہ عوام پر ان کے ساتھ اثرات سے قائدہ اٹھایا جائے

۴ دورہ فاروقی کی خوب خوب نمائش کی گئی تاکہ عوام دہشت زدہ ہو جائیں اور وہ حکومت کے خلاف لب کشائی کی جرات نہ کریں

۵ عربوں میں شدید قومی عصیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ قریش کے حکمران طبقہ کو اپنے قومی اقتدار کا مظہر تصور کرتے ہوئے اس کی حکومت پر مطمئن ہو جائیں۔

۶ حضرت علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے بھی بڑے بڑے وظائف مقرر کر دیئے تاکہ عوام اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ وہ جن لوگوں سے اپنی قیادت اور مجتہد کی آس لگائے بیٹھے ہیں وہ بھی قریش کی سرکاری مشین کا ایک پرزہ ہیں اور اس طرح عوام اپنے انقلابی رجحانات کے لئے کوئی مناسب قیادت نہ پاتے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر ہو جائیں۔

۷ عراق، شام اور مصر وغیرہ میں عرب نوآبادیات قائم کر کے عربوں کی آبادی کو کافی حد تک منتشر کر دیا گیا کوفہ اور بصرہ کے شہر اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں

۸ عوام کی علمی اور ذہنی سطح کو پست رکھنے کی تدابیر پر پوری شدت سے عمل کیا گیا چنانچہ کتابت حدیث پر لوگوں کو سزائیں دی گئیں اور مساجد میں یہ قائدہ مقرر کر دیا گیا کہ صرف حکومت کے منظور کردہ حضرات ہی خطبہ دیا کریں۔

عوام کی بے چینی پر قابو حاصل کرنے کی یہ اور دو سری سمت سے تدابیر اختیار کی گئیں لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ حالات بگڑتے چلے گئے اور آخر حضرت عمر کو یہ ہمت نہ ہو سکی کہ وہ اپنے بعد کے لئے کوئی خلیفہ مقرر کر دیں چنانچہ آپ نے بڑے غور و فکر کے بعد وہ تدابیر اختیار کی جس سے ساتھ ہی مرجائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے حکومت پر قرشی تاجروں کا قبضہ بھی قائم رہے اور عوام کی جانب سے اختلافی صداائیں بلند ہونے کا بھی امکان باقی نہ رہے وہ تدبیر یہ تھی کہ آپ نے چھ آدمیوں کی کمیٹی مقرر فرمادی اور یہ اعلان کر دیا کہ یہ لوگ آپس میں جس شخص کو منتخب کر لیں وہی اسلامی دنیا کا حکمران ہو گا۔

اس کمیٹی میں آپ نے تدبیر یہ کی کہ قریش کے سرمایہ دار طبقہ کے پانچ نمائندے رکھے اور چھٹا آدمی وہ رکھا جو غریب مسلم عوام کی امیدوں کا آخری سہارا تھا۔ کمیٹی کے ارکان میں حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن وقاص، حضرت عثمان اور حضرت



عبدالرحمن بن عوف سرمایہ دار طبقہ کے نمائندے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کوڑپتی تھا۔ ہر ایک کے بڑے بڑے کاروبار تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں تھیں کئی کئی مملکت تھے۔ ہر ایک کے پاس سونے چاندی کا اتنا انبار تھا کہ ان کی دولت آج کے راک فیلر فورڈ اور ٹاٹا کو شرم سے آب آب کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ان کی دولت کے ہو شرما انسانے پڑھ کر انسان آج بھی دنگ رہ جاتا ہے ظاہر ہے کہ خلافت ان میں سے جن بزرگ کو حاصل ہوتی وہ اسے قریش کے سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے استعمال کرتا اور چونکہ کمیٹی میں ۶۱ اکثریت انہیں حضرات کی تھی اس لئے یہ لازمی تھا کہ حکومت انہیں کے ہاتھوں میں بہ الفاظ دیگر قریش کے انہیں تاجروں کے ہاتھوں میں رہے گی جو اسے اپنے قبیلہ کے تاجرانہ مفاد کے لئے استعمال کرتے رہیں گے۔

قریش سرمایہ داروں کو ۱۵ اکثریت عطا کر دینے پر بھی حضرت عمر مطمئن نہیں تھے۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی موت کے بعد رائے عامہ کا دباؤ کمیٹی کے دو تین ممبروں پر اثر انداز ہو جائے اور خلافت اس شخص کے ہاتھوں میں چلی جائے جو قریش کی تاجرانہ لوٹ اور جاگیر دارانہ طمطلق کا سخت مخالف تھا اس لئے آپ نے یہ حکم بھی لگا دیا کہ اگر کمیٹی کے ممبران کے ووٹ برابر سے بٹ جائیں تو وہ فریق کامیاب سمجھا جائے گا جسے عبدالرحمن بن عوف کا ووٹ حاصل ہو گا اور اس طرح آپ نے اس طبقہ کی حکومت یقینی بنا دی جس کے آپ خود نمائندے تھے۔ عبدالرحمن بن عوف کے متعلق آپ کو یقین تھا کہ وہ اپنے خالہ زانو بھائی حضرت عثمان کا ساتھ دیں گے اس طرح حضرت عثمان اور حضرت ابن عوف کے دو ووٹ ایک ساتھ ہوں گے اور ان کو کامیابی کے لئے صرف ایک ووٹ کی ضرورت ہو گی اس لئے کہ ایک ووٹ حاصل ہو جانے کے بعد ابن عوف کا ایک ووٹ دو ووٹ کے برابر ہو جائے گا اور قریشی سرمایہ دار طبقہ اپنی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو جائے گا۔

حضرت عمر اس حقیقت کو جانتے تھے کہ عوام لب جنگ گرانی اور معاشی بد حالی سے تنگ آچکے ہیں اس لئے اگر کمیٹی میں صرف قریشی تاجروں کے نمائندے رکھے گئے تو ان کا فیصلہ عوام کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا اس لئے انہوں نے محض عوام کی اشک شوقی کے لئے کمیٹی میں حضرت علی کا نام بھی رکھ دیا تھا لیکن اس کا پورا بندوبست کر دیا تھا کہ ان کو کسی حالت میں خلافت کا تخت دستیاب نہ ہونے پائے عبدالرحمن بن عوف کے ہاتھوں میں خلیفہ سازی کی قوتیں مرکوز کر دینے کا مقصد صرف یہی تھا۔

بہر حال اس کمیٹی میں حضرت علی علیہ السلام کے اسم گرامی کی شمولیت جہاں عوامی قوتوں کی ایک بڑی فتح تھی اور اس ثبوت تھا کہ قریشی سرمایہ داروں پر رائے عامہ کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے وہیں یہ امیرالمومنین علیہ السلام کے اصولوں اور آپ کے طرز عمل کی بھی ایک بہت بڑی کامیابی تھی اس لئے کہ آج قریش کے کوڑپتی حکمران اس پر مجبور ہو رہے تھے کہ اس شخص کو جسے ابھی چند سال قبل تنہا سے باب خلافت تک لے جایا گیا تھا جسے اسلامی سیاست سے دور رکھنے کی ہر امکانی سعی کی جاتی رہی تھی جس کے خلاف خاندانی اور نسلی تعصب کو خوب ابھارا جا چکا تھا جسے مذک کی جھپٹی اور نفس سے محرومی کے نتیجہ میں مالی طور پر برباد کیا جا چکا تھا اور جس کے شرف و منزلت پر پردہ ڈالنے کی ہر امکانی تدبیر عمل میں لائی جا چکی تھی اسی کو ”مستحقین خلافت کی کمیٹی“ میں شامل کیا گیا اور یہ کام خود انہیں حضرت عمر کو انجام دینا پڑا جنہوں نے آج سے محض پندرہ سال قبل اسی شخص کو قصر خلافت سے بے دخل کرنے میں سب سے بڑا کردار انجام دیا تھا۔

تقدیر اور حالات کا یہ کتنا بڑا مجوبہ ہے کہ انہیں حضرت عمر کو جنہوں نے حضرت کو خلافت سے محروم کرنے میں سب سے نمایاں کردار ادا فرمایا تھا مرتے وقت یہ تسلیم کر لینا پڑا کہ عوام اگر کسی شخص کی حکومت میں مسرت اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو وہ

حضرت علیؑ ہی ہیں اور چارو ناچار ان کو علیؑ کا نام اس فہرست میں شامل کرنا پڑا جو آپ نے مستحقین خلافت کی تیار فرمائی تھی۔

حضرت عمرؓ کی آنکھ بند ہوتے ہی کمپنی کے چہ ارکان میں سے چار حضرت دعوئے خلافت سے دست بردار ہو گئے اور لب صرف دو حضرت باقی رہ گئے جن میں سے کسی ایک کا خلافت کے لئے انتخاب ہونا تھا ان دو میں ایک حضرت عثمانؓ اور دوسرے حضرت علیؑ بظاہر اسے معمولی بات تصور کیا جائے گا لیکن واقعات کا یہ رخ اختیار کرنا دراصل اس عظیم ٹکراؤ کا پتہ دیتا ہے جو قرشی سرمایہ داروں اور عوامی قوتوں میں ہو رہا تھا حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے دلوں میں تمنائے خلافت کا وجود جنگِ حمل کے حالات سے بخوبی ظاہر ہے لیکن اس موقع پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پیچھے ہٹ گئے حالانکہ حصول خلافت کا یہ بہت اچھا موقع تھا سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ بظاہر ان کے اس اقدام کی مندرجہ ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں:-

۱ یہ حضرت عوام کی بے چینی سے کما حقہ واقف تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ عوام زیادہ عرصہ تک ان سیاسی، معاشی اور معاشرتی حالات کو برداشت نہیں کر سکیں گے جو قرشی تاجروں اور جاگیرداروں نے پیدا کر دیئے تھے اور جلد یا بدیر حکمران وقت کے خلاف بغاوت ہو گی جس کا ان کو وہی خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو بلاخر حضرت عثمانؓ کو بھگتنا پڑا۔

۲ ان کو امید تھی کہ اگر حضرت عثمانؓ خلیفہ بنا دیئے گئے تو بنی امیہ کی پوری قوت قرشی سرمایہ داروں کی پشت پر آجائے گی اور ابو سفیانؓ کو دور جاہلیت میں عوام پر جو اثر و نفوذ حاصل رہا تھا اس کی مدد سے سرمایہ داروں کا راج قائم رہ سکے گا۔

۳ بنی امیہ اپنی روایتی سخت گیری، ظلم اور سیاسی جوڑ توڑ سے قرشی سرمایہ داروں کے لرزے ہوئے ایوان حکومت کو اندام سے بچالیں گے اور ان کو جلب

منفعت کے جو راستے سابقہ حکومتوں کے دور میں حاصل ہو چکے تھے وہ قائم رہیں گے

۴ حضرت عثمانؓ کی پشت پر سارا برسر اقتدار طبقہ متحد نظر آنے کے نتیجے میں عوام کا جذبہ انقلاب ابھروا ہوا جائے گا۔

بہر حال یہ بھی امیر المومنینؓ کی ایک بڑی کامیابی تھی کہ آج قریش کا سارا برسر اقتدار طبقہ یہ تسلیم کر رہا تھا کہ علیؑ اتنی بڑی قوت ہیں کہ میدان انتخاب سے ان کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا اور ان کو نظر انداز کر کے خلافت کا معاملہ طے کرنا حدودِ وجہ مشکل ہے۔ وہی علیؑ جن کو گزشتہ دو مواقع پر انتہائی بے لگاری سے نظر انداز کر دیا گیا تھا آج عوام میں اتنے ہر دلہیز اور اتنے ہا اثر ہو چکے تھے کہ ان کو نظر انداز کر کے کام چلانا ناممکن خیال کیا گیا اور برسر اقتدار طبقہ کو اپنے نمائندہ کے مقابلہ میں چارو ناچار ان کا نام رکھنا پڑا۔ یہاں سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ کے انتخاب کا اختیار عبدالرحمن بن عوفؓ کو کیوں دیا تھا؟ اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حق انتخاب سرمایہ دار طبقہ کے ایک فرد کے ہاتھوں میں نہ سونپ دیا گیا ہوتا بلکہ اسے عوام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہوتا تو حضرت عمرؓ کے بعد ہی وہ شخص خلیفہ ہو جاتا ہو بلاخر حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد خلیفہ بنایا گیا!

یہاں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھی قرشی سرمایہ دار تو حصول خلافت کے لئے بے چین تھے لیکن امیر المومنینؓ اس باب میں انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کر رہے تھے اس کی وجہ ظاہر ہے قرشی سرمایہ داروں کو اپنا ایوان اقتدار متزلزل نظر آ رہا تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ لب عوام کو زیادہ دنوں تک دھوکے میں جتلا رکھ کر ان پر حکومت کرتے رہنا اور اس حکومت کے نتیجے میں خزانے جمع کرتے رہنا مشکل ہے اور امیر المومنینؓ کو اپنی قوت پر پورا اعتماد تھا۔ آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ عوام تو اپنی سابقہ

غلیظوں کا احساس شدید تر ہو تا جا رہا ہے اور وہ الہی نظام حکومت کی خوبی نیز سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتخاب خلافت کی اصابت کا اعتراف کرنے لگے ہیں انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جن لوگوں پر وہ اعتماد کر رہے تھے انہوں نے ان کو دھوکہ دے کر ان پر الہی حکومت کے بجائے سرمایہ داروں کا راج قائم کر دیا ہے اور وہ اس حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کی خلافت پر جو اصرار کیا تھا وہ حکومت کو اپنے خاندان میں مرکوز رکھنے کی خاطر نہیں تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ علیؑ ہی اسلامی دنیا میں وہ واحد شخص تھے جو حکومت الیہ قائم کرنے اور ملت اسلامیہ کی عظیم انقلابی تنظیم کو برقرار رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ امیرالمومنین عوام کے اس نئے رجحان کا پورا اندازہ رکھتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ یہ چاہتے تھے کہ عوام کو کچھ اور تجربات ہو جائیں تاکہ الہی نظام حکومت کی صحت کے باب میں ان کو کوئی شبہ باقی نہ رہے اور آئندہ بھی اکابر قریش کو یہ موقع نہ ملنے پائے کہ وہ عوام کو بھٹکائیں یہی وجہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ آپ کا نام کتبلی میں شامل کر دیا گیا تھا اور پھر چار امیدوار دست بردار ہو جانے کے نتیجے میں آپ کے مقابلہ میں صرف ایک امیدوار رہ گیا تھا جو کسی حالت میں آپ کا برا مقابل قرار نہیں دیا جاسکتا تھا آپ نے حصول خلافت پر کوئی توجہ نہیں فرمائی اور عبدالرحمن بن عوف نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنانے کی جو چال چلی تھی اسے کامیاب ہونے کا موقع دے دیا۔ یہ سیاست علویہ کا بڑا دلچسپ مظاہرہ تھا اس لئے کہ اس کے نتیجے میں

۱ عوام نے یہ دیکھ لیا کہ حکمران قرشی تاجر طبقہ اپنے اقتدار کی بھٹاکے لئے کس حد تک سازشی ماحول تیار کر سکتا ہے

۲ عبدالرحمن بن عوف کی اسلام دوستی اور ایمانداری کا پول دنیا پر کھل گیا

۳ ایک قرشی سرمایہ دار کے ہاتھوں میں انتخاب خلافت کا حق سونپ دیئے جانے کا

نتیجہ عوام نے دیکھ لیا اور ان کو معلوم ہو گیا صحابیت اور رسول اللہ سے رشتہ داری کے باوجود ایک قرشی سرمایہ دار کس حد تک عدل اور عوام دوستی کا مظاہرہ کر سکتا ہے؟

۴ نئے خلیفہ کے سلسلہ میں عوام کو یہ تجربہ ہو گیا کہ کسی شخص کا انتخابی ہونا یا سماج ہونا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریشہ لڑکیوں کا شوہر ہونا بھی ہرگز یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ الہی حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال سکتا ہے

۵ جس بزرگ نے خلافت اسلامیہ کی قسمت ابن عوف کے ہاتھوں میں دے دی تھی ان کی دوا تدارکی، اصابت لگے، عدل پروری، صحت رائے اور مردم شناسی کا بھی اچھا خاصہ مظاہرہ ہو گیا۔

فرض یہ کہ امیرالمومنین نے اس موقع پر مسئلہ خلافت کے سلسلہ میں جو بے اشتناکی ظاہر فرمائی اس کے نتیجے میں آپ نے

(۱) خلیفہ سابق (۲) خلیفہ جدید (۳) خلافت ساز ارکان اور (۴) قریش کے حکمران طبقہ کو ایک ساتھ برا گنہ نقاب کر دیا اور ان کے چروں پر صحابیت، عدالت، اسلامیت اور عوام دوستی کی جتنی نقابیں پڑی ہوئی تھیں وہ سب ایک ساتھ نوح کے پھینک دیں تاکہ عوام یہ سمجھ لیں کہ صحابیت، تقدس، شرف ہجرت اور نسبی بلندی کے سارے افسانوں کے باوجود قریش کا طبقہ اعلیٰ در حقیقت کیا ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اور حکومت الیہ یا اخلافت اسلامیہ کے باب میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

حضرت عبدالرحمن بن عوف نے انتخاب خلافت کے سلسلہ میں جو اصول وضع فرمایا تھا وہ بھی کافی حد تک دلچسپ اور قریش کے تاجرانہ مفاد کا پورا پورا مظہر تھا آپ نے حضرت علیؑ اور حضرت عثمانؓ دونوں سے یہ وعدہ چاہا کہ وہ

کتاب اللہ سنت رسول اور سیرت خلفائے راشدین پر عمل کریں گے۔  
اس جملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کے کلمے تو محض "برائے وزن  
بیعت" تھے ورنہ اصل سوال تو سیرت خلفائے راشدین کا تھا جو یہ تھی کہ ہے۔

۱ قریش کے بڑے بڑے لوگوں کو بیت المال سے جو یہی لہی رقیس ملا کرتی تھیں وہ  
دی جاتی رہیں گی۔

۲ فتوحات کا سلسلہ جاری رہے گا اور ان ممالک کی زر خیز زمینیں "حسب دستور  
قدیم" عرب سرداروں میں تقسیم ہوتی رہیں گی۔

۳ قریش کا نسبی تقاضا عربوں پر اور عام عربوں کی نسلی برتری غیر عربوں پر قائم  
رہے گی۔

۴ تقسیم ہائتویہ کا وہ اصول جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور  
حکومت میں جاری تھا وہ باہر جاری نہیں کیا جائے گا۔

۵ لڑائیوں کا سلسلہ قائم رہے گا تاکہ گرانی باقی رہے اور قریشی تاجروں کو نفع  
اندوزی کا پورا موقع حاصل ہو تا رہے۔

۶ قریشی عوام کے انقلابی رجحانات کو کچلنے کی پوری کوشش کی جائے گی تاکہ غیر  
قریشی عربوں اور مشرکہ ممالک کے مسلمانوں میں قریش کی معاشی لوٹ کے خلاف  
جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ دبی رہے۔

۷ عوام کو جاہل رکھنے کی پوری کوشش کی جائے تاکہ وہ قرآن اور حدیث کی روشنی  
میں اپنے ان حقوق کا مطالبہ نہ کرنے پائیں جو اللہ نے ان کو عطا کئے تھے۔

یہ تھی وہ سیرت شیعین جو سرمایہ داران قریش کے مفاد کی تکمیل کرتی تھی اور  
جس پر عمل کرنے کا عبدالرحمن بن عوف نے خلیفہ سے عد لینا چاہتے تھے۔  
امیرالمومنین نے اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیا لیکن حضرت عثمان نے یہ شرط منظور

فرمانی۔ چنانچہ آپ خلیفہ مقرر کر دیئے گئے۔

حضرت عثمان کے خلیفہ ہوتے ہی جہاں عوام کی امیدوں پر اوس پڑ گئی وہیں خود  
اکابر قریش نے بھی یہ محسوس کیا کہ وہ خود اپنے بنائے ہوئے جہاں میں پھنس گئے ہیں اس  
لئے کہ نئے خلیفہ کے انتھت کے وہ تمام راستے جو سارے قریش کے لئے کھلے ہوئے  
تھے صرف بنی امیہ کے لئے مخصوص کر دیئے مردان اور سعد بن العاص وغیرہ وزارت کی  
کرسیوں پر فائز ہو گئے صورتوں کی گورنری بنی امیہ کے سپرد کر دی گئی بیت المال ایک  
مخصوص خانوادہ کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ ظم اور زہیر کے سے عائد سلطنت نظر انداز  
کئے جائے گئے۔ بی بی عائشہ کی سی سیاسی قوت کو بھی پس پشت ڈال دیا گیا اور ان سلطنت  
دولت کی کھجور سمیت ایک مخصوص قبیلہ کے قبضہ میں آ گیا اور ماجرین قریش نے  
جس حکومت کو اپنانے کے لئے اللہ اور رسول کے احکام تک سے سر تابی کی تھی وہ  
حکومت بنی امیہ کی ایک ایسی خانہ لائی ملاک میں تبدیل ہو گئی جس میں قریش کے  
دوسرے گھرانوں کا کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

قریش کو حالات کے اس رخ پر جتنی مایوسی ہوئی اس کا مظاہرہ خود عبدالرحمن بن  
عوف کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو موصوف نے مرتے وقت ارشاد فرمائے تھے اور جن  
میں اس امر پر انتہائی افسوس اور پشیمانی ظاہر کی گئی تھی۔ کہ آپ ہی کی مسامی جیلہ کے نتیجہ  
میں حضرت عثمان مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ مقرر ہو گئے۔

قریش یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے علی کے مقابلہ میں عثمان کو خلیفہ بنا کر ایک بڑی  
کامیابی حاصل کی ہے لیکن واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کی یہی کامیابی ان کی ایسی  
عہرت انگیز شکست کا سبب بنی کہ حضرت عمر کے بعد قریش کے کسی قبیلہ کے کسی فرد کو  
تحت خلافت نصیب نہیں ہوا۔ اسلام کی بادشاہت یا تو بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی یا پھر  
بنی عباس کی شکل میں انہیں بنی ہاشم کو حاصل ہو گئی جن کو ابوان حکومت سے دور رکھنے

کی کوشش کی جاتی تھی۔ قریش کے دوسرے قبائل ہمیشہ کے لئے حکومت سے محروم ہو گئے اور یہ سب نتیجہ تھا اس خوفناک سیاسی فطرتی کا جو حضرت عثمان کو خلیفہ مقرر کر کے عبدالرحمن بن عوف نے کی تھی یا پھر عبدالرحمن بن عوف کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق دے کر ان حضرت عمر نے کی تھی جن کے سیاسی تدبیر اور دور بینی پر مسلمانوں کا سواوا عظیم آج تک ناز کرتا ہے۔

قریش کے سیاسی دیوالیہ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا کہ انہوں نے جس حکومت کے حصول کے لئے غدیر کے رسالت پناہی فرمان کو ٹھکرا دیا اور جسے باقی رکھنے کے لئے ان کے پاس مذہب کی بے پناہ قوت بھی موجود تھی اسے بھی وہ پندرہ سال سے زیادہ قائم نہ رکھ سکے اور آخر حص حکومت میں ایسی مملکت سیاسی فطرتی کر بیٹھے کہ ہمیشہ کے لئے ان کے اقتدار کا آفتاب غروب ہو گیا اور چند ہی سال میں نبوت یہاں تک پہنچ گئی کہ مکہ اور مدینہ کا وہ حکمران طبقہ جس کا اقتدار دنیا کے کئی ممالک میں مسلم تھا۔ خود مشن اور بغداد کے حکمرانوں کا محکوم ہو گیا اور سیاسی اعتبار سے ایسا مفلوج ہو گیا کہ اس کے لئے دوبارہ حصول اقتدار کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہا۔ اس کے برعکس امیر المومنین کا سیاسی تدبیر ملاحظہ فرمائیے کہ قریش اور بنی امیہ کی مشترکہ طاقتوں کے برخلاف آپ کو وہ حکومت مل کے رہی جس سے آپ کو محروم رکھنے کے لئے بے اصولی اور سازش کو جائز قرار دے رکھا گیا تھا اور خود اس قوم کو آپ سے حکومت کی درخواست کرنا پڑی جو پچیس سال تک آپ کو نظر انداز کرتی رہی تھی۔

حضرت عثمان کی حکومت نہ عوام میں مقبول تھی نہ خواص میں اسلامی تاریخ کا یہ دور صرف بنی امیہ کی لوٹ اور ستم رانیوں کی ایک دردناک داستان ہے۔ اس دور سلطنت میں مروان بن حکم، یحییٰ بن مینہ، مغیرہ بن شعبہ، ولید بن عقبہ، عبداللہ بن حاتم اور عبداللہ بن ابی مرثد کے سے بدترین افراد ملت پر حاکم ہو گئے جنہوں نے اپنی لوٹ

زراندوزی اور مظالم کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بے حد مشتعل کر دیا۔ عوام کا بیانہ صبر چھٹک پڑا، اصلاح حالہ کی جو کوششیں کی گئیں ان کو خود خلیفہ وقت نے برباد کر دیا اس لئے کہ حضرت عثمان کا یہ خیال تھا کہ وہ حضرت عمر کی سی سخت گیری پر عمل کر کے عوام پر قابو رکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان نے اپنے بیٹے کے لئے ان کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ حضرت ابوذر جلاوطن کر دیے گئے اور نیک لوگوں پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا گیا۔ سبھایہ گیا کہ اس تشدد کے نتیجہ میں عوام کو دہایا جائے گا لیکن

ع مرض پڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

سازش اور تشدد کے حربے چند دن تو کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتے، آخر ان کے خلاف عوام ابھرتے ہیں اور پھر عوامی غصہ کا سیلاب ایسا حیرت مند ہوتا ہے کہ بڑی بڑی طاقتوں کو ہمالے جاتا ہے۔ چنانچہ مصریوں کے ساتھ جو فریب کاری کی گئی اس نے بارود کے اس تودے میں دیا سلائی دکھا دی جو مسلمانوں کے دلوں میں تیار ہو چکا تھا۔ خلیفہ کا مکان گھیر لیا گیا اور مٹھی بھر مصریوں نے محض اس لئے بساط سلطنت الٹ دی کہ نہ قریش خلیفہ کا ساتھ دینے پر تیار تھے اور نہ انصار فرمانروائے وقت کے حامی۔ سارے مسلمان خلیفہ کے کردار و عمل سے رنج آچکے تھے اس لئے کوئی ان کی مدد کرنے پر تیار نہیں تھا اور جو لوگ مدد کر سکتے تھے ان کو دولت اور عشرت نے اتنا ناکارہ بنا دیا تھا کہ ان میں مصریوں کے مقابلہ کی سکت باقی نہیں رہی تھی، آخر حضرت عثمان قتل کر دیے گئے اور ان کی نعش کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ ان جذبات کا پورا مظہر ہے جو اس وقت کے مسلمانوں میں آپ کے حلق موجود تھے۔

آج کے مسلمان حضرت عثمان پر عقیدت کے جتنے چاہیں پھول برساتیں اور بنی امیہ کے دور میں گھڑی ہوئی احادیث کی بنیاد پر ان کی محبت کو جتنا چاہیں ضروری قرار دیں لیکن اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ دور اول کے ان مسلمانوں نے جو صحابہ اور

تاہمین پر مشتمل تھے نہ صرف یہ کہ حضرت عثمان سے عقیدت و محبت کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ان کو یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر کے آنے والی لٹلوں کے لئے بھی ایک سرمایہ عبرت اور ایک دعوت فکر چھوڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ چارے مقابلہ میں حضرت عثمان کے "نقصات و مناقب" ان کے کردار و عمل اور ان کے محاسن و مدارج کو زیادہ بہتر طریقہ سے جانتے تھے اس لئے فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت خلیفہ ثالث کی دستگیری کیوں نہ کی؟ ان کی فحش کی بے حرمتی کیوں قبول کی؟ ان کی موت پر اشک غم بہانے کے بجائے گھروں میں کیوں بیٹھے رہے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ عوام موصوف کی حکومت سے نکل آچکے تھے اور آپ کی حکومت کے جو کوائف عوام کے سامنے پیش ہوئے تھے انہوں نے عوام کو اس درجہ پریشان اور دلگیر کر دیا تھا کہ وہ آپ سے اور آپ کی حکومت سے نجات حاصل کرنے میں ہی اپنی سلامتی تصور کرنے لگے تھے۔

اس موقع پر ایک چیز اور قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان دونوں قتل کئے گئے۔ اگر یہ حضرات قوم میں ہر دلعزیز ہوتے تو ان کی موت پر یہی عوام کے جذبات بھڑک اٹھتے اور لوگ اس نظام حکومت کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے جس کے وہ علمبردار تھے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں حضرات کے قتل پر عام مسلمان بالکل خاموش رہے، ان کے جذبات میں کوئی تموج پیدا نہیں ہو اور جب بنی امیہ نے اپنے مخصوص سیاسی مصلح کے پیش نظر انتقام خون عثمان کا شور مچا کر ناپا اتو سارے سچے مسلمان ان کے مقابلہ میں تہج بکت ہو کے میدان میں آگئے اور آخر خود بنی امیہ کو یہ احساس ہو گیا کہ اس نام پر ان کا مقصد پورا ہونے والا نہیں۔ چنانچہ انہوں نے انتقام خون عثمان کا نعرو ترک کر کے حصول خلافت کی مہم کا نعرو بلند کر دیا۔ یہ چیز بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عثمان کا قتل مسلمانوں کی نظر میں کوئی

اصولی یا مذہبی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کی حیثیت عام مسلمانوں کے نزدیک اس قسم کے خالص سیاسی قتل کی تھی جس کا سابقہ عام طور پر ان بادشاہوں کو پڑا کرتا ہے جو اپنے عوام میں ہر دلعزیز کھنڈتھیچتے ہیں یا ایسی سخت گیروں سے کام لیتے ہیں جن سے عوام میں ان کے خلاف بیزاری اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

اسلامی دنیا کے ان پچھلے آشوب سیاسی حالات میں امیر المومنین خاموش پالیسی پر حامل رہے، اس لئے کہ حالات کا ہر نیا رخ اور سیاست کا ہر نیا موڑ آپ کی کامیابی کی دلیل بننا چاہتا تھا۔ مسلمان خود اپنے تجربات کی روشنی میں یہ دیکھ رہے تھے کہ اجتماع سے خلافت بنی تو اس نے گرانی اور جنگ کے دروازے کھول دیئے۔ نامزدگی کا اصول اختیار کیا گیا تو اس نے مسلمانوں کو معاشی بنیادوں پر اونچے اور نیچے طبقوں میں بانٹ دیا۔ نیز ان میں عربی و عجمی کا فرق پیدا کر کے باہمی منافرت کا بیج بویا اور سیرت شیعین کی بنیاد پر شوری کی راہ اختیار کی گئی تو بنی امیہ کے بدترین افراد امت پر حکمران ہو گئے۔ یہ باتیں اگر زبان سے کہی گئی ہوتیں تو ان پر کسی کو تھین نہ آتا بلکہ شاید پیغمبر کی ذات پر بھی یہ الزام عائد کر دیا جاتا کہ وہ اپنے خاندان میں حکومت مرکوز رکھنے کے لئے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں اس لئے امیر المومنین نے یہ چاہا کہ مسلمان خود "حکومت غیر معصوم" کا تراشا دیکھ لیں اور یہ تجربہ کر لیں کہ جب نبی کے پہلو تھین غیر معصوم کی حکومت یہ رنگ دکھا سکتی ہے اور اتنی فلفل ہو سکتی ہے کہ بالآخر عوام کو بغاوت اور خود ریزی کی راہ اختیار کر کے فرمانروائے وقت سے نجات حاصل کرنا پڑے تو دوسرے غیر معصوم حکمرانوں کی فرمانروائی جسے علی منہاج المومنین ہونے کا شرف بھی حاصل نہ ہو کیا گل کھلا سکتی ہے؟ امیر المومنین نے خاموش رہنے کے نہ صرف یہ کہ اس وقت کے مسلمانوں پر یہ ثابت کر دیا کہ حکومت الیہ کا کام وہی چلا سکتا ہے جسے نبی نے اللہ کے حکم سے اس امر عظیم پر مامور فرمایا ہے بلکہ پیشہ کے لئے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح فرمادی کہ سرکارِ دو عالم صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان خدا بر اسی غلوص اور بے لوثی پر مشتمل تھا جس غلوص اور بے لوثی پر شریعت کا ہر حکم مبنی تھا۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کی وصایت و ولایت کا جو اعلان فرمایا تھا اس میں خود قوم کی بھلائی تھی۔ رسولؐ یا تل رسولؐ کا اس میں کوئی ذاتی یا خانہ لانی فائدہ نہیں تھا۔

حضرت عثمان کا قتل جن حالات میں ظہور میں آیا وہ حد درجہ پر آشوب تھے مسلمانوں میں شدید ذہنی انتشار پھیلا ہوا تھا بغاوت کی تیز تند آمدنیوں نے مدینہ کے در و دیوار ہلا دیے تھے قریش کے اقتدار کا محل زمین بوس ہو چکا تھا۔ مصر اور بصرہ میں شورش کے آثار پورے طور پر نمایاں تھے۔ حاکم اور محکوم جو غیر اسلامی امتیاز سابقہ حکومتوں نے پیدا کر دیا تھا اس کے نتیجہ میں ہر سمت نفرت اور عناب کی چنگاریاں سنگ رہی تھیں۔ شام سے ملوکیٹ کا شیطان اپنے سینک برآمد کر رہا تھا۔ معاشی بنیادوں پر طبقات میں تقسیم کی ہوئی قوم طبقہ اعلیٰ کی زر کشی اور آنتاز سے تنگ آچکی تھی۔ عام مسلمان قرشی تاجروں اور جاگیرداروں کی حکومت برداشت کرنے پر تیار نہیں رہے تھے۔ خود قرشی اکابر کا یہ عالم تھا کہ وہ عوامی عناب کے اس سیلاب سے فخر فخر کانپ رہے تھے۔ ان میں سامنے آنے کی جرات نہیں تھی وہ اپنی دولت اور خزانوں کو بچانے کی فکر میں تھے اور سیاسی مطلع سے روپوش ہو جانے میں ہی اپنی سلامتی تصور کرتے تھے۔ بنی امیہ بھی اپنے اعمال کے نتائج سے لرزہ برائے نام تھے اور ان میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ پھرے ہوئے عوام کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکیں۔ ان حالات میں ایک سیاسی خلا سا پیدا ہو گیا تھا۔ کوئی شخص خلافت کی مسد سنبھالنے یا قیادت کا بار گراں اٹھانے پر تیار نہیں تھا۔ حضرت عثمان کا حشر سب کے سامنے تھا اور ایسی حالت میں وہ تمام مدعیان خلافت و دعوی داران قیادت خاموش تھے۔ جو ابھی کل تک مسد حکومت پر فائز ہو کر مستور ممالک کے خراج پر قابض ہونے اور دولت و سلطنت سے کھیننے کی تمنا میں

سرگرداں نظر آرہے تھے، قریش کی حکومت ختم ہو جانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے پر کرنے کے لئے کوئی آگے بڑھنے پر تیار نہیں تھا۔ ان حالات میں قوم کی نگاہیں اپنی قیادت کے لئے جس شخص کی طرف اٹھیں وہ امیر المومنین ہی کی ذلت گرا ہی تھی۔ امیر المومنین نے قبول خلافت سے انکار کیا اس لئے ہمیں کہ آپ قیادت کا بار گراں سنبھالنے سے احتراز فرما رہے تھے یا اس وقت کے حالات سے اسی طرح متوحش تھے جس طرح دوسرے اکابر قریش سرا سید و متوحش تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آپ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ رہے تھے کہ پچیس سال میں مسلمانوں کے نفوس بگڑ چکے تھے۔ ان میں حرص و آز کا مادہ بے حد بڑھ چکا ہے اور وہ اس الٹی نظام حکومت کو برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں جسے راج اور نافذ کرنا امام کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا۔ آپ یہ جانتے تھے کہ قریش اور بنی امیہ دونوں عوامی غصہ کا یہ سیلاب ختم جانے کے بعد اپنے اپنے اقتدار کی بازوئی کی جدوجہد کریں گے اور اس طرح دنیائے اسلام میں خانہ جنگی کا ایک دور شروع ہو جائے گا۔ آپ اس سے بھی واقف تھے کہ تین خلافتوں کے زمانہ میں جو حالات رونما ہوتے رہے ہیں ان میں مسلمان اپنا انقلابی جوش اور اسلامی اصولوں کی خاطر جذبہ جہاد کھوپکے ہیں اور اب ان میں یہ سکت نہیں ہے کہ وہ ایک خالص اصولی جنگ کے لئے میدان میں اتر سکیں۔ ایسی حالت میں آپ کے لئے خلاف قبول کرنا دراصل ایک بے سودی بات تھی اس لئے کہ اب وہ قوم ہی نہیں رہی تھی جس کی آپ امامت فرماتے۔ اب تو مسلمان کے نام سے ایک ایسی تھکی ہاری پریشان، سرا سید، حرص، بزدل اور بے اصول جماعت رہ گئی تھی جس میں از سر نو اسلام کا جذبہ پیدا کرنا، جہاد کا فوق ابھارنا، ایمان کی تربیت پیدا کرنا اور وہ حیات نو دوڑانا ضروری تھا جو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دور حیات میں پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ حکومت کی ذمہ داریاں قبول کرنے پر تیار نہیں تھے اور چاہتے

تھے کہ اپنا وقت تبلیغ و اشاعت دین اور تزکیہ قلب و نفس میں صرف فرمائیں لیکن جب مسلمانوں نے اصرار کیا تو آپ نے ان کو ملو اور زہر وغیرہ کو آزمانے کا مشورہ دیا تاکہ جن جن لوگوں کے دلوں میں تمہارے حکومت و قیادت چل رہی ہو۔ وہ سب اپنے دلوں کی حسرتیں نکال لیں اور اگر مصریوں کے خوف سے دلوں کے جذبے سرلا پڑ گئے ہوں تو کم از کم مسلمان یہ تو دیکھ لیں کہ جب مدینہ پر ہن برس رہا تھا، مل بٹ رہا تھا، لے لے لے لے دینے مقرر ہو رہے تھے، جاگیریں تقسیم ہو رہی تھیں اور عزت و شہرت کا بازار گرم تھا اس وقت مسلمانوں کی قیادت اور ملت کی سرداری کا دعویٰ کرنے والے شیراز سلطنت و عہدہ حکومت دراصل کتنے پانی میں ہیں اور ملت پر وقت پڑنے کے بعد ان لوگوں میں سے جنہوں نے خلافت اسلامیہ کے نام پر سونے چاندی کے خرچے جمع کر لیے ہیں وہ کون ہیں جو ملت کی دستگیری کے لئے آگے بڑھتے ہیں؟

امیرالمومنینؑ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کر کے مشرکوں کے ارکان بدو احد کے سوراخوں، بڑی بڑی احادیث فضیلت کے مالکوں اور مناقب و مدارج کے نام پر لے لے لے لے وصول کرنے والوں کو ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا کہ لب وہ آئیں اور مصری تکواریوں کی چھاؤں میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا امتحان دیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان حدیثوں اور مناقب کے واقعی سزاوار ہیں جو خوشامدیوں اور مطلب پرستوں نے ان کی شان میں گھڑ دی تھیں۔ ثابت کریں کہ وہ ان بڑے بڑے مخالف کے مستحق تھے جو وہ دور خلافت ثانی سے وصول کرتے رہے تھے۔ ثابت کریں کہ ان میں سیادت و قیادت کے وہ جو ہر موجود ہیں جن کے وہ مدینہ کے پرسکون ماحول میں دعوے کیا کرتے تھے اور اس پر آشوب دور میں خلافت کی ذمہ داریاں قبول کر کے یہ ثابت فرمائیں کہ وہ واقعی ملت اسلامیہ کے سچے بھائی خواہ اور اس کے حقیقی جان نثار ہیں۔ یہ ایک بڑا اہم اور دلچسپ سوال تھا جو امیرالمومنینؑ نے اٹھا دیا اور دنیا نے یہ دیکھ لیا کہ مالِ قیمتی کی تقسیم

کے وقت پیش پیش نظر آنا اور بات ہے، امور مملکت میں دخل ہو کر بڑے بڑے مناصب حاصل کر لینا اور بات ہے، اور مشکل کے وقت قوم کے لئے سینہ سپر ہو جانا، ملت کی خاطر جان جو حکم میں ڈال دینا اور پر آشوب حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے سینہ قوی کی ناخدا لئی کرنا بالکل دوسری بات ہے اور یہ کام صرف وہی شخص انجام دے سکتا ہے جسے قدرت نے اپنے چھینے فیض سے قیادت کی وہ صلاحیتیں عطا فرمائیں ہیں جن پر آئینہ ولایت گواہ ہے۔

خلیفہ کی تلاش میں ایک ہفتہ بیت گیا لیکن آج اتنی بڑی حکومت کا جو افغانستان کی سرحدوں سے افریقہ تک اور اورامہ النہر سے لے کر حد تک پھیلی ہوئی تھی کوئی حکمران یا وارث بننے پر تیار نہیں تھا۔ وہی اکابر قریش جن کی شجاعت کی داستانوں پر دنیا سرد سختی ہے مٹھی بھر مصریوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ آج وہ اس حکومت کو قبول کرنے سے کترارہے تھے جس کے لئے انہوں نے فرمان رسالت تک کو ٹھکرا دیا تھا۔ یہ ثبوت تھا اس امر کا کہ ان میں قوم کی قیادت کی نہ تو صلاحیت تھی اور نہ جذبہ۔ وہ سازش اور جوڑ توڑ سے پر امن حالات میں حکومت پر قابض ہو جانا تو جانتے تھے لیکن کٹھن وقت پڑ جانے پر قوم کو مصیبت سے بچانے، پیچیدہ حالات کو درست کرنے، مصائب کا مقابلہ کرنے اور امت مسلمہ کو چاہی سے نکالنے کے لئے جس ایثار جس جذبہ قربانی اور جس ذہانت کی ضرورت تھی وہ ان میں ناپید تھی۔ قوم نے اپنے ان نام نہاد اکابر کا تماشہ دیکھ لیا تو اس کی مہتابیانہ نگاہیں اور حسرت بھری نظریں اسی شخص کی جانب اٹھیں جسے اب ان حکومت سے دور رکھنے میں قریش کی سازش ذہانت چھتیس سال تک اپنی ساری قوتیں صرف کر چکی تھی۔ ساری قوم اس سے اپنی قیادت اور نجات کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئی اور اس طرح عملاً قوم نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ قوی زندگی میں ایک نازک موڑ آ جانے پر جو شخص اس کے سینہ کو پار لگا سکتا ہے وہ علیؑ ابن ابی طالب ہی



ہیں۔

مزعے کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مدینہ میں وہ طلحہ زبیر اور سہیلین وقاص بھی موجود تھے جنہوں نے ابھی کل کی بات ہے کہ سیرت شیعین کی پابندی کو شرط خلافت قرار دیا تھا لیکن آج؟۔۔۔ آج یہ شرط ختم ہو چکی تھی، صرف ختم ہی نہیں ہو چکی تھی بلکہ سرے سے بھلائی جا چکی تھی اور خود ان اکابر قریش نے بھی بھلا دی تھی جو اس شرط کے موحد تھے۔ یہ امیرالمومنین کی ایک عظیم اصولی فتح تھی، اس لئے کہ اس طرح عملاً یہ تسلیم کر لیا گیا کہ یہ شرط کوئی شرعی یا مذہبی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ یہ سوال صرف ایک سازش کے ماتحت اٹھایا گیا تھا اور اس کا مقصد محض اتنا تھا کہ قوم پر قریشی سرمایہ داروں کا راج قائم رکھا جائے۔

امیرالمومنین اگر قبول خلافت میں تاخیر نہ فرماتے تو اکابر قریش کی اس سازش کا حال نہ کھلتا اور شاید دنیا اس دھوکے میں رہ جاتی کہ سیرت شیعین پر عمل بھی کوئی مذہبی شرط ہے لیکن سیاست طلویہ کے قربان جانیے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خلافت کے شرعی مسئلہ میں اس بدعت کا خاتمہ کر دیا بلکہ دنیا پر یہ بھی واضح کر دیا کہ حکومت ایسی چیز ہے جس کے لئے صحابہ کرام تک شریعت میں بدعت کے مرتکب ہو سکتے ہیں اور محض اپنی مقصد بر آری کے لئے یا صاف الفاظ میں حصول حکومت کے لئے ایسی چیزیں ایجاد فرما سکتے ہیں جن کو دوسرے موقع پر خود انہیں کو مسترد کرنا پڑ جاتا ہے۔

امیرالمومنین کے اس طرز عمل نے اس وقت کے بزرگوں کے چروں پر پڑی ہوئی غلوں، بے لوثی، لیسیت اور سخاوت کی نقائیں اس خوبصورتی سے الٹ دیں کہ اب صاحبان نظر جو عقیدت کے بجائے عقل و بصیرت سے کام لینا جانتے ہوں، حقائق اور شخصیتوں کو برا گنندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور مزید بات یہ ہے کہ امت نے امیرالمومنین کی ذات پر

”اعلاء“ کیا لیکن امیرالمومنین نے اس اعلیٰ کا فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ طلحہ زبیر اور دوسرے اکابر قریش نے ”شوری“ کے ذریعے آپ کی خلافت کا فیصلہ کیا لیکن آپ نے اسے بھی مسترد کر دیا۔ سیرت شیعین کا سوال اٹھانے کی تو کسی میں بہت ہی نہیں ہوئی لیکن اس باب میں آپ کا جو فیصلہ تھا اس سے دنیا واقف ہے۔ ایسی حالت میں آپ نے قوم کے ساختہ پرداخت ہر اصول خلافت کو مسترد کر دیا لیکن قوم نے پھر بھی خلافت آپ کے سپرد کی اور بعد اصرار سپرد کی۔ جو سیاست طلویہ کا ایک بے نظیر نمونہ اور آپ کی ایک عظیم الشان اصولی فتح ہے۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ خلافت سازان امت ہارنے اور علی جیتنے علی نے اعلیٰ کو بھی نہیں مانا۔ شوری کو بھی نہیں مانا۔ مزوگی کو بھی نہیں مانا۔ انتخاب خلافت کے سلسلہ میں قریش کے وضع کردہ ہر ”اصول“ کو ٹھکرایا اور قریش نہ صرف یہ کہ خاموشی سے یہ تقاضا دیکھتے رہے بلکہ انہوں نے اپنے ان مزعمات کی ٹھکت کے باوجود علی کی بیعت کی اور اس طرح اپنے عمل سے یہ قبول کر لیا کہ ان تمام شرائط کا دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ تو سب حصول حکومت کی تدبیریں تھیں جس وقت جس ترکیب سے کام نکل سکتا تھا اس وقت وہ ترکیب اختیار کر لی جاتی تھی اور مقصد بر آری کے بعد اسے فراموش کر دیا جاتا تھا۔ سوال نہ دین کا نہ ملت کا مقصد جو کچھ تھا وہ حکومت کا تھا۔

امیرالمومنین کو چھتیس سال تک ایوان حکومت سے ضرور دور رہنا پڑا لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ چروں پر پڑی ہوئی نقائیں الٹ گئیں۔ عدالت صحابہ کا ڈھونگ ختم ہو گیا اور کم از کم عقل و بصیرت رکھنے والوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ کون کیا تھا اور صدر اسلام کی سیاسی زندگی جسے اعلیٰ اصول پروری اور اسلامیت کا منظر اتم قرار دے کر علی منہج النبوة کے معزز لقب سے نوازا دیا گیا ہے جس حکومت مطلب بر آری، زراعت و زری، سازش اور بے اصولی کے کتنے فتنوں سے آلودہ ہو چکی تھی۔

## خلافت ظاہری

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو اس وقت خلافت حاصل ہوئی جب قوم میں اتحاد تھا، قوت تھی، ابھرنے کا جذبہ تھا زندگی اور جوش تھا انقلاب اور مصلحت کی تڑپ تھی، عزائم بلند تھے، ہمت مضبوط تھی حالات پر سکون تھے، فیض صحبت رسولؐ سے اخلاق بلند تھا، نظم اعلیٰ تھا اور عوم میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک زندہ، جوان اور ابھرتی ہوئی قوم میں موجود ہوا کرتی ہیں ایسے حالات میں قوم کی قیادت سنبھال لینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ ان حالات میں قیادت کا استحصال بس اس چیز میں ہوتا ہے کہ قوم کی صلاحیتوں کو ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ ان صلاحیتوں کو تعمیری کاموں میں استعمال کر کے قوم کے معیار زندگی کو بلند اور اس کی ذہنی روحانی اور اخلاقی حیثیت کو برتر بنایا جائے اور اس کی قوتوں کا زیادہ سے زیادہ استحکام کیا جائے تاکہ وہ غلط راہوں میں برباد نہ ہو جائیں اس کی عظیم جن اصولوں پر کی گئی ہے ان کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں آگے بڑھایا جائے اور اسے مذہبی، ذہنی اور روحانی ارتقاء کی ان راہوں پر گامزن رکھا جائے جن پر چل کر وہ عروج کی حوصلے طے کر سکے۔ جب ہم اس زاویہ سے ان حضرات کی خلافت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی کے سوا اور کچھ دستیاب نہیں ہوتا ہم یہ ضرور دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے چھ ملک فتح کر لئے اور ان فتوحات کے نتیجے میں ان کا برسر اقتدار طبقہ کافی مالدار ہو گیا لیکن ظلم للاقوام کے ماہرن یہ جانتے ہیں کہ ایک زندہ طاقتور اور ابھرتی ہوئی قوم کا چھ ممالک فتح کر لینا نہ کوئی بڑا کارنامہ ہے اور نہ اس قوم کے قائدین کی اعلیٰ صلاحیت کا کوئی ثبوت۔ اس لئے جب بھی کوئی قوم زندگی اور ظلم کی قوتوں سے

ہمکنار ہوتی ہے تو وہ اپنا دائرہ اثر وسیع کرتی ہے اس کے ارد گرد کی کمزور قومیں جو پیش پرستی یا بد نظمی کا شکار ہوتی ہیں اس کے سامنے کھٹے ٹیک دیتی ہیں اور وہ ایک وسیع حصہ ارض کی مالک بن جاتی ہیں ہر ابھرتی ہوئی قوم کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے اور آتا رہتا ہے۔ رومن ابھرے تو یورپ اور شمالی افریقہ پر چھا گئے ایرانی ابھرے تو مشرقِ قریب پر ان کا پرچم اقبال لہرانے لگا انگریز ابھرے تو ان کی سلطنت میں آفتابِ غروب ہونا بند ہو گیا۔ آتاری ابھرے تو ساری معلومہ دنیا پر قابض ہو گئے روسی ابھرے تو اوسمی دنیا پر ان کا سکہ رواں ہو گیا یہی دنیا کا دستور اور علم للاقوام کا کلیہ ہے اس لئے محض چند ممالک کی فتح کو حضرت ابو بکر و حضرت عمر کی قیادت کی کامیابی قرار دینا حقیقت پسندی کا مظاہرہ تو کہا جاسکتا ہے حقیقت پسندی یا ظلم تاریخ سے واقفیت کا مظاہرہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا مسلمان ایک ہی اور ابھرتی ہوئی قوم تھے ان لئے ان کی قیادت کسی کے ہاتھوں میں ہوتی تو وسیع مملکت کا کام ضرور انجام پاتا۔ قوم اپنا دائرہ اثر ضرور وسیع کرتی۔ اس پاس کی قوموں پر غلبہ ضرور حاصل ہوتا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں ہے اور اس پر قیادت کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنا بالکل غلط ہے۔

ہمارے سامنے کی بات ہے کہ ہر نظر کی قیادت میں جرمنوں نے پولینڈ، چیکو سلواکیہ، یوگوسلاویہ، ہالینڈ، بلجیم، فرانس، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ اور آرمینیہ روس پر قبضہ کر لیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہنر کی قیادت کو محض اس بنیاد پر کامیاب کہا جاسکتا ہے؟ اور کیا جرمن قوم کی جہاں کی تمام ترقی داری سے ہنر کو عمدہ برآ کیا جاسکتا ہے؟

جنرل ٹوڈو کی قیادت میں جاپانیوں نے مشرقِ چین، فلپائن، انڈونیشیا، ہندوستان، ملائیشیا، سنگاپور اور برما تک پر قبضہ کر لیا لیکن کیا اس تسخیر ممالک پر جنرل ٹوڈو

کو ایک کامیاب قائد کہا جاسکتا ہے؟ اور کیا اس کی قیادت کا یہ نتیجہ نکلا کہ بلاخر چلیان کو امریکہ کے سامنے ٹھکوی کا سر جھکا دینا پڑا؟

یہ دو مثالیں ہی اس کا ثبوت ہیں کہ کسی قیادت کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ فتوحات پر نہیں کیا جاتا۔ اس کا فیصلہ نتائج کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی نئی اور طاقت سے بھرپور قوم نے چار ممالک ضرور فتح کر لئے لیکن محض چھتیس سال کے اندر ہی یہ قوم جسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نظم و اتحاد کا مرقع اور قوت و سطوت کی نشانی بنا دیا تھا خانہ جنگی، بغاوت، بد امنی، جلال باہمی جمود اور بزدلی کا شکار ہو گئی اسے جن بلند و برتر اصولوں کی بنیاد پر متحد کیا گیا تھا وہ اس کی نگاہوں سے لوجھل ہو گئے اس کا جذبہ جماد ختم ہو گیا اس کی قوتیں بکھر گئیں وہ ایک عضو مفلوج بن کر رہ گئی اس کی ترقی کی راہیں مسدود ہو گئیں وہ ایک گم کردہ راہ کاروں میں تبدیل ہو گئی اس کا مقصد حیات فنا ہو گیا وہ زمین پر اللہ کی بلا شہادت قائم کرنے کی بجائے خود اموی اقتدار کے سامنے سرنگوں ہو گئی عادلانہ تقسیم دولت کی تبلیغ کے بجائے زراعت و زری کا شکار ہو گئی اور اسلام کے اس عظیم نظام زندگی کو بھی فراموش کر بیٹھی جو اس کی زندگی کا مقصود اور اس کی حیات ارضی کا نصب العین تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو قوم چھوڑی تھی وہ دلیر تھی جفاکش تھی صاحبِ عزم تھی ہمت ور تھی اور معروفیت یا شکست خوردگی کے احساس سے کوسوں دور تھی لیکن صرف چھتیس سال کے اندر وہ ایسی بدلی کہ مٹی بھر مصریوں نے مدینہ میں غدر برپا کر دیا اور مدینہ والے انتہائی بے بسی کا مظاہرہ کرتے رہے بنی امیہ کے گورنر ملک میں لوٹ پھرتے رہے اور وہی مسلمان جو ابھی کل تک خلیفہ وقت تک کو ٹوک دینے کی جرات رکھتے تھے ان بدترین افراد تک

کے مقابلہ میں بے بس اور خاموش تھے حرص دنیا کن پر اتنی غالب آچکی تھی کہ لبِ معاویہ ان کو نگوں میں خرید سکتے تھے عزم و ہمت ان سے اس درجہ مفقود ہو چکا تھا کہ ابو موسیٰ اشعری کے جیسے بڑے لوگ شمشیرِ آہن کی بجائے لکڑی کی تلوار لگانے کو فضیلت دے رہے تھے اور ان کے دل اس درجہ کمزور پڑ چکے تھے کہ میدان سے فرار اور جلا سے گریز ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی لب نہ تو قوم میں نظم تھا اور نہ اتحاد تھا نہ عالمی ہمتی تھی نہ اللاک پر کند ڈالنے کا عزم تھا نہ باطن سے پیچہ کشی کی امنگ تھی نہ شیروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینے کی جرات تھی نہ مقاصد پر عزم تھی نہ انقلابِ اسلامی کو عالمگیر بنانے کی آرزو تھی نہ اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے کا جذبہ تھا نہ اپنے حقوق کے تحفظ کی قوت تھی نہ حیات کا ولولہ تھا نہ زندگی کا جوش تھا نہ خداکاری کا ذوق تھا نہ قرابتوں کی لگن تھی اور نہ اسلام کی اشاعت کا وہ شوق تھا جس نے ان کو بدرو اور کے میدانوں میں سرفروشی پر تیار کیا کر دیا تھا اس کے برعکس ان میں ایک لامتناہی جمود تھا ایک عام احساس شکست خوردگی تھا ایک نہ ختم ہونے والی حکمت تھی ایک بے پناہ باپوسی اور افسردگی تھی ایک پہپائی کی سی کیفیت تھی ایک انتشار کا عالم تھا وہ زندگی سے لستے دور ہو چکے تھے کہ ان میں اسلامی دنیا کی سیاست سے ایک خاص قسم کی بے تعلقی پیدا ہو چکی تھی اور قوم ان تمام اخلاقی و روحانی اقدار سے محروم ہو چکی تھی جو ایک ذمہ اور ابھرتی ہوئی قوم کی نشانی کسی جاتی ہیں قوم کی قوتیں جنگ آزادی اور کشور کشائی میں ضائع ہو چکی تھیں اس کی اعلیٰ اخلاقی صلاحیتیں مرہ ہو چکی تھیں وہ احساسِ حسرت سے اس درجہ محروم ہو چکی تھی کہ ہزاروں صحابہ کی نگاہوں کے سامنے نلوکیت و قیصریت کا آغاز ہوا اور انہوں نے صرف یہ اسے روکا نہیں بلکہ خاموشی سے اسلام کے قیصر امیر معاویہ کی

بیعت کرلی۔ اس کا وہی جذبہ اتنا مٹ چکا تھا کہ پزیرنے اس سے غلامی پر بیعت طلب کی اور اس نے یہ مطالبہ بے چوں و چرا قبول کر لیا اس کا قلم اس حد تک بگاڑ چکا تھا کہ اس کا تیسرا خلیفہ قتل کر ڈالا گیا اور وہ بے بسی سے تماشا دیکھتی رہی اور زبردستی کی اتنی شوگر ہو چکی تھی کہ چند بیویوں کی خاطر آل رسول پر حیراً برداشت کرتی رہی، اس کا وہ سارا ولولہ اور وہ ساری گری ختم ہو چکی تھی جس کے بل پر اس نے قیصر کے سر سے تاج اور کسری کے قدموں سے تخت چھین لیا تھا اب وہ ایک مردہ اور بے حس قوم تھی اور یہ نتیجہ تھا بچتیں سال کی اس قیادت کا جس پر عقیدت کے مارے مسلمان آج تک ناز کیا کرتے ہیں۔

بچتیں سال میں چند ممالک ضرور فتح ہو گئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ :-

۱۔ مسلمانوں میں حکمرانی اور انتظام کی کتنی صلاحیت پیدا ہوئی تھی؟  
 ۲۔ ان میں اس عظیم سلطنت کو باقی رکھنے کی کتنی قابلیت پیدا کی گئی؟  
 ۳۔ ان کی علمی اور ذہنی زندگی کا کیا حشر ہوا؟ ان کا تعلیمی معیار کس حد تک بلند کیا گیا؟

۴۔ ان میں اسلامی دعوت کو عام کرنے کی صلاحیت کس حد تک بیدار کی گئی؟

۵۔ عوام کی معاشی اور اخلاقی حیثیت کس حد تک بہتر بنائی جا سکی؟

۶۔ وہ تمدن، تہذیب، علم اور حکمت میں معاصر اقوام سے کیوں پیچھے رہ گئے؟

۷۔ ان کا وہ وہی ولولہ کیا ہوا جس نے ان میں پہاڑوں کا ثبوت اور فولاد کی صلہ پیدائی تھی۔ ان سوالات کے جواب پر ہی اس قیادت کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہو جاتا ہے؟

قوم کی حالت بہتر تھی تو ہر شخص قبول خلافت کا تمنا ہی تھا لیکن حالات بگڑے تو سارے مدعیان خلافت گھروں میں پھسپ کے بیٹھ رہے ان حالات میں

وہی شخص آگے بڑھا جس میں ہر قسم کے حالات میں قوم کی قیادت کی صلاحیت موجود تھی، امیرالمومنین کی کامیابی کی اس سے روشن دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج قوم ان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی ان کو مدد کے لئے پکار رہی تھی ان کا واسن تمام رہی تھی اور اس وقت جبکہ اس کے سارے سارے ٹوٹ چکے تھے امیرالمومنین ہی کی ذات گرامی کو اپنا آخری آسرا قرار دے رہی تھی۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے خلافت ظاہری قبول فرمائی تو آپ کے سامنے متعدد مسائل تھے۔

۱۔ مدینہ کے حالات کو احتیاط پر لانا اور مصیبتوں کے غصہ کو ختم کرنا۔

۲۔ بنی امیہ کے ان احکام سے ملت اسلامیہ کو نجات دلانا جو امت کا خون چوس چوس کے اسے تباہ کئے دے رہے تھے۔

۳۔ قوم کے داخلی انتشار کو ختم کرنا۔

۴۔ مسلمانوں میں دولت اور نبل کی بنیاد پر طبقاتی تقسیم پیدا ہو گئی تھی اسے ختم کر کے وحدت اسلامیہ کو بحال کرنا۔

۵۔ اسلامی دعوت انقلاب کی تعلیم کو عام کرنا تاکہ امت جو فتوحات اور زراعت و زری میں جتلا ہو کر اس دعوت کو تقریباً فراموش کر چکی تھی دوبارہ اس کے اساسی تصورات سے آگاہ ہو جائے اور مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت ضرور ایسی پیدا ہو جائے جو ہمیشہ اسلام کی سچی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتی رہے۔

امیرالمومنین نے خلافت بسمائے ہی مدینہ میں امن قائم کروا اور مصیبتوں کو تسکین دے کر شہری زندگی بحال کر دی آپ کی سیاسی اور انتظامی قابلیت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا جس میں آپ نے زبردست کامیابی حاصل فرمائی۔

آپ نے دو سزا کام یہ کیا کہ حضرت عثمان کے بہت سے ایسے اشران کو

معزول کر دیا جو امت کے لئے وہاں جان ثابت ہو رہے تھے آپ پر یہ اعتراض شدت سے کیا جاتا ہے کہ آپ نے ان افسران کو معزول کر کے سیاسی ظلم کی لیکن یہ اعتراض کرنے والے خود اپنی سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دراصل اسی اعتراض کو اندھا دھند دہراتے چلے جاتے ہیں کہ جو سیاسی اور انتظامی صلاحیتیں رکھنے والے عربوں نے آپ پر کیا تھا اگر وہ ایک ذرا سے تفکر و فکر سے کام لیں تو ان کو خود یہ محسوس ہو جائے گا کہ ان کا یہ اعتراض سرے سے عمل اور آپ کا اقدام انتہائی مصلحت اور سیاسی دوراندیشی پر مبنی تھا اس لئے کہ:-

۱۔ ان ظالم، لیرے اور تلافی حکام کی برطرفی کے نتیجے میں مملکت میں سکون پیدا ہو گیا اور وہ شورش و بگڑی ہو گئی جو حضرت عثمان کے عہدِ آخر میں پیدا ہو گئی تھی۔

۲۔ ان صوبہ داروں کی برطرفی کے نتیجے میں حجاز، یمن، عراق، ایران اور مصر وغیرہ پر آپ کا تسلط ہو گیا ورنہ ان صوبوں میں بھی وہی ہوتا جو شام میں ہوا اور حضرت عثمان کے رشتہ دار اموی حکام ان علاقوں میں بھی بغاوت کر دیتے اور اس کے نتیجے میں اسلامی سلطنت کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا آپ کے اس اقدام کے نتیجے میں مملکت کی سالمیت قائم رہی ورنہ وہی ہوتا جو عباسیوں کے آخری دور میں صوبہ داروں نے کیا اور اس سے نہ صرف یہ کہ مملکت اسلامیہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی بلکہ مسلمانوں کی مرکزی حکومت چاہے ہو جانے کے نتیجے میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ متوجہ علاقے پھر اپنے سابق لیویان پر پلٹ جاتے اس لئے کہ ان علاقوں میں اسلام کا جو کچھ اثر تھا تلوار کی وجہ سے تھا، تبلیغ یا فطرت کی بدولت نہیں تھا اور ایسی

حالت میں اس کا پورا امکان تھا کہ مرکز خلافت کمزور ہو جانے کے نتیجے میں یہ علاقے اسلام سے روگرداں ہو جاتے۔

۳۔ شام میں اموی حکومت کے قیام اور مدینہ کی دینی مرکزیت کمزور ہو جانے کے نتیجے میں دنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ اسلام میں درجنوں فرستے بن گئے ہزاروں جھوٹی احادیث گھڑی گئیں، تفسیر پر یونانی فلسفہ کا اثر غالب ہو گیا روایات میں اسرائیلی خرافات داخل ہو گئیں اور عقائد و احکام کی دنیا میں دلولہ سا آ گیا لب ایک ذرا قیاس کیجئے کہ اگر یمن، ایران، مصر، عراق سب جگہوں پر مطلق العنان اموی حکومتیں بن جائیں اور مدینہ کے اثرات کا بالکل خاتمہ ہو جاتا تو کیا نتیجہ ہوتا؟ اسلام کیا رخ اختیار کر لیتا عقائد و احکام میں کیسی تبدیلیاں ہو جاتیں اور یہ خانہ جنگی مسلمانوں کو تو الگ رکھیے خود اسلام کو کس درجہ چاہ کر دیتی؟

۴۔ امیر معاویہ یا طلحہ و زبیر کی سرکوبی کے دوران میں ان ناقابل اعتماد گورنروں کی موجودگی حدودِ مملکت ثابت ہو سکتی تھی اس لئے کہ یہ لوگ معاویہ کی شہ پر اس دشمنی کے نتیجے میں جو بنی امیہ کے دلوں میں اسلام کے خلاف موجود تھی اسلامی فوجوں کی بیخ میں چھرا گھونپ دیتے۔ امیرالمومنین کی رسد اور تک کٹ دیتے یا جگہ جگہ بنادیں کر کے مسلمانوں کی قوت اچھی متحضر کر دیتے کہ شامی فوجیں کامیاب ہو جائیں اور شامی عیسائی دنیا سے اسلام کا خاتمہ کر دیتے۔

۵۔ دنیا کا کوئی عقلمند حکمران صوبوں پر ایسے حکمرانوں کو قائم نہیں رکھتا جو اس کے مخالف یا دشمن ہوں ایسا کرنا خود اپنے ہیروں پر کھماڑی چلانے کے مترادف ہوتا ہے۔

۶۔ اگر آپ ان اموی افسروں کو برطرف نہ کرتے تو عقوبتہ علاقوں کے عوام لازمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے کہ اسلام کا مقصد غیر عرب علاقوں کو لوٹنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اس طرح ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف بیزاری پیدا ہو جاتی۔

۷۔ اموی حکام کی موجودگی میں آپ وہ علمی اخلاقی اور روحانی اصلاحات عمل میں نہیں لاسکتے تھے جو آپ کا مقصد اصلی تھیں۔ بنی امیہ کی جماعت دین واری دین سے بیزاری اور اخلاقی و نیت دنیا کو معلوم ہے ظاہر ہے کہ ان کے ذریعے کسی روحانی یا علمی تحریک کو پروان چڑھانا کھٹا ناممکن تھا اس لئے ان کی برطرفی ایک اصولی حکومت کے لئے ضروری تھی۔ ایسی حالت میں آپ نے وہی کیا جو ایک ہوشیار مرد کو کرنا چاہئے اور آپ کے اس اقدام پر وہی لوگ اعتراض کر سکتے ہیں جو یا تو خود سیاسی اقتدار سے دیوالیہ ہیں یا پھر محض مخالفت برائے مخالفت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آپ کے سامنے تیسرا اہم سوال اس داخلی انتشار کو دور کرنے کا تھا جو دنیائے اسلام میں پیدا ہو چکا تھا۔ منہ میں مصریوں کی بظاہر دراصل اسی اندرونی خلفشار کا ایک مظہر تھی، مسلمانوں کا نظم و احوال برباد ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بغاوت و سرکشی کے جذبات نے لے لی تھی مصر اور بصرہ کے لوگوں کا منہ پر چڑھ آنا اسی ذہنیت کا مظہر تھا خلیفہ خاتم کی کمزوری اور مسلمانوں کے اخلاق کا زوال اس داخلی انتشار کے سب سے بڑے اسباب تھے چنانچہ یہ خلیفہ خاتم کے دور میں پروان چڑھ چکا تھا امیرالمومنین کے دور میں ایک تباہ و برباد کی شکل اختیار کر گیا اور جمل و شہوان اسی کے دو مختلف مناظر تھے۔

یہ دونوں بغاوتیں مسلمانوں کا نظم ختم ہو جانے کا پتہ دے رہی تھیں۔ امیرالمومنین

نے ایک کامیاب فہر اور ایک دور بین قائد کی حیثیت سے یہ ضروری تصور کیا کہ اس داخلی فتنہ کو اتنی سختی سے کچل دیا جائے کہ انتشار پیدا کرنے والی طاقتوں کی کمرٹوٹ جانے اور ملک میں امن و امان قائم ہو جائے چنانچہ جملی اور شہوان کے میدانوں میں جو کچھ ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے ہانپوں کی پوری طرح سرکوبی کر دی گئی اور عربوں پر یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ وہ شخص جو مسلمانوں پر باپ سے زیادہ رحیم ہے فتنہ پردازوں اور خلافت اسلامی کو داخلی انتشار کا شکار بنانے والوں کے مقابلہ میں فولاد سے زیادہ سخت بن جانے کی قوت رکھتا ہے اور اس کی حکومت کو داخلی فتنہ کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے اس سخت گیری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں امن قائم ہو گیا اور پھر آپ کے دور سلطنت میں کسی کو بغاوت کی جرأت نہیں ہو سکی یہاں ہم نے امیر معاویہ کے خلاف جنگ کا ذکر دانستہ طور پر نہیں کیا اس لئے کہ یہ جنگ "داخلی خطرہ" سے تعبیر نہیں کی جاسکتی۔ یہ دراصل ایک "بیرونی حملہ آور" کے خلاف جنگ تھی اس لئے میدان معین میں امیرالمومنین "مسلمانوں" نے نہیں لڑ رہے تھے شاہی بیسیائیوں اور ان بنی امیہ سے لڑ رہے تھے جنہوں نے کبھی دل سے اسلام قبول نہیں کیا تھا امیر معاویہ کے نام لپنے تاریخی حکایت میں آپ نے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں فرمادی ہے کہ آپ امیر شام کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے ایسی حالت میں شامیوں کے خلاف آپ کی جنگ دراصل ایک بیرونی دشمن کے خلاف جنگ تھی اور اسے اندرونی خلفشار میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک داخلی نظم و ضبط مملکت کا تعلق تھا اس میں آپ بالکل کامیاب ہوئے اور قریش و خزرج کے فتنوں کا آپ نے سدباب کر دیا۔

مسلمانوں میں دولت اور نسب کی بنیادوں پر مختلف طبقات وجود میں آئے

تھے اور اسلامی مساوات چاہے مسجد کے اندر باقی رہی ہو لیکن روزِ مہو کی عملی زندگی میں ختم ہو گئی تھی حضرت عمر نے مسلمانوں کو امیر اور غریب، عرب اور عجم، قریش اور غیر قریش میں تقسیم کر دیا تھا امیرالمومنین نے نسل و نسب اور دولت کے ان جوں کو پاش پاش کر ڈالا آپ نے قریش اور اکابر ملت کی شدید مخالفت کے باوجود تقسیم بالوسیع کا دستور جاری فرمایا اور اس طرح معاشی مساوات کے اس نظریہ کو جسے آج ساری دنیا اپنانا چاہتی ہے لیکن اس میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے اپنی پوری مملکت میں نافذ فرما دیا۔ آپ نے عرب و عجمی امتیازات کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس طرح مسلمانوں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں حقیقی مساوات قائم فرمادی۔

معاشی اور معاشرتی مساوات کا قیام اس دور میں کوئی آسان کام نہیں تھا اس کے نتیجے میں آپ کو اشراف قریش سے زبردست ٹکرائو پڑی لیکن ایک عظیم اصلاح کی خاطر آپ نے کسی مخالفت کی پروا نہیں کی اور اپنے اصلاحی مقاصد کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے یہ آپ کی بے پناہ قائدانہ صلاحیتوں کا ایک بے نظیر مظاہرہ تھا اس لئے کہ ایک ایسی قوم جو امتیازات کی عادی ہو چکی تھی اپنا نظم و ضبط کھو چکی تھی اور جس میں رحمت پرند عناصر زبردست اثرات کے مالک تھے اتنی بڑی اصلاح کے وجود میں لے آنا (جو آج کی ترقی یافتہ حکومتوں کے لئے ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے) انتہائی مشکل کام تھا آپ نے اس باب میں قیادت کی ایسی بلند پایہ صلاحیتوں کا مظاہرہ فرمایا جنہیں مجروح سے تعمیر کیا جاسکتا ہے اور بلاخوف ترویج یہ کہا جاسکتا ہے کہ سلفی اور معاشی اصلاحات کے میدان میں آپ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی مثال آج تک دنیا پیش کرنے سے قاصر رہی ہے۔

امیرالمومنین کی ان عظیم اصلاحات کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم ان حالات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جن سے آپ کا سابقہ تھا ساڑھے چار سال کی مختصر سی مدت حکومت اور پھر اس میں بھی چھوڑ لڑائیاں، پر آشوب حالات، قریش کے باغیانہ تیور، شامیوں کی یورش، خوارج کی جنگ آزمائی، زبردستی کا دور، جمل اور دنیا داری، فرض حالات ایسے تھے جن میں کسی اصلاحی اقدام کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی لیکن یہ تھا کمال قیادت کہ آپ نے ان حالات میں بھی وہ کرد رکھایا جو آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی حکمرانوں سے ممکن نہیں ہو رہا ہے۔ سلفی اور معاشی مساوات کی باتیں تو دنیا میں بہت ہوتی ہیں لیکن آج تک یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا لیکن امیرالمومنین نے بغاوتوں اور ہنگاموں کے دور میں بھی اس خواب کو حقیقت بنا دیا تھا جو آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا اعجاز آفرین نمونہ ہے۔

خلافت حاصل ہوتے ہی آپ نے مدینہ میں امن قائم کر دیا اور بلوائی منتشر ہو گئے۔ مدینہ والوں کو سکون میسر ہوا تو قریش کے مفاد پرست قائدین کی جان میں جان آئی گشدرہ حواس درست ہوئے اب جو انہوں نے دیکھا تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی خلافت اس شخص کے ہاتھوں میں تھی جو ان کے قبائلی مفادات کا علمبردار نہیں تھا جس کی حکومت ان کی زراعت کی ہم میں معلول نہیں ہو سکتی تھی جو ان کو بغیر عمل، فضائل و مناقب کا مستحق ماننے پر تیار نہیں تھا۔ جوان کی شان میں گھڑی ہوئی اداوت پر ایمان لائے ان کو عوام کی دولت سے کھینچنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا جو ان کو نسب کی بنیاد پر مستحق حکومت تسلیم نہیں کرتا تھا جو محض خاندانوں کی بنا پر ان کی شرافت یا لمارت یا ارستقراویت کا قائل نہیں تھا جو ان کو عجمیوں اور مویلوں سے بدتر قرار دینے پر تیار نہیں تھا بلکہ سب

مسلمانوں کو مساوی حقوق عطا کرنے پر مہر تھا جو ان کی ذرا اندوہی، شان و شوکت، مملکت کی تعمیر اور نمائش دولت کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ دولت کے معاملہ میں سارے مسلمان برابر ہو جائیں جو صرف قریش کو صوبوں کی گورنر اور جاگیروں کا مستحق ماننے پر تیار نہیں تھا اور جس کی حکومت باقی رہنے کے معنی یہ تھے کہ قریش نے اپنی تین حکمرانوں کے دور میں جو کچھ حاصل کیا تھا عوام کو اللہ اس اور جمل میں جٹا کر کے جو کچھ پلایا تھا وہ سب ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال قریش کے لئے ناقابل برداشت تھی ان کے لئے یہ تصور بھی موجب تکلیف تھا کہ اب عجم اور موالی بھی ان کے ہم پلہ قرار دیئے جائیں گے یہ ان کے نسبی غرور کے مٹانی تھا۔ پھر ان کے تاجرانہ مفادات کے لئے حدود چھوڑنا پڑا ہو گیا اس لئے انہوں نے یہ چاہا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنا اقتدار بازیاب کیا جائے اپنی لٹی ہوئی مسد قیادت دوبارہ بچھائی جائے اور وہ حکومت قائم کی جائے جو ان کے نسبی اور تاجرانہ مفادات کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکے بد قسمتی سے ان کو اپنی اس تحریک بازیابی اقتدار کی حمایت و سرپرستی کے لئے حضرت عائشہ مل گئیں جو ایک شدید جذباتی خاتون تھی اور حضرت علی سے اس لئے لئے دشمنی رکھتی تھیں کہ:-

۱۔ آپ حضرت خدیجہ کے والد تھے اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ کی تعریفیں کیا کرتے تھے اس لئے حضرت عائشہ نے خود اس کا اعتراف فرمایا ہے کہ آپ کو ان سے سخت جلن ہو گئی تھی۔

۲۔ آپ رسول اللہ کو حدود مجیب تھے اور یہ چیز حضرت عائشہ کو حدود ناگوار تھی اس لئے کہ موصوفہ یہ چاہتی تھیں کہ آپ ہی رسول اللہ کی تمام تر توجہات کا مرکز رہیں۔ چونکہ آپ کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور سرور

کائنات صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی سے محبت فرماتے تھے اس لئے آپ کو حضرت علی سے شدید دشمنی ہو گئی تھی۔

۳۔ حضرت عائشہ یہ بھی جانتی تھیں کہ حضرت علی کی حکومت میں آپ کو بارہ ہزار درہم کا وہ منکر انظار و عقیدہ حاصل ہونا ناممکن ہے جو حضرت عمر نے آپ کے لئے مقرر کروا تھا۔

۴۔ حضرت عائشہ میں اقتدار پسندی کا جذبہ بے حد تھا اور دوسرے خلفاء کے زمانہ میں آپ کی جس انداز میں نازیرواری ہوئی رہی تھی اس نے اس میں کافی اضافہ کروا تھا نمود اور برتری کے جذبات بھی آپ میں کافی پائے جاتے تھے چنانچہ نمود کے جذبہ کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ کتب احادیث میں جتنی احادیث آپ سے مروی ہیں دوسری اصحاب المؤمنین تو ہیں الگ، کسی صحابی سے بھی مروی نہیں ہیں، امیر المؤمنین کی حکومت میں آپ کے اس جذبہ نمود کے اظہار کا کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کہ آپ لانا موصوفہ پر یہ اصرار فرماتے کہ وہ حرم رسول کی حیثیت سے خاموشی کی زندگی بسر فرمائیں ظاہر ہے کہ یہ چیز بھی آپ کی بے چین فطرت پر ایک بار تھی اور اس کی وجہ سے بھی آپ حضرت علی کی مخالفت پر مجبور تھیں۔

۵۔ آپ میں بد قسمتی سے ہنگامہ پروری کا مادہ بھی کافی تھا جس کا مظاہرہ حیات رسول میں بھی کافی ہو چکا تھا حضرت عثمان کی خلاف "التلوائل" کے نعرے آپ کی اس فطرت کا صاف پتہ دیتے ہیں۔

سرور ان قریش نے آپ کی فطرت کا صحیح اندازہ لگاتے ہوئے آپ کو "قریش کی قیادت" پیش کر دی۔ ایک اقتدار پسند جذباتی عورت کو اتنا بڑا "رجہ"



حاصل ہو رہا ہو تو وہ کیا کچھ نہ کر ڈالے گی؟ چنانچہ آپ بھی اس جذباتی کنزور کا شکار ہو گئیں اور اللہ، رسول اور قرآن کے فرمان کو بھول کر قریش کے لشکر کی سردار بن گئیں۔

قریش کی بڑی موقع پرستی اور ناجراندہ ذہنیت کا اس سے بدتر مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عشرہ مبشرہ کے محترم ارکان نے محض اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لئے نہ صرف یہ کہ حرم محترم رسول کو میدان جنگ میں کھڑا کر دیا بلکہ عرب کے سرداروں نے ایک عورت کی قیادت قبول کر لی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ۔

۱۔ سرداروں نے قریش یعنی غلہ اور زہیر وغیرہ کو اس امر کا پورا احساس تھا کہ عوام ان کا ساتھ نہیں دیں گے اس لئے وہ حرم رسول کے نام پر عوام کا تعاون حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ یہ لوگ اپنی مطلب برآری کے لئے اتنی بلی سخی تک اتر سکتے تھے کہ حرم رسول کا احترام بھی خاک میں ملا دیں۔

۳۔ ان میں یہ جرات نہیں تھی کہ وہ خود امیرالمومنین کے مقابلہ میں کھڑے ہوں اس لئے انہوں نے حرم رسول کو بیچ بولی کا پردہ قرار دیا تھا۔

۴۔ یہ لوگ محض حصول خلافت کے لئے حرم رسول کی عزت تک پیچھے سے دریغ نہیں کرتے تھے اور اپنے نفع کے لئے پیغمبر اسلام کی حرمت تک سے کھینچنے کی جسارت کر سکتے تھے۔

قریش کے رو بہ انحطاط کو بازیاب کرنے اور مہاجرین کے ہاتھوں میں اختیارات حکومت مرکوز رکھنے کی یہ آخری کوشش تھی جو کی محض لیکن جمل کے میدان میں یہ کوشش ناکام بنا دی تھی غلہ اور زہیر مارے گئے اور اس طرح

مہاجرین اور قریش کی قوت اور ان کے اقتدار کا پیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ قریشی قیادت کی ناکامی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ محض چھٹیس سال کے اندر قریش کا مفاد پسند طبقہ اس حکومت اور اقتدار سے محروم ہو گیا جو اسے سقیفہ بنی ساعدہ کے سازشی ماحول نے عطا کر دیا تھا اور وہ قہری اثرات بھی جو صحابیت، مہاجرت، قریشیت اور وضعی احادیث نے اسے عطا کر دیے تھے اس کے گرتے ہوئے اقتدار کو بحال نہ کر کے قریش کا یہ زوال دراصل نتیجہ تھا ان کے قائدین کی بے بصیرتی اور عدم تدبیر کا اور مذہبی عقیدت چاہے ان بزرگوں کی مدد میں کتنے ہی افسانے تراش دے لیکن اس سخی اور بھیا تک حقیقت سے انکار محال ہے کہ جس حکومت کو مذہب فتوحات دولت نسب غرض ہر قسم کے اثرات حاصل تھے وہ ایک مختصر سی مدت میں ختم ہو گئی اس زوال کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ قریش کے حکمرانوں کا یہ ہے ان حضرات پر ہے جن کو قریش نے نام حکومت تفویض کی تھی اور چاہے یہ بات عقیدت کی رو میں بنے والوں کو کتنی ہی گراں کیوں نہ محسوس ہو لیکن یہ حقیقت بہر حال حقیقت رہے گی کہ قریش کے فرمانروا سیاسی اقتدار سے اتنے کوتاہ بین اتنے تنگ نظر اتنے نا تجربہ کار اور اتنے خامکار ثابت ہوئے کہ وہ اس حکومت کو بڑی آسانی سے اور بہت کم مدت میں کھو بیٹھے جسے حاصل کرنے کے لئے انہوں نے احکام رسالت کو اور جسے بازیاب کرنے کی آخری کوشش میں انہوں نے احترام حرم رسالت کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا۔

قریش کے مفاد پسند طبقہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کو سقیفہ بنی ساعدہ کی سازش کے نتیجہ میں ایوان حکومت سے دور کر دیا لیکن اس کش مکش کا جو سقیفہ میں شروع ہوئی تھی خاتمہ اس طور پر ہوا کہ حکومت امیرالمومنین کے ہاتھوں میں آ کر رہی اور جمل

کے میدان میں خود ان علیؑ کے ہاتھوں قریش کے مفاد پسند گروہ کے اقرار کا پیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا جن سے حکومت چھین لینے پر یہ طبقہ نازل ہوا۔

جمل کے میدان میں امیرالمومنینؑ کی فتح محض ظہر و نیر کے مقابلہ میں نہیں تھی بلکہ دراصل یہ فتح تھی مفاد پسندوں کی اس ساری ٹولی کے مقابلے میں جس نے اپ کو حکومت اسلامی سے دور رکھنے کی سازش کر رکھی تھی جمل کے میدان میں آپ نے قرشی اکابر کے اس گروہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور اسے ایسی شکست قاش دی کہ اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے اور ایندھ بھی اس کے ابھرنے یا اسلامی سیاست پر حاوی نے کا امکان ختم ہو گیا۔

جنگ جمل اس اعتبار سے امیرالمومنینؑ کی زندگی کا ایک انتہائی فیصلہ کن معرکہ کسی جا سکتی ہے اور ان لوگوں کا ایک مسکت جواب ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ کے پیدا کئے ہوئے حالات کے نتیجہ میں اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ امیرالمومنینؑ کو مفاد پسند قریشیوں کے مقابلہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا واقعہ یوں ہے کہ سقیفہ میں جو ”جنگ“ چھڑی تھی وہ اسی دن ختم نہیں ہو گئی تھی یہ ”جنگ“ برسوں جاری رہی۔ متعدد ”مورچے“ قائم ہوتے رہے اور ان میں میں امیرالمومنینؑ نے حکمت ربانی کے امین کی حیثیت سے ہر موقع پر اپنے مخالفین کو شکست دی یہ ضرور ہے کہ آپ نے سقیفہ کے فیصلہ کے وقت قریش کے مقابلہ میں تلوار بے نیام نہیں کی لیکن صاحب عقل اس حقیقت کو جانتا ہے کہ دانشمند جرنیل موقع محل دیکھ کر تلوار کھینچتے ہیں بے موقع نمائش شمشیر نہیں کیا کرتے سقیفہ کے فیصلہ کے وقت تلوار کھینچنے کا مقصد ہوتا۔ اسلام کو ختم کرنا اس وقت قریش کو شکست نہیں ہوتی اسلام کو شکست ہوتی اور امیرالمومنینؑ کا مقصد اسلام کو شکست دینا نہیں تھا مفاد پسندوں اور جاہ طلبوں کو شکست دینا تھا ایسی حالت میں

اپ اس وقت چپ رہے اسلام منظم ہو گیا غیر ممالک تک اسلام کی روشنی پھیل گئی دین کے لئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تو شمشیر حیدری اسی شان سے قریش کے مفاد پسندوں کے مقابلہ میں چلی جس آب و تاب سے کفار قریش کے مقابلہ میں جنگ چلی تھی یہ صحیح ہے کہ بعض مخصوص شخصیتیں سامنے نہیں تھیں لیکن سوالی شخصیتوں تھا بھی نہیں مقابلہ جو کچھ تھا وہ ایک مخصوص طبقہ ایک مخصوص مفاد کے لوگوں سے تھا۔ وہ طبقہ آج بھی موجود تھا اور شاید سقیفہ کے مقابلہ میں زیادہ طاقت کے ساتھ موجود تھا اس لئے کہ اب اسے فتوحات کی شوکت بھی حاصل تھی سیم و زر کی قوتیں بھی نصیب تھیں ماضی کا جاہ و جلال بھی اس کی پشت پر تھا عساکر کی منظم طاقت بھی موجود تھی حرم رسولؐ کا وقار بھی ساتھ تھا اور اس کے مقابلہ میں علیؑ ظاہری طور پر زیادہ کمزور بھی ہو چکے تھے رسولؐ کے انتقال کو عرصہ ہو چکا تھا اس لئے امیرالمومنینؑ کو رسول اللہؐ کے فرمودات سے جو مدد سقیفہ کے وقت مل سکتی تھی اس کا آج امکان نہیں تھا ان کے فضائل پر پردے ڈالے جا چکے تھے ان کو گمناہی کے اندھیرے میں پھینکنے کی تمام تدابیر بھی عمل میں لائی جا چکی تھیں اور سیاسی حیثیت سے ان کو ختم کر دینے کے جتنے حربے ممکن تھے وہ سب استعمال ہو چکے تھے لیکن امیرالمومنینؑ کے تدر اور قیادت کا کمال تھا کہ آپ نے جنگ اور فیصلہ کن معرکہ کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جب حریف کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا اور قریش ایسے ہارے کہ ان کے اقرار کا پیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

جو لوگ سقیفہ بن ساعدہ کے موقع پر امیرالمومنینؑ کی خاموشی پر نام دھرتے ہیں ان کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۱ھ کی خاموشی نے ۳۵ھ میں کیا رنگ دکھایا اور کس طرح امیرالمومنینؑ کے ہاتھوں قریش کی اس بجاہت کا خاتمہ ہو گیا جو ۱۱ھ میں

کوس لمن الملک بجائی نظر آ رہی تھی اگر امیرالمومنینؑ سفید کا فیصلہ سامنے آئے  
 ہی اس گروہ کے مقابلہ میں شمشیر بکت ہو جاتے تو نہ صرف یہ کہ اسلام کا خاتمہ  
 ہو جاتا بلکہ آپ اور آل رسول کے سارے افراد قتل ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ ایک  
 عقل مند جرنیل ایسے وقت میں نہیں لڑتا جب اس کی شکست یقینی ہو۔ اسے  
 جنگ نہیں کما جاتا خود کشی کما جاتا ہے۔ امیرالمومنینؑ ایک عقل مند جرنیل کی  
 حیثیت سے خود کشی نہیں کر سکتے تھے آپ نے ایسی حالت میں یہی مناسب جانا کہ  
 صحیح وقت کا انتظار کیا جائے۔ جنگ کے میدان میں یہ وقت آ گیا۔ لڑائی اللہ سے  
 لب تک جاری تھی یہ اور بات ہے کہ یہ ”سرد جنگ“ تھی صحیح و تنگ کی جنگ  
 نہیں تھی ۳۵ھ میں موقع ملتے ہی کتوار کی جنگ بھی لڑی گئی اور اس کا جو نتیجہ  
 ہوا وہ دنیا کے سامنے ہے۔

قریش کا مقصد تھا علیؑ کو خلافت ظاہری سے دور رکھ کر حکومت پر اقتدار  
 قائم رکھنا۔ دنیا نے اس نتیجے کے برعکس دیکھا۔ حکومت علیؑ کو مل کر رہی اور  
 سلطنت اسلامیہ کے قریشی اکابرین کے ہاتھوں سے پیشہ کے لئے نکل گئی۔ ایسی حالت  
 میں قریش ہارے اور علیؑ جیتے۔ سرد جنگ میں علیؑ اس طرح کے ہزاروں جوڑ توڑ  
 کے باوجود خلافت حاصل کر کے رہے اور شمشیر و تیر کی جنگ میں اس طرح جیتے  
 کہ قریش کے دوبارہ ابھرنے کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ اس سے زیادہ شاندار فتح اور  
 کیا ہو سکتی ہے؟

جنگ جمل دراصل اس جنگ کا نقطہ عروج کسی جا سکتی ہے جو رسول اللہؐ  
 کے دنیا سے پردہ کرتے ہی اکابر قریش اور امیرالمومنینؑ کے درمیان چھڑ گئی تھی اور  
 اس آخری فیصلہ کن جنگ میں فتح کا سرور امیرالمومنینؑ کے سر رہا اور کیوں نہ ہو۔  
 لانا لنعنا لک لنعنا مبینا کا تاج مامور من اللہ قائدین کے سروں پر جگمگانے کے

لئے ہی قدرت نے تیار کیا ہے اور علیؑ چونکہ مامور من اللہ کا مرتبے اس لئے یہ  
 فتح مبین ان کو اصل ہونا ہی چاہئے تھی۔ یہ ان کا قرآنی حق تھی اور اللہ کا مقرر  
 کیا ہوا حق مل کے رہتا ہے۔

جنگ جمل میں قریش کے مفاد پرست طبقہ کا خاتمہ ہو گیا لیکن کچھ عرصہ  
 کے بعد اسلام کو ایک اور داخلی فتنہ کا سامنا کرنا پڑا اور وہ تھا ”فرقہ خوارج کا  
 ظہور“

ظاہر تو خوارج کا ظہور ایک وقتی سوال کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت  
 اس کے بالکل برعکس ہے حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ چھتیس سال میں حکمران طبقہ  
 نے جو روش اختیار کی تھی اس کے نتیجے میں مسلم عوام میں جہالت عام ہو گئی تھی  
 ان میں فہم قرآن کا صحیح شعور باقی نہیں رہا تھا ان کو کتاب الہی کی تعلیم دینے والوں  
 سے دور رکھا گیا تھا اور ان میں وہ ”ذہنی طوائف الملوک“ یا مذہبی انتشار پیدا کر دیا  
 گیا تھا جس کے نتیجے میں ہر جہل اپنے آپ کو مفسر قرآن اور شارح دین تصور  
 کرنے لگا تھا ان کے دماغوں سے یہ احساس گم کر دیا گیا تھا کہ قرآن کی تفسیر و  
 تشریح صرف ان لوگوں کا حق ہے جن کو قدرت نے والراعون فی العلم کا لقب  
 عطا کر کے خاص اسی امر کے لئے مامور فرمایا ہے ان کو یہ یقین پیدا کر دیا گیا تھا کہ  
 قرآن اور دین کے مفہیم صرف آل رسولؐ یا صحابہ متقیین سے معلوم کرنے کا  
 خیال بے سود ہے اور ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ ہر کس و نامکس  
 کو قرآن دین اور شریعت کے باب میں ہر فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے یہ تدبیر  
 محض اس لئے اختیار کی گئی تھی کہ لوگ آل رسولؐ کو بھول جائیں قرآن و  
 شریعت کی تعلیم کے لئے ان مامورین من اللہ کی جانب رخ کرنا چھوڑ دیں اور آل  
 رسولؐ اتنی گناہم ہو جائے کہ پھر حکومت وقت کو اس سے کوئی خطرہ باقی نہ رہے

خود حکام وقت کا یہ عالم تھا کہ وہ دین اور قرآن کی تشریح و تفسیر کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور مختلف واقعات اس کے شاہد ہیں کہ وہ خالص علمی مسائل کے باب میں بالکل کورے ثابت ہوئے تھے اس لئے ان کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ دینی اور قرآنی مسائل میں اپنی ذات کو مسلمانوں کی توجہ کا مرکز قرار دینے اور خلیفہ وقت کی ذات کو تفسیر و تشریح قرآن کا مرکز قرار دے کر دینی مسائل میں مرکزیت باقی رکھتے ایسی حالت میں انہوں نے یہ رخ اختیار کیا کہ سیاسی مسائل اور حقوق حکمرانی تو خلیفہ کی ذات میں مرکوز رہیں اور دینی مسائل میں مسلمان "آزاد" چھوڑ دیئے جائیں۔ ہر مسلمان کو دین اور قرآن کے معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی عقل یا پسند کے مطابق آیات قرآنی کی تفسیر کرنے کا حق دے دیا جائے اور اس کا جواز اس امر میں تلاش کر لیا گیا تھا کہ سارے مسلمان صحابی ہیں اور چونکہ ہر صحابی کا حلال اور جہتد ہونا ضروری ہے اس لئے صحابہ دین یا قرآن کے باب میں جو فیصلہ کریں وہ حق ہوگا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منصب خلافت کے ذریعہ تعلیم دین کے سلسلہ میں جو مرکزیت قائم کرنا مقصود شامح تھا اس کا خاتمہ ہو گیا اور مذہبی مسائل میں مطلق العنانی کا رولج عام ہو گیا یہ تو صحیح ہے کہ اس تدبیر کے نتیجہ میں نکل رسول کے مامور من اللہ اور محصوم معلمین قرآن سے حصول دین کا دروازہ بڑی حد تک بند ہو گیا اور مسلمانوں کا سواوا عظیم آل رسول سے بیگانہ ہو گیا لیکن وہ تدبیر جو محض ایک سیاسی غرض سے اختیار کی گئی تھی اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ۔

۱۔ دین اور قرآن کے باب میں ہر کس و ناکس کو اپنی رائے ظاہر کرنے اور اپنی عقل یا پسند کے مطابق دین اور قرآن کے مفہیم متعین کرنے کا حق حاصل ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ فرقہ بندیوں کی شکل میں برآمد ہوا جس نے

جو چاہا اسلام کا ایک نیا مفہوم متعین کر دیا جو دل میں آئے وہ قرآن کی تفسیر کر دی اور اسی کے نتیجہ میں مسلمان بیٹکڑوں فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

۲۔ مذہب کے باب میں کسی مرکز کی ضرورت کا احساس ختم ہو گیا۔

۳۔ خلافت صرف پھوشاہت رہ گئی جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ گیا کہ سلطان وقت مذہب کے نام سے قائمہ اٹھا کر عوام پر اپنی حکومت قائم رکھے اور دین کے نام سے ان کے گردنوں پر اپنی غلامی کا جو لادے رہے۔

۴۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سلاطین کا کھلونا اور محض حکومت کا آلہ کار بن کر گیا چنانچہ جب عوام میں احساس حریت ابھرا تو انہوں نے جہاں خلافت کا خاتمہ کر دیا وہیں مذہب کو سلطنت اور سیاست تکلی سے بے دخل کر دیا اس لئے کہ ان کا تجربہ اس کا شاہد تھا کہ مذہب صرف چند افراد کی حکومت باقی رکھنے کا وسیلہ ہوتا ہے اور اس طرح عوام کی آزادی کے خلاف ایک سمت بڑا حربہ ہوا کرتا ہے۔

بہر حال قرآن کے باب میں عوام میں جو مطلق العنانی پیدا کر دی گئی تھی اسی کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ وہ تھا جو خوارج کے ظہور کی شکل میں برآمد ہوا اور ایک حکم قرآنی کی توجیہ و تشریح کے نام پر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ گمراہی و ضلالت کا شکار ہو گیا خوارج کو اس پر اصرار تھا کہ للاحکم الا للہ کی جو تشریح و تفسیر وہ کر رہے ہیں اسے تسلیم کر لیا جائے اور چاہے ان کی بیان کردہ تفسیر کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہو مگر خلیفہ وقت کے سامنے سر جھکا دے اس لئے کہ قرآن کی تفسیر اگلے ہر مسلمان کا پیرائے حق ہے اور خلیفہ وقت چونکہ صرف ایک فرد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی رائے کی جو ہر مسلمان کے لئے ان کے باب میں ظاہر کر رہے ہوں مخالفت کرے۔ خوارج نے یہ نظریہ

دراصل اس دینی انتشار اور لامرکزیت کے نتیجے میں قائم کیا تھا جو ابتدائی تین خلافتوں میں پیدا کر دی گئی تھی اور جس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ امیرالمومنین کے دور میں کچھ مسلمانوں نے گمراہی کی راہ اختیار کی بلکہ یہ فتنہ آج تک ہلتی ہے اور تاریخ میں ہمیشہ ہلتی رہا ہے جس شخص کا جو جی چاہتا ہے وہ قرآن کا مفہوم قرار دے دیتا ہے اور پھر چند مقلد پیدا کر کے مسلمانوں میں ایک نیا فرقہ پیدا کر دیتا ہے۔

خارج کا ظہور ہو یا بعد کی فرقہ بندیوں سب دراصل اسلام کا مرکز علمی و روحانی برباد ہو جانے کا نتیجہ ہیں جسے ستیفہ کی محفل میں ختم کیا گیا تھا اگر خلافت کو شریعت کا مرکز باقی رکھا جاتا اگر قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر صرف مامور من اللہ خلیفہ تک محدود رکھی جاتی اور اس مرکز روحانی کو برباد نہ کیا جاتا تو اسلام مختلف فرقوں میں تقسیم نہ ہوتا لیکن برا ہو حرص سلطنت اور جذبہ حکومت کا کہ محض چند روزہ بادشاہت کی خاطر شریعت کی مرکزیت ختم کر دی گئی اور یک ایسا فتنہ کھڑا کر دیا گیا جس کا غیازہ مسلمانوں کو آج تک بھگتنا پڑا رہا ہے۔

امیرالمومنین کو مروان کے میدان میں غاراج سے جو جنگ کرنا پڑی وہ ایک بڑی اصولی جنگ تھی اس جنگ کا مقصد محض اتنا ہی نہیں تھا کہ ایک داخلی فتنہ کی سرکوبی کر دی جائے بلکہ یہ جنگ دراصل اس اصول کے خلاف تھی کہ ہر کس و ناکس کو قرآن کا مفہوم متعین کرنے اور محض اپنی رائے سے دین کے اصول متروک کرنے کا حق ہے امیرالمومنین کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلام اور قرآن کی حقیقی تفسیر و تشریح کا حق صرف امام زمانہ کو ہے اور دین کی وحدت اور ملت کا نظم صرف اس طرح برقرار رہ سکتا ہے کہ احکام مذہب کی تعلیم اور تشریح ایک مرکزی نظام کے تابع ہو۔ ہر شخص کو مذہب کے باب میں اپنی رائے نافذ کرنے اور اس طرح ملت

کو فرقہ بندیوں کا شکار کر دینے کا حق نہ ہو اور آپ کے مخالفین اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ ابتدائی تین حکمرانوں کی روش قائم رکھی جائے دین کے باب میں مکمل مطلق العنانی کا رواج باقی رکھا جائے اور تفسیر مارائے کی بدعت کو ایک دینی حقیقت تسلیم کر لیا جائے دوسرے الفاظ میں خوارج وہ لوگ تھے جو "سیرت شیعین" کے قیام پر مصر تھے اور اس طبقہ کی نمائندگی کر رہے تھے جو انتقال رسول کے بعد آل رسول کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے اور امیرالمومنین کی روحانی اور دینی خلافت و جانشینی کو سلب کرنے کے ورپے تھا اس طرح مروان کی جنگ جو بظاہر امیرالمومنین اور خوارج کے مابین ہوئی دراصل دو متضاد نظریات کی جنگ تھی جس میں ایک طرف امیرالمومنین تھے جو خلافت کو محض بادشاہت قرار دینے سے انکار کر رہے تھے اور اس پر مصر تھے کہ خلیفہ اسلام ہی تفسیر و تشریح قرآن کا حق رکھتا ہے نیز یہ خلافت ایک منصب دینی ہے جس کا مقصد حفظ و بقاء و تعلیم و تشریح و اشاعت شریعت ہے اور دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو خلافت کو مذہب سے الگ محض ایک سیاسی منصب تصور کرتا تھا یہ وہی جھگڑا تھا جو ستیفہ بنی ساعدہ کے بعد اٹھا تھا اور مروان کے میدان میں امیرالمومنین نے اسی کا فیصلہ تلوار سے کیا یہ صحیح ہے کہ جس طرح میدان حمل میں شخصیتیں ہدلی ہوئی تھی لیکن مقابلہ اسی طبقہ سے تھا جو امیرالمومنین کو حکومت اور سیاست کے میدان میں شکست دینا چاہتا تھا اسی طرح مروان میں بھی شخصیتیں ہدلی ہوئی تھیں لیکن مقابلہ اسی طبقہ سے تھا جو مروان کو خلافت سے الگ کر کے آل رسول کی دینی حیثیت کو مجروح کرنا چاہتا تھا لہذا امیرالمومنین کو جہاں اس طبقہ کے مقابلہ میں فتح ہوئی جو آپ کو حکومت سے دور رکھ کے خلافت اسلامی کو قریش کی زراعت دوزی کا وسیلہ بنانا چاہتا تھا وہیں آپ کو اس طبقہ کے مقابلہ میں فتح مبینہ نصیب ہوئی جو آپ کی علمی و

روحانی برتری پر پردہ ڈال کر مذہب کو عوام الناس کا کھلونا بنا دینا چاہتا تھا۔

مقتدہ بنی ساعدہ کے فیصلہ کے نتیجہ میں دو فتنے اٹھائے گئے۔

۱۔ امیرالمومنینؑ کو سیاست اسلامی سے دور رکھ کر حکومت پر قریش کے مفاد پسند طبقہ کا اقتدار قائم کر دیا جائے۔

۲۔ آل رسولؑ کی دینی سیادت کا خاتمہ کر دیا جائے اور تعلیم و تشریح قرآن کا حق آل رسولؑ سے چھین کے عوام پر امیرالمومنینؑ کا جو مذہبی اثر ہے اسے زائل کر دیا جائے۔

امیرالمومنینؑ نے ان دونوں فتنوں کے خلاف صبر اور خاموشی سے کام لیا لیکن اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ آپ اپنے اور اسلام کے حقوق کی پامالی پر راضی ہو گئے تھے۔ آپ دراصل جنگ کے لئے مناسب وقت کی تلاش میں تھے چنانچہ جب وقت آیا تو جمل کے میدان میں آپ نے اس طبقہ کا خاتمہ کر دیا جو آپ کو سیاست کے میدان میں رک دینا چاہتا تھا اور نمودان کے میدان میں شمشیر بکھٹ ہو کر آپ نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ اس دینی مرکزیت اور خلافت روحانی کے استقرار کے لئے بھی جلد واجب تصور کرتے تھے جسے قریش اپنے سیاسی اقتدار کی خاطر مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔

خوارج کے سلسلہ میں ایک اور چیز کا تذکرہ بھی دلچسپ ہے۔

خوارج کے فتنہ کا آغاز کا فوری سبب قضیہ کمین تھا۔ بات یہ ہوئی کہ ابوہریرہؓ کی جنگ میں جب امیرمعاویہ کو فیصلہ کن شکست ہوتے نظر آئی تو انہوں نے اپنے مشیر خاص عمرو بن عباس کے مشورہ سے نیزوں پر قرآن بلند کیا کہ امیرالمومنینؑ کے لشکر میں پھوٹ ڈال دی اور یہ نعرہ بلند کیا کہ:

”خلافت کا فیصلہ قرآن و سنت کے مطابق کیا جانا چاہیے۔“

ہم اس واقعہ کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے لیکن اتنا ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امیرمعاویہ اور ان کے ساتھیوں نے ایک طرف اور امیرالمومنینؑ کو چھوٹا خلیفہ ماننے والے عراقیوں اور عربوں نے دوسری طرف یہ بات مان لی کہ:

”خلافت کا فیصلہ نہ اعلان سے ہو سکتا ہے نہ نامزدگی

سے یہ شوریٰ سے اور نہ تلوار سے، بلکہ خلافت کا صحیح اور

سچا فیصلہ وہی ہو گا جو قرآن سے ہو اور جسے احادیث کی تائید حاصل ہو۔“

امیرمعاویہ کے اس نعرہ پر لوگ یہ سمجھے کہ امیرالمومنینؑ ناکام ہوئے اور امیرمعاویہ اور خوارج کامیاب، لیکن دراصل یہ نعرہ امیرالمومنینؑ کی بہت بڑی سیاسی اور اصولی فتح تھی اس لئے کہ اس نعرہ کو قبول کرنے والوں نے اصولاً یہ مان لیا کہ:

۱۔ اعلان نامزدگی اور شوریٰ کی اساس پر بننے والی حکومتیں ناجائز تھیں اس لئے کہ یہ قرآن و سنت کی بنیادوں پر قائم نہیں کی گئی تھیں بلکہ قرشی مفاد پسندوں کے موضوع اصولوں کی اساس پر وجود میں آئی تھیں۔

۲۔ اور خود امیرمعاویہ اور بنی امیہ و بنی عباس و آل عثمان کی خلافتیں بھی ناجائز تھیں اس لئے کہ یہ قرآن و سنت کے بجائے قہر و ظلم سے قائم ہوئی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ امیرمعاویہ نے اس بہانہ سے جنگ بند کرادی اور فیصلہ کن شکست سے بچ گئے لیکن اس معمولی سی کامیابی کی قیمت ان کو ادا کرنا پڑی۔ وہ بہت مہنگی تھی اس لئے کہ انہیں اپنے ”ایمان“ کا سودا کرنا پڑا۔ اور امیرالمومنینؑ کے لئے یہ سودا بہت اچھا تھا اس لئے کہ آپ کو تلوار کی ایک عارضی فتح سے تو ضرور ہاتھ دھو کر پڑا لیکن شامیوں، عراقیوں اور عربوں سب نے یہ مان لیا کہ علیؑ

جس اصول خلافت کی خاطر لڑ رہے ہیں وہ صحیح ہیں اور ان کو خلافت سے محروم کرنے کے لئے قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے جو "اصول" گزرائے تھے وہ سراسر فطرت اور باطل تھے۔

جمل اور عمروان کے میدانوں میں وہ ہوا جو عقیدہ بنی ساجدہ کے بعد ہی ہوتا لیکن محض اسلام کی خاطر نہیں ہو سکا تھا۔ اور۔۔۔ دراصل عقیدہ کی جنگ تھی جو جمل اور عمروان کے میدانوں میں فیصلہ کن انداز میں لڑی گئی اور اس میں امیرالمومنینؑ کو جو فتح مبین حاصل ہوئی وہ ناقابل انکار ہے۔

جمل اور عمروان کی فتوحات نے اسلامی دنیا سے لحد داخل کا خاتمہ کر دیا اور اب صرف شامیوں کا معاملہ باقی رہ گیا جسے ہم اسلام کے لئے ایک بیرونی حملہ آور کا خطرہ قرار دیتے ہیں۔

اگر امیر معاویہ اور شامیوں کی جگہ عیسائیوں نے اسلامی سرحدوں پر حملہ کیا ہوتا تو یقیناً "امیرالمومنینؑ ان کو ایک یا دو لڑائیوں میں کچل دیتے۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں مقابلہ اس امویت اور مسیحیت سے تھا جسے بونک شمشیر پہلے سے ہی ردائے اسلام اوڑھنے پر مجبور کیا جا چکا تھا۔ ان لوگوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح بہت پہلے حاصل ہو چکی تھی؛ اب اسے دل کی فتح میں تبدیل کیا جانا ضروری تھا۔ جزیرۃ العرب کی شمالی مغربی سرحدوں پر شام کا علاقہ ایسی سیاسی اور جنگی اہمیت رکھتا تھا کہ اگر اسے دل سے مسلمان نہ بنا لیا جاتا تو صدر اسلام کے لئے ہمیشہ ایک خونخوار خطرہ باقی رہتا اس لئے کہ شام سے مدینہ کا راستہ بالکل کھلا ہوا ہے اور شام بحر روم کے ساحل پر واقع ہونے کے نتیجے میں ہمیشہ مسیحی یورپ کی یلغار اور لشکر کشی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کا داعی اعظم شامیوں کے مقابلہ میں تلوار کی فتح پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس فتح

کے نتیجے میں شام میں ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف ایک نفرت موجود رہتی اور جب بھی کوئی مسیحی طاقت شام پر حملہ آور ہوتی تو مقامی آبادی نہ صرف یہ کہ مزاحمت نہ کرتی بلکہ اس کا ساتھ دے کر دشمنوں کے لئے مدینہ کا دروازہ کھول دیتی۔ ایک عہد الفتنہ ماہر جنگ کی حیثیت سے امیرالمومنینؑ شام کے جغرافیائی محل وقوع اور اس سے پیدا ہونے والے عظیم خطرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے آپ یہ ضروری تصور فرماتے تھے کہ شام کو مسلمانوں کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا جائے اس سے ایک دوسرا فائدہ بھی تھا اور وہ یہ کہ شامیوں کے سچے دل سے مسلمان ہو جانے کے نتیجے میں بحر روم کے ساحل پر واقع تمام یورپی اور افریقی ممالک پر مسلمانوں کا دبدبہ قائم ہو جاتا اور ان ممالک میں تبلیغ اسلام کی صورتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ سیاسی اعتبار سے شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ مسلمانوں کے حلقہ اثر میں داخل ہو جاتے تھے اور اس سے مسلمان جو فائدہ اٹھا سکتے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تھے وہ سیاسی، حربی اور تبلیغی مسائل جو شامیوں سے مقابلہ کے وقت امیرالمومنینؑ کے سامنے تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس باب میں امیرالمومنینؑ کی رائے یا آپ کی سیاست غلط تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دلوں کی یہ فتح کئی عرصہ میں حاصل ہوئی اور اس کے لئے آل رسولؑ کو عظیم قربانیاں دینا پڑیں لیکن اس فتح کے جو شاندار نتائج مرتب ہوئے وہ تاریخ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ دلوں کی اس عجیب و غریب فتح کے لئے۔۔۔

۱۔ امیرالمومنینؑ کو جنگ کو طول دینا پڑا تاکہ اول تو شامیوں کی آتش انتقام سرد پڑ جائے دوسرے وہ آل رسولؑ کے کردار کا مطالعہ کر کے اسلام سے مانوس ہو جائیں اور تیسرے اسلام کو مٹانے کا نعرہ حصول خلافت کے نعرہ میں تبدیل ہو جائے۔

۳۔ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو "خلافت" یعنی بادشاہت عطا کر کے شامیوں کو ظاہری مسلمان بنے رہنے پر مجبور کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کی وہ نسل جسے جبراً مسلمان بنایا گیا تھا اور جو بظاہر مسلمان لیکن باطن مسیحی تھے، ختم ہو گئے اور وہ نئی نسل وجود میں آگئی جس کا تثلیث یا تیسیت سے کوئی واسطہ نہیں تھا جس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف اسلام ہی اسلام کو دیکھا تھا۔ (یہ اور بات ہے کہ اس کے سامنے اسلام کا اموی روپ ہی تھا) اور جس کے دل میں عربوں کے خلاف سیاسی عناد تو ہو سکتا تھا لیکن مذہبی عناد کا وجود ناممکن تھا۔

۳۔ شامیوں کی اس پروردہ امویت مسلمان نسل کو حقیقی اسلام کے مطالعہ کا ذوق پیدا کرانے کے لئے کربلا کی عظیم الشان قربانی پیش کی گئی تاکہ وہ شامی جو بنی امیہ کی شاہی کو اسلام سمجھتے تھے اور جن کو اصل اسلام سے بے خبر رکھنے میں حکومت وقت نے اپنی پوری قوتیں صرف کر دی تھیں۔ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ "بنی امیہ کے اسلام" سے الگ بھی کوئی ایسا "اسلام" موجود ہے جس کے لئے آل رسول ایسی حیرت انگیز قربانی دے سکتی ہے۔ واقعہ کربلا نے شامیوں کے مرہ ضمیر کو "چھوڑا" ان کے دل ہلا دئے اور ان کو "حقیقت" معلوم کرنے پرائل کر دیا۔

۳۔ امام زین العابدین علیہ السلام اور آل رسول کی مظلوم خواتین نے شامیوں کے دلوں کو موم کر دیا۔ حقیقت ان پر واضح کر دی گئی، ان کو اسلام حقیقی سے روشناس کرا دیا گیا اور لیل بیعت کے لئے ہوئے قافلے نے شام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ "دلوں کی فتح" مکمل کر لی گئی اور وہ کام جو ۴۳۰ھ میں امیرالمومنین نے نامکمل چھوڑا تھا۔ لاکھ میں اس

طرح تکمیل تک پہنچا دیا گیا۔ وہی شام جو عہد امیرالمومنین میں اسلام کے لئے سب سے بڑا فتنہ بن کر نمایاں ہوا تھا آج چودہ سو سال بیت جانے کے بعد بھی مسلمانوں کی عزت و شوکت کا ایک مرکز تسلیم کیا جاتا ہے۔ آل رسول کے امیروں نے شام کو اسلام کے لئے اس شان سے فتح کیا کہ بنی امیہ کے احمق اور احمال "شراب خور" ذلتی اور دشمن دین سلاطین کا مرکز حکومت ہونے کے باوجود شام کا تعلق اسلام سے منقطع نہ ہو سکا اور نہ صرف یہ کہ شام پر اسلام کا اثر غالب رہا بلکہ انہیں شامیوں کے دلوں میں جو امیر معاویہ کی کمان میں اسلام کو ختم کر دینے کا عہد کر کے میدان جنگ میں آئے تھے۔ اسلام سے ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ کئی سو سال تک مسیحی قوتیں شام کے راستے مرکز اسلام پر حملہ کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن شامیوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر ان کو ہمیشہ روکے رکھا اور وہی شاہی اسلامی سرحدوں کے نگہبان قرار پائے جنہوں نے ۳۵ھ میں سرحد اسلامی کو احمقوں پر خطر بنا دیا تھا۔ یہ نتیجہ تھا امیرالمومنین کی اس پالیسی کا کہ شامیوں کو تلوار سے رک نہ دی جائے بلکہ ان کے دلوں کو اسلام کے لئے جیت کر شام کو آنے والی صلیبی جنگوں میں اسلام کا سب سے مستحکم قلعہ بنا دیا جائے۔ گو تاہم نظر شاہ پسند اس سیاست پر اعتراض کر سکتے ہیں اس لئے کہ وہ معرکہ صفین میں "بادشاہ" علی کے سر پر "تاج جگمگاتے نہیں دیکھتے لیکن جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ علی بادشاہ نہیں تھے بلکہ تحریک اسلامی کے قائد اور مومنین کے امیر تھے جن کو یہ معلوم ہے کہ علی کا مقصد زندگی اپنی "بادشاہت" کا استعزاز نہیں تھا بلکہ اسلام کی بقاء و توسیع تھا اور جو اس امر سے واقف ہیں کہ علی کے نزدیک فتح وہی تھی جو اسلام کی فتح ہو۔ وہ



امیرالمومنینؑ کی اس دور رس سیاست کی دلو دینے پر مجبور ہیں اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ معاویہ کے مقابلہ میں امیرالمومنینؑ نے محض یہی نہیں کہ فتح حاصل کی بلکہ ایسی پائیوار اور شاندار فتح حاصل کی جس شام کو معاویہ نے دشمنان اسلام کا گڑھ بنایا تھا اسی کو خانوادہ رسالتؑ نے اسلام کا ایسا مستحکم قلعہ بنا دیا جسے صلیبی جنگوں کا خوفناک سیلاب بھی نقصان نہ پہنچا سکا اور جس ملک کے رہنے والے مسیحیوں کے سارے معاویہ نے اسلام کو مٹا دینے کا خواب دیکھا تھا وہی ملک بہ فیض تبلیغ خانوادہ رسالتؑ اسلام سے اتنا قریب ہو گیا کہ مسیحیت کے دیوالے یورپی صلیبی سپاہی کبھی شامی سرحدوں کو پار کر کے مرکز اسلام میں داخل نہ ہو سکے بلکہ انہیں ہمیشہ شامیوں کے ہاتھوں شکست اور موت کا سامنا کرنا پڑا۔ امیر معاویہ کی اس سے زیادہ شرمناک ناکامی اور امیرالمومنینؑ کی اس سے زیادہ شاندار فتح اور کیا ہو سکتی ہے؟

یہاں ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ صفین میں جو معرکہ ہوئے ان میں امیرالمومنینؑ نے اپنی جنگی مہارت اور فوجی قیادت کے وہ لافانی نقوش چھوڑے جو رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے۔

اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ امیر معاویہ کے ساتھ ایک ایسا لشکر تھا جو اسلام کو مٹا دینے کی دھن میں دیوانہ ہو رہا تھا اس لئے امیر معاویہ کے سپاہیوں میں جوش تھا اتنا تھا جنگ کا جذبہ تھا اور وہ اپنے قائد کے ہر حکم کی متابعت کرتے تھے۔ ان کا نظم و ضبط اچھا تھا وہ ایک آواز پر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور جان جو حکم میں ڈال کر ہر کام کر گزرتے تھے اور ان کے مقابلے میں امیرالمومنینؑ کے پاس ایک ایسی فوج تھی جس میں نہ کوئی جوش تھا اور نہ کوئی جذبہ نہ مقاصد

کی تلقین تھی نہ اصولوں پر مرٹنے کا ذوق نہ تنظیم تھی نہ اتحاد نہ اسلام کو بچانے کی تڑپ تھی نہ حدود مملکت میں بھائے امن کی خواہش امیرالمومنینؑ ان سپاہیوں کو غیرت دلاتے ان کے سامنے اسلام کی فریاد پیش کرتے اپنے کلیجہ کا خون آنسو کر کے بہاتے ان کو اللہ طور رسولؐ کے واسطے دیتے لیکن جہ لوگ پھر بھی جنگ سے جی چاہتے طرح طرح کی بہانے کرتے اور لڑائی سے پہلو تھی کرتے اس لئے کہ اول تو ان کے نقوش خراب ہو چکے تھے سابقہ حکومتوں نے ان کی دیکھاری کو دنیا داری میں تبدیل کر دیا تھا اور ان کو اسلام یا اصول کی خاطر لڑنے کے بجائے محض مال قیمت کی خاطر جنگ کرنے کا عالمی بنا دیا تھا اور دوسرے یہ لوگ امیر المومنینؑ کو اپنے سابقہ تین حکمرانوں کے خلاف عمل کرتے دیکھتے تو یہ چیز ان پر گراں گزرتی تھی اس لئے یہ کتنا غلط نہ ہو گا کہ ان کے دل پورے طور پر امیرالمومنینؑ کے ساتھ نہ تھے ایسی حالت میں امیرالمومنینؑ کے لئے امیر معاویہ سے جنگ کرنا کتنا دشوار ہو گا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے اور یہ امیرالمومنینؑ کا کمال قیادت ہے کہ آپ اس قسم کے کم ہمت، بے نول، مغادر پرست اور نیم دلی سے کام لینے والے لشکر کے باوجود نہ صرف یہ کہ میدان میں جھے رہے بلکہ معاویہ کو عراق اور حجاز پر قبضہ کر لینے سے روکے رہے آپ کی جگہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو شاید وہ چند روز بھی جنگ جاری نہ رکھ سکتا اور اگر جنگ جاری رکھنے کی کوشش کرتا تو لانا موت سے ہمتا ہو جاتا لیکن یہ اعلیٰ درجہ کی قیادت کا کمال تھا کہ آپ ایک پر آئندہ اور کم ہمت گروہ کی مدد سے ایک پر جوش اور منظم لشکر کو نہ صرف یہ کہ روکے رہے بلکہ ایسی ایسی جنگیں دیتے رہے کہ آخر اسے فیروں پر قرآن بلند کر کے التوائے جنگ پر مجبور ہو جانا پڑا۔

حضرت عثمان کے مقابلہ میں مٹھی بھر مصری اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ

والوں نے خلیفہ کی مدد نہ کی تو بنی امیہ کی مکمل حمایت حاصل ہونے کے باوجود آخر قتل کر ڈالے گئے ان کے مقابلہ میں امیر المومنینؑ کو دیکھتے کہ آپ کے سامنے محلوہ کا منظم لشکر موجود تھا عراقی مدد سے پہلو تھی کہ وہ تھے کوفہ والے بار بار فداری، بے وفائی اور بزدلی کا مظاہرہ کر رہے تھے لشکری اطاعت سے گریزاں تھے لیکن پھر بھی امیر محلوہ نہ صرف یہ کہ میدان جنگ میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ مکمل شکست سے بچنے کے لئے فریب کاری پر مجبور ہو گئے۔

قضیہ حکمین کے بعد تو امیر المومنینؑ کے نام نداد ساتھیوں اور لشکریوں کا نظم اتنا بگڑ چکا تھا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت امیر المومنینؑ کے پاس کوئی لشکر تھا ہی نہیں تو شاید غلط نہ ہو گا لیکن اس کے باوجود محلوہ عراق اور حجاز پر قبضہ کرنے کی جرات نہ کر سکا جو امیر المومنینؑ کی قیادت اور سیاست کا ایک عظیم العقول اور اعجاز آفرین کارنامہ ہے جو صرف حکمت ربانی کے امین ہی سے تصور میں آسکتا ہے۔

چار سال کی مختصر مدت خلافت میں آپ نے نہ صرف یہ کہ قریش کے مفاد پرست طبقہ کا خاتمہ کر دیا بلکہ بنی امیہ کے کافرانہ کردار کا بھی خاتمہ کر دیا اس لئے کہ خلافت دعویٰ کر دینے کے بعد بنی امیہ کے لئے اہتمام پرستی کی راہ پر پلٹ جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا اور وہ اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے ناموں کے ساتھ اسلام کا لیبل چسپاں رکھیں۔

آپ کی ان دونوں کامیابیوں کے تاریخ اسلام پر گہرے اثرات مرتب ہوئے جن کا ایک ہلکا سا خاکہ ہم سابقہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں آپ یہ عظیم اور تاریخی کارنامے انجام دینے میں مصروف تھے اس زمانہ میں آپ کے لئے یہ امکان ہی نہیں تھا کہ آپ اسلامی سلطنت کے حدود

میں کوئی اضافہ فرمائیں لیکن پھر بھی آپ اس امر سے غافل نہیں رہے چنانچہ ۳۸ھ میں آپ کے ایک جرنیل قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس کے بعد ہی حادثہ بن موہ کی سرکردگی میں دوسرا حملہ کر کے سندھ پر قبضہ کر لیا گیا۔ چنانچہ سندھ پر کئی سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا لیکن بعد میں دمشق میں حصول اقتدار کی جو شائرشیں شروع ہوئیں ان میں سندھ دوبارہ ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا افغانستان میں غور کا علاقہ آپ ہی کے عہد سلطنت میں فتح ہوا حارث بن جعفر جعفی کی قیادت میں مشرقی ایران اور توران کے علاقے فتح کئے گئے ایرانیوں کی متعدد بغاوتوں کو فرو کیا گیا۔ رقیق بن خشم کی قیادت میں قزوین اور رے پر قبضہ کیا گیا اور اس طرح حدود سلطنت اسلامی میں کافی اضافہ کیا گیا۔ چار سال کی مختصر مدت میں جب کہ آپ کو حمل، عموان اور صفین کے معرکے بھی درپیش تھے اتنے علاقوں کی فتح بھی ایک معجزہ سے کم نہیں ہے اور یہ آپ ہی کا دل جگر تھا کہ اس وقت جب کہ محلوہ کے حامیان پوری مملکت میں غور مچا دینے پر تھے ہوئے تھے آپ نے نصف ایران فتح کیا۔ افغانستان کے ایک علاقہ پر پرچم اسلامی لہرایا اور ہندوستان کے صوبہ سندھ پر لشکر کشی کر کے مسلمانوں کو اس برصغیر کی راہ دکھا دی جو دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی کا مرکز بننے والا تھا۔

امیر المومنینؑ نے صرف یہی نہیں کیا کہ اسلام کے لئے قریش کے مفاد پسندوں اور بنی امیہ کے منافقوں سے جو خطرات پیدا ہو گئے تھے ان کو دور کر دیا بلکہ آپ نے اپنی مختصر مدت خلافت میں تحریک اسلامی کے وہ سارے خدوخال پوری شدت سے ابھار دیئے جن پر جمالت زر پرستی اور جنگوں کے لاشعری سلسلہ نے پردے ڈال دیئے تھے چنانچہ آج یہ آپ ہی کی علمی کوششوں اور تعلیمات کا ثقیل ہے کہ شیطانوں انقلابات اور شیطان کے ہزاروں جوڑ توڑ کے باوجود اسلام

کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے موجود ہے آپ کی دور رس نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ :-

- ۱ مسلمانوں میں ملوکیت اور نسلی پادشاہت کا فتنہ پوری شدت سے ابھرنے والا ہے اور انسانی حاکمیت کے جس فلفہ تصور کو اسلام ختم کر دینا چاہتا تھا وہی خود دنیائے اسلام پر نافذ ہو جائے والا ہے اس کے معنی یہ تھے کہ انقلاب اسلامی کا نقطہ اول یعنی کلمہ لا الہ الا اللہ بھی اموی اور عباسی سلاطین کے ہاتھوں اپنے حقیقی مفہوم سے بیگانہ ہو جائے والا تھا اور توحید باری تعالیٰ کے اصول جہالت کی ظلمتوں میں گم ہو جانے والے تھے
- ۲ مسلمان: ابوذر، عمار، لوہیس قرنی اور اسی قسم کے دوسرے حضرات جو اسلام اور تحریک اسلامی کے حقیقی مفہوم کو جانتے اور سمجھتے تھے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اسلام کی عتقانہ اقتدار بن ہاتھوں میں چلی جانے والی تھی جو اسلام کو چند مردہ رسوم اور چند بے جان عبادت میں تبدیل کرنے دینے والے تھے آپ یہ دیکھ رہے تھے کہ اموی اور عباسی سلاطین کے ہاتھوں میں اسلام ایک کھلونا بن جائے گا حدیث سازی عام ہو جائے گی تفسیریں اسرائیلی خرافات کا مجموعہ بن جائیں گی جبر و قدر، تجسیم باری تعالیٰ انبیاء کی خطاکاری اور اسی قسم کے سینکڑوں لٹو عقائد اسلام میں داخل کر دیئے جائیں گے۔ مانویت، مزدکیت، نو فلاطونیت اور فلسفہ یونان اسلامی روپ دھار کر عقائد اسلامی کے شفاف دھارے کو گندہ کر دیں گے پادشاہوں کی تفریح خاطر کے لئے فقہ اسلامی عجیب و غریب مسائل کا طوبار بن جائے گی اور اسلام اس طرح مسخ ہو جائے گا کہ اس کی شکل پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔
- ۳ خلافت کی تقلیدیں کا تصور سلاطین کی بد اعمالیوں کے نتیجے میں ختم ہو جائے

گا اور اس طرح امت کی مرکزیت اور مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔

- ۴ شیعہ عثمان، شیخ علی اور خوارج کے نام سے مسلمانوں میں فرقہ بندی شروع ہو چکی تھی جو آگے چل کر بھیاک روپ اختیار کر لینے والی تھی۔
  - ۵ ذر پرستی عام ہو چکی تھی اور آگے چل کر ملت اسلامیہ کو اس کے نتائج بد کا سامنا کرنا پڑی تھا۔
  - ۶ ابو موسیٰ اشعری قسم کے لوگ عام ہوتے جا رہے تھے جن کے نزدیک جود اور بے عملی ہی وقت کی سب سے بڑی نیکی تھی جس کے نتیجے میں آگے چل کر تصوف کا بے عمل فلسفہ مسلمانوں کے ذہنوں پر چھا جانے والا تھا۔
  - ۷ مسلمان لٹے جاہل ہو چکے تھے کہ امیر معاویہ کے بقول اونٹ اونٹنی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جس قوم میں جہالت اس درجہ پر پہنچ جائے اس کا روحانی علمی تمدنی اور ذہنی حیثیت سے جو حشر ہو سکتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔
- امیرالمومنین کے دور کی کسی دوسری اسلامی شخصیت نے نہ تو ان مفاسد کا اندازہ کیا اور نہ ان کے تدارک کی کوئی تدبیر کی یہ صرف آپ ہی کی ذلت گرامی تھی جس نے ان حضرات کا احساس کیا اور مسلمانوں کی ذہنی تربیت کا پورا پورا بندوبست فرمایا اس سلسلہ میں آپ کی مساعی جلیلہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ خون کی بارش اور تلواروں کی چھاؤں میں بھی اسلام کی تبلیغ اور اسرار دین کی اشاعت سے باز نہیں رہتے تھے چنانچہ میدان صفیں میں عین اس وقت جب کہ موت کا بازار گرم تھا آپ نے ایک اعرابی کے جواب میں مسئلہ توحید پر جو عالمانہ تقریر فرمائی ہے وہ آپ کے اسی جذبہ تبلیغ کی منظر ہے آپ نے اپنا یہ

اصول بنا لیا تھا کہ روزانہ نماز عمر کے بعد ایک خطبہ ارشاد فرماتے تھے جس میں دین کے حقائق و معارف بیان کیا کرتے تھے تاکہ مسلمان اس دین حقیقی سے آشنا ہو جائیں جس پر جمالت نے گمراہی ڈال دی ہے تھے آپ نے اپنے خطبات، فرامین، توہیات، خطوط اور دعاؤں کے ذریعہ دین کی کھیتوں اور اسلام کی تعلیمات کو جس شان سے اجاگر کیا ہے اس کی مثال صدر اسلام کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور اس باب میں تاریخ کی کوئی حیثیت آپ کے مقابلہ میں پیش کی جانا محال ہے آپ کی یہ سنی جمیل نبی البلاغ اور سینہ علویہ کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور کتاب اللہ کے بعد اسلام کی صداقتوں کا سب سے مکمل اور حسین منظر تسلیم کی جاتی ہے آپ کے ان خطبات، مکاتیب اور لوعیہ کے نتیجہ میں ہی اسلام اپنی شکل پر قائم رہا اور بادشاہوں کے جبر فلاسفہ کے اقتدار کج فہم علماء کی کتہ آرائیوں جمالت کی قلت آفرینوں صوفیاء کے بیچ کاٹوں حدیث سازوں کی کرشمہ آرائیوں اور مفسرین کی بعید از کار ڈرف نگاہوں کے باوجود دین کی حقیقتیں گم نہ ہو سکیں توحید کے اصلی نقوش قائم رہے رسالت و معاد کے عقائد پر حرف نہ آسکا اور اسلام ہزاروں انقلابات کے باوجود آج تک اپنی اصلی صورت میں زندہ اور موجود ہے۔ سرکار دو عالم کے ہزاروں صحابہ میں یہ شرف صرف امیرالمومنینؓ ہی کی ذلت گرامی کو حاصل ہے کہ آپ نے امت کی ہدایت اور دین کی بقاء پر پوری پوری توجہ فرمائی اور خطبات و مکاتیب کی شکل میں وہ سرمایہ چھوڑ گئے جو علوم الہیہ کا سب سے بڑا مخزن اور بصیرت و معرفت کا سب سے قیمتی ثزانہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے صحابہ نے بعض احادیث کی روایت کا فریضہ انجام دیا اور یا پھر فقہی مسائل و احکام بیان کئے لیکن امت کے عقائد کو محفوظ کرنے، حقیقت توحید عام کرنے دین کے مصالح و حکم کو ذہن نشین کرانے اور آنے والے

زندہ میں دین کی شکل کو مسخ ہونے سے محفوظ رکھنے کا کام صرف امیرالمومنینؓ نے انجام دیا اور یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا جواب دوسری خلافتوں کی تاریخ میں ملنا محال ہے۔

خلافت الہیہ کا حقیقی مقصد دین کی حفاظت کرنا علوم و دینہ کو عام کرنا مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی کرنا حقیقت اسلام کو اجاگر کرنا رموز قرآن کی وضاحت کرنا احکام الہی کی تبلیغ کرنا شریعت مطہرہ کی تعلیم دینا اور مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی تعمیر کرنا ہے اور جب اس زاویہ سے امیرالمومنینؓ کی خلافت پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم نے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ خلافت کا مقصد اصلی صرف آپ کی خلافت کے زندہ میں پورا ہوا دوسری طرف خلفاء نے فتوحات ملکی میں ضرور اضافہ کیا انتظام سلطنت پر توجہ ضرور کی۔ شاندار عساکر کی ترتیب میں ضرور انہماک کا مظاہرہ کیا لیکن یہ کام تو دنیا کا ہر بادشاہ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم انجام دیا کرتا ہے ان امور کا خلافت الہیہ سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اگر محض ترتیب عساکر اور فتوحات ملکی کو خلافت کا مقصد مان لیا جائے تو دنیا کے سارے مسلمان بادشاہ اور فاتحین مستحق خلافت ہو جائیں گے خلافت الہیہ کا مقصد تو وہ ہے جو ہم نے صدرجہ بالا طور میں واضح کیا ہے اور یہ مقصد اگر کبھی پورا ہوا ہے تو امیرالمومنینؓ کے دور خلافت میں۔ اس اعتبار سے آپ کا یہ چار سالہ دور خلافت نہ صرف یہ کہ اپنی مثال آپ ہے بلکہ درحقیقت وہ واحد خلافت علیٰ منہاج النبوة ہے جس کی نظیر تاریخ اسلام میں ملنا محال ہے۔

آج دنیا کی ہر ترقی یافتہ حکومت اپنے حدود مملکت سے جمالت کو مٹانے اور عوام کو تعلیم یافتہ بنانے پر زور دیتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ صدر اسلام کی ابتدائی تین خلافتوں نے اس اہم تعمیری اور تعلیمی کام کو پیش

نظر انداز کیا جس کا نتیجہ اس شدید جہالت کی شکل میں رونما ہوا۔ جس میں بقول امیر معاویہ عرب لوٹ اور لوثی میں تیز کرنے کے قاتل نہیں رہے۔ امیرالمومنین علیہ السلام دنیائے اسلام کے پہلے حکمران ہیں جنہوں نے فشر علوم پر نہ صرف یہ کہ توجہ دی لکہ اسے اپنی حکومت کا اولین مقصد قرار دیا چنانچہ آپ کی کاوشوں کے نتیجہ میں کوفہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا اور آپ کی ہدایت و تربیت کے نتیجہ میں دنیائے اسلام میں تصنیف و تالیف کا وہ مشغلہ شروع ہوا جسے آپ سے پہلے کے حکمرانوں نے قطعاً بند کر رکھا تھا۔

عربی علم نحو کے امام ابوالاسود دوکلی، علم قرأت کے امام عبدالرحمن سلمیٰ فقہ و حدیث کے امام شعبی، تفسیر کے امام عبداللہ بن عباس مساحت و ریاضی کے امام کمال بن زیاد زبان و بیان کے ماہر عمر بن سلمہ اور علم عروض کے موجد عبادہ بن صامت آپ ہی کے خرمن علم کے خوشہ چیں ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام جناب محمد بن حنفیہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت ابی بن کعب حضرت جابر بن عبداللہ انصاری حضرت کمال بن زیاد حضرت اصبح بن ہبہ حضرت عبداللہ بن ابی رافع سلیم بن قیس ہلالی ہشتم ہزار زید بن وہب اور بعض دوسرے حضرات آپ کے مکتب فکر کے پروردہ وہ مصنفین ہیں جن کے آثار قلمی محفوظ ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کی سعی و جہد کے نتیجہ میں تصنیف و تالیف کا فن کافی ترقی کر گیا تھا۔

دنیائے اسلام پر امیرالمومنین کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ آپ نے مسلمانوں میں علمی تحریک شروع فرمائی چنانچہ اس حقیقت کا دوست دشمن سب کو اعتراف ہے کہ توجہ ملت اسلامیہ جن علوم پر ناز کرتی ہے ان کے آغاز کا سرا امیر

المومنین کے سر ہے مسلمانوں کا علم الہیات مسلمانوں کا علم کلام اور مسلمانوں کا فلسفہ و حکمت تمام تر حضرت علی کی ایجاد ہے اور ان علوم کا اولین ماخذ نوح البلاغ ہے دوسرے علوم کے سرچشمے بھی اسی کو علم و معرفت سے پھولے اور یہ آپ کا ایک ایسا احسان ہے جسے ملت اسلامیہ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔

امیرالمومنین علیہ السلام کی علمی تحریک کا ایک لوئی سا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ دنیائے اسلام کی پہلی تفسیر حضرت سعید بن جبیر نے لکھی جو تابعین میں شامل تھے ابن الندیم نے اپنی فہرست میں اس تفسیر کا تذکرہ کیا ہے سعید بن جبیر شیعان امیرالمومنین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حجاج بن یوسف نے ان کو شہید کرا دیا۔

شیعان امیرالمومنین اس وقت قرآنی علوم کی تدوین و اشاعت میں مصروف تھے جب دوسرے مسلمانوں کی ان علوم پر کوئی توجہ نہ تھی چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام کے صحابی سدی کبیر اسماعیل متوفی ۷۷ھ نے ایک اعلیٰ درجہ کی تفسیر تیار کی جس کا تذکرہ علامہ سیوطی نے بھی کیا ہے محمد بن سائب بن بشر کلبی متوفی ۳۶ھ نے بھی جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے قرآن پاک کی ایک بہت مفصل تفسیر تیار کی تھی۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگردوں میں جابر بن یزید جعفی اور ابوالہارون نے بھی قرآن کی تفسیریں لکھی ہیں۔

آئمہ علوم قرآن میں عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، ابی بن کعب، سعید بن جبیر (علم التفسیر فی التابعین) یحییٰ بن بصیر، میمان بصری، طاوس بن کیسان، اعش کوفی، سعید بن مسیب، عبدالرحمن سلمیٰ اور ابن تغلب وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں جو صحابی اور تابعین کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

آئمہ کل رسول کے اصحاب میں جن لوگوں نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں ممتاز کارنامے انجام دیئے ان میں ابو حمزہ ثمالی صحابی امام زین العابدین علیہ السلام زیاد بن منذر ابو الجارود یحییٰ بن قاسم ابو بصیر علی بن سالم بطائنی حسین بن طارق ابو جنادہ السلولی محمد بن خالد برقی وہب بن منس یونس بن عبدالرحمن احمد بن صالح علی بن سباط علی بن خطاب ابو الفضل قتی قرأت بن ابراہیم اور دوسرے کئی حضرات شامل ہیں حسن بن خالد برقی نے امام حسن عسکری علیہ السلام کی ہدایت پر ایک سو بیس جلدوں میں ایک مفصل تفسیر تیار کی تھی جو ایک نادر علمی کارنامہ ہے۔

علم قرأت میں سب سے پہلی کتاب ابن بن تغلب نے لکھی اور ان کے بعد دوسری کتاب حمزہ بن حبیب نے تیار کی۔ حمزہ کا انتقال ۱۵۶ھ میں ہوا اور یہ دونوں صحابی آئمہ تھے۔ حمزہ نے قرأت کا علم امام جعفر صادق علیہ السلام سے حاصل کیا تھا ان کے علاوہ سعد بن ابو جعفر کوئی متوفی ۲۲۱ھ نے علم قرأت میں ایک اہم تصنیف چھوڑی اور یہ کتابیں اس وقت تیار کی گئیں جب دوسرے مسلمانوں کو اس علم پر کوئی توجہ نہیں تھی چنانچہ اہلسنت میں علم قرأت کے پہلے مصنف ابو سعید قاسم بن سلام ہیں جو مذکورہ بالا تینوں شیعہ مصنفین کے بعد اس میدان میں داخل ہوئے ہیں۔

احکام القرآن پر پہلی کتاب محمد بن سائب زکلی متوفی ۳۶۱ھ نے لکھی۔ قرأت القرآن کے پہلے مصنف ابان بن تغلب ہیں جن کے بعد ابو جعفر رواسی ابو عثمان مازنی فرا اور ابن درید نے اس میدان میں قدم رکھا اور یہ سب حضرات شیعہ تھے۔ معانی قرآن پر ابان بن تغلب افزا اور رواسی کی تصانیف اولیت کا شرف رکھتی ہیں نولدر القرآن کے پہلے مصنف علی بن حسین بن فضل ہیں جن

کے بعد ابو الحسن محمد بن احمد معروف بہ حارثی اور علی بن ابراہیم نے اس فن میں اہم کتابیں تیار کیں۔

مشابہات قرآن پر سب سے پہلی کتاب امام جعفر صادق کے شاگرد حمزہ بن حبیب زیات کوئی نے لکھی اور مقطوع و موصول قرآن پر بھی پہلی کتاب انہیں بزرگ نے تیار کی محمد بن احمد وزیر نے بھی مشابہات قرآن پر ایک اچھی کتاب چھوڑی۔

حجرات قرآن میں پہلی کتاب فرا یحییٰ بن زیاد نے تیار کی علامہ سید رضی نے بھی اس موضوع پر ایک تصنیف چھوڑی۔

فضائل قرآن پر ابی بن کعب نے اور امثال قرآن پر شیخ محمد بن جنید نے پہلی بار قلم اٹھایا۔

محمد بن ابراہیم بن جعفر ابو عبداللہ کاتب نعمانی نے تفسیر نعمانی تیار کی اور آیات قرآنی سے ساٹھ علوم ظاہر کئے۔

پہلی تفسیر جو کل علوم قرآن کی جامع کہی جاتی ہے ابو عبداللہ محمد بن عمر الواقفی نے تیار کی۔

شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی کی التنبان سید رضی کی حقائق التبریل شیخ حسین خزاعی کی روض البیان علامہ طبری کی مجمع البیان اور شیخ قطب الدین راوندی کی تفسیرہ علمی کارنامے ہیں جن پر ملت شیعہ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے اور یہ سب فیض ہے اس علمی تحریک کا جو ملت اسلامی کے مخصوص من اللہ قائم نے اپنی نگرانی میں شروع فرمائی تھی۔

علم حدیث میں پہلا صحیفہ خود امیرالمومنین علیہ السلام نے تیار کیا اور آپ نے اس امر میں سعی بلیغ فرمائی کہ زیادہ سے زیادہ احادیث جمع کر لی جائیں چنانچہ

حضرت امام حسن علیہ السلام حضرت سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری نے بھی صحیح حدیث مرتب کئے۔ حضرت ابو رافع نے اس طرح اپنا صحیفہ حدیث مرتب کیا کہ احادیث مختلف ابواب میں تقسیم تھیں امیرالمومنین کے شاگردوں میں علی بن ابی رافع عبید اللہ بن ابی رافع سلیم بن قیس ہلالی میثم تمار اصبح بن ہبائہ عبید اللہ بن حریص بن ربیعہ بن سمیع اور حرث ہمدانی نے بھی صحیح حدیث تیار کئے اور یہ کتابیں اس زمانہ میں مرتب ہوئیں جب شیعان اہل بیت کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا تھا۔

دوسری صدی میں جب اہل سنت میں زہری اور امام مالک نے احادیث جمع کیں اس وقت بھی شیعہ محدثین بکثرت تھے جن میں ابان بن تغلب جابر بن یزید جعفری ابو حمزہ شمالی زرارہ بن اعین محمد بن مسلم طائفی ابو بصیر عبدالمومن بن قیس انصاری ابو الرجا کوفی ابو یحییٰ فیاض جہر بن زائدہ معاویہ بن عمار اور عبید اللہ بن میمون قداح وغیرہ بہت مشہور ہیں امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب نے حدیث کی چار سو کتابیں چھوڑی ہیں۔

علماء شیعہ نے علم حدیث میں چھ ہزار چھ سو کتابیں تالیف کیں جو علم حدیث سے بیرون آل رسول کی شینگی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ علم حدیث کے ساتھ علم رجال کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے تفسیر اور حدیث کے ساتھ ہی رجال بھی اولیت کا شرف شیعوں کو حاصل ہے چنانچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے صحابی محمد بن خالد برقی علم الرجال کے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے روایات کا تذکرہ مرتب فرما کے تحقیق و تنقید حدیث کا دروازہ کھول دیا ان کے بعد ابو محمد ابن جبہ ابن حیان نے کتاب الرجال لکھی ابو جبہ کا انتقال ۲۶۹ھ میں ہوا۔ رجال کے تیسرے مصنف امام محمد تقی علیہ السلام کے صحابی ابو جعفر یقطنی ہیں۔ ان کی

کتاب منظر عام پر آنے کے بعد اہل سنت نے اس علم کی جانب توجہ کی اور شعبہ نے رجال اہل سنت پر کتاب تصنیف کی۔ علمائے شیعہ میں ابو جعفر برقی ابن بابویہ قمی شیخ صدوق شیخ ابو بکر جعفی وغیرہ رجال کے بہت بڑے ماہر گروے ہیں اور ابھی دور آخر میں حضرت ناصر الملک علی اللہ مقامہ نے اس فن میں اس کمال کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر تاریخ اسلامی میں دستیاب ہونا مشکل ہے۔

علم فقہ کی تدوین پر بھی امیرالمومنین نے پوری توجہ دی چنانچہ فقہ اسلامی کی پہلی کتاب امیرالمومنین کے شاگرد ابو رافع نے خود آپ کی زندگی میں ہی مرتب کر لی تھی ان کے بعد قاسم بن محمد ابن ابی بکر اور سعید بن مسیب نے فقہ پر کتابیں لکھیں اس وقت تک اہل سنت نے فقہ میں کوئی کتاب تیار نہ کی تھی۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابہ نے تو علم فقہ کو چار چاند لگا دیئے چنانچہ ان فقہائے شیعہ میں زرارہ ابو بصیر اسدی فضیل بن یسار مسلم طائفی جمیل بن دراج عبید اللہ بن سکان عبید اللہ بن کبیر حماد بن عیسیٰ وغیرہ کے نام تاریخ فقہ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کے صحابی ثابت المقدم نے جامع فقہ تیار کی اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی علی بن حمزہ نے جامع ابواب فقہ تصنیف کی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے صحابہ میں محمد بن معانی نے شرائع الایمان اور عبید اللہ بن مغیرہ نے تیس جلدوں میں علم فقہ کی ایک بہت بڑی کتاب تیار کی۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ آئمہ آل رسول کے صحابہ میں ابراہیم بن محمد ثقفی ابراہیم بن محمد اسلمی علی بن محمد تاسانی صفوان بن یحییٰ بجلی اور ابو علی السراوی وغیرہ نے بھی علم فقہ میں تصانیف چھوڑی ہیں۔

علم کلام کی ایجاد بھی حضرت امیرالمومنین کا کارنامہ ہے چنانچہ کمیل بن

زیاد سلیم بن قیس ہلالی اور حارث اعور ہمدانی اس علم میں آپ کے خصوصی شاگرد تھے۔ علم کلام میں سب سے پہلی کتاب جیسی بن روضہ تاجی نے لکھی اور اس کے بعد ابو الباقم بن محمد بن علی بن ابی طالب کی تصنیف سامنے آئی امام زین العابدین علیہ السلام سے یہ علم قیس بن ناصر اور حران بن ائین نے امام محمد باقر علیہ السلام سے جابر بن یزید جعفی نے اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے علم کلام ابو جعفر محمد بن علی بن نعمان معروف بہ احوال نے حاصل کیا۔ مشہور متکلم ہشام بن حکم یونس بن یعقوب اور فضل بن حسن بھی اس علم میں امام جعفر صادق کے شاگرد تھے امام علی رضا علیہ السلام کے شاگرد فضل بن شاذان نے علم کلام میں ایک سو اسی (۱۸۰) تصانیف چھوڑی ہیں اسلام کے ممتاز اور شہرہ آفاق فلسفی متکلم ابو نصر فارابی اور ابن مسکویہ بھی شیعہ تھے۔ شیعہ متکلمین میں علامہ حلی شیخ مفید محقق تفسیر الدین طوسی اور علامہ سید مرتضیٰ لادول شہرت کے مالک ہیں۔

سیرت کی پہلی کتاب ابن اسحاق نے لکھی اور یہ شیعہ تھی۔ تاریخ کی پہلی کتاب امام جعفر صادق کے شاگرد ابان بن عثمان الاحمر متوفی ۱۳۰ھ نے تیار کی۔

جغرافیہ کی پہلی کتاب امام محمد باقر علیہ السلام کے شاگرد ہشام بن محمد کلینی نے تصنیف کی اور انہوں نے علم جغرافیہ پر متعدد رسائل بھی چھوڑے۔ علم کیمیا کی ایجاد کا شرف جابر بن حیان کو حاصل ہے جو امام جعفر صادق کے شاگرد تھے۔

علم عروض کے موجد ظلیل بن احمد علم الصرف کے پہلے مصنف ابو عثمان ہارونی اور علم بدیع کے موجد ابن ابرام ابراہیم بن علی بن سلمہ بھی شیعہ تھے۔

ہم خلافت ظاہری کے اس باب کو آپ کی شہادت کے ذکر پر ختم کرنا چاہتے ہیں اس المناک اور درد انگیز واقعہ پر جس نے ملت اسلامیہ کو یتیم اور دین کو بے سارا کر دیا لیکن جو واقعہ بجائے خود امیر المؤمنین کی زندگی کا اتنا آہناک اور شاندار واقعہ تھا کہ اس انسان اعظم نے جس نے

”اپنی شان میں قرآن مجید کی سینکڑوں آیتیں نازل ہونے اپنے باب میں سرکارِ دو عالم کی سینکڑوں احادیث بیان ہونے اور خود اپنے لائقہاد بے مثل اور بے نظیر کارناموں پر فخر نہیں کیا اس نے اس واقعہ شہادت کو اپنی انتہائی کامیاب زندگی کا سب سے کامیاب واقعہ قرار دیتے ہوئے ارشاد کیا۔“

#### فوت یوب الکعبۃ

”یوب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا“

شہادت مسلمان کی معراج ہے لیکن کیا کتنا اس معراج کا جو اس نماز میں حاصل ہو خود ”معراج مومن“ کہی جاتی ہے۔ امیر المؤمنین کو اللہ کے گھر میں عین سجدہ خالق میں معراج شہادت سے ہمکناری نصیب ہوئی جو ایک سچے مومن کا سب سے بڑا فخر اور رسالت ماب کے ایک سچے شاگرد کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ سچ کما کسی نے۔

کے را میر نہ شد این سعادت

بکعبہ ولادت بہ مسجد شہادت



## تاریخ کا فیصلہ

آل رسولؐ کو محرومی ناکامی اور پستی کا شکار تصور کرنے والے اس حقیقت کو بھولتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دنیائے اسلام میں جس شخص کو سب سے زیادہ مرجعت حاصل ہے وہ امیرالمومنینؑ اور صرف امیرالمومنینؑ کی ذات گرامی ہے۔ ماننے کی صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں انداز مختلف ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا تعلق ہے امیرالمومنینؑ سے زیادہ دنیائے اسلام میں مقبول و محبوب کوئی دوسری شخصیت نہیں ہے۔

شیعہ آپ کو پہلا امام اور خلیفہ بلا فصل مانتے ہیں  
اہل سنت آپ کو وصی رسولؐ اور چوتھا خلیفہ تسلیم کرتے ہیں  
صوفیاء آپ کو امام اللادلیاء قرار دیتے ہیں  
نصیری آپ کو خدا کہہ کر یاد کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک کفر ہے

فرض یہ کہ خوارج و نواصب کے علاوہ جو بہ اتفاق امت دائرہ اسلام سے خارج ہیں دنیا کا ہر مسلمان آپ پر ایمان رکھتا ہے اور آپ کی یہ ایک ایسی کامیابی ہے جو تعصبات ناقابل انکار ہے آپ کی محبت کو سارے مسلمان بلا اختلاف عقائد شرط ایمان تسلیم کرتے ہیں شیعہ، متنفذیہ، صوفیاء اور خود اہل سنت کا تعلیم یافتہ طبقہ آپ کو تمام صحابہ سے افضل مانتا ہے اور مسلمانوں میں بحیثیت جمعی بی بی اکثریت بعد رسولؐ ساری امت پر آپ کی فضیلت کی قائل ہے آپ کو سرکارِ دو عالم کا روحانی جانشین اور وصی ماننے پر ساری امت کا اجماع ہے اور یہ سب

اس حالت میں کہ نبی امیہ نے آپ کا نام مٹا دینے کی ہر امکانی کوشش کی قریش کے خلافت ساز طبقہ نے پیشہ آپ کو نظر انداز کیا اور متعصب و تنگ نظر علماء نے جو سلاطین کے وظیفہ خوار تھے تحریر کی ساری صلاحیتیں آپ کے فضائل پر پردہ ڈالنے اور اغیار کے تعصبات کو ابھارنے میں صرف کر دی تھیں یہ ضرور ہے کہ عہد نبی امیہ میں آپ پر سب و شتم ہوا اور بظاہر اس عہد میں آپ کی شخصیت ناکام نظر آئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں بھی آپ کو ایک عظیم اصولی فتح نصیب ہوئی اس لئے کہ جمہور مسلمین کے نزدیک آپ کی خلافت خلافت راشدہ کا جزو ہے اور اس پر ایمان رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے ایسی حالت میں جن لوگوں نے نبی امیہ کے ساتھ مل کر آپ پر سب و شتم کیا وہ خود اہل سنت کے نقطہ نظر سے دائرہ اسلام سے خارج ہو گئے اس لئے کہ انہوں نے اسلام کے چوتھے خلیفہ کی خلافت انکار کی اور اس طرح ایک ایسے بنیادی عقیدہ کے منکر ہوئے جن پر علماء المسلمین کا اجماع ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دور نبی امیہ میں جن لوگوں نے امیرالمومنینؑ پر سب و شتم میں حصہ لیا اور اس طرح خلافت راشدہ کے ایک رکن کی خلافت سے انکار کیا ان کو مسلمان اور مسلمانوں کا خلیفہ قرار دینا کس اصول سے جائز ہو سکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ ان حضرات کو مسلمان قرار دینے کے لیے یہ اصول وضع کرنا پڑے گا کہ خلافت راشدہ کے ارکان کی خلافت سے انکار کرنے اور ان پر لعن طعن کرنے سے کوئی دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، یہی نہیں بلکہ اس حرکت کا ارتکاب کرنے والا خلیفہ المسلمین بھی قرار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ سلاطین نبی امیہ کے سلسلہ میں کیا گیا۔ تو پھر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کی

ایک جماعت خلافت راشدہ کے تین ارکان سے اظہار بیزاری کرتی ہے اور ان کی خلافت کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے تو اس پر اعتراض کیوں؟

اگر امیر معاویہ دوسرے خلفائے بنی امیہ اور اس عہد کے دوسرے حضرات کو جو تمام تابعین اور تبع تابعین پر مشتمل ہیں (اور جن میں عہد یزید و معاویہ کے صحابہ بھی شامل ہیں) مسلمانوں کی چوتھی خلافت سے انکار نیز اس پر سب و شتم کرنے کے باوجود مسلمان قرار دیا جاتا ہے تو تین خلفائوں سے انکار کرنے والوں کو بھی مسلمان قرار دینا پڑے گا اور اگر اس سے احتراز برتا گیا تو امیر معاویہ سے لے کر بنی امیہ کے آخری خلیفہ تک نہ صرف یہ کہ سب خلفائے اسلام سے ہاتھ دھونا پڑے گا بلکہ عدالت صحابہ کے عقیدہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اور ان تمام مسلمانوں کے اسلام سے بھی انکار کرنا پڑے گا جو بنی امیہ کے خلفاء کی بیعت کرتے رہے، ان پر ایمان کا اظہار کرتے رہے یا ان کو مسلمان تسلیم کر کے انکا احترام واجب قرار دیتے رہے۔ ان میں چاہے تابعین ہوں چاہے جمعیت تابعین ہوں چاہے علماء و محدثین ہوں چاہے مفسرین و متکلمین ہوں اور چاہے جمہور مسلمین ہوں، سب کا ایمان مشتبہ ہو جانا ضروری ہے۔

اگر ان حضرات کا اسلام ثابت کرنے کے لیے یہ بمانا تراشا گیا کہ لوگوں نے بنی امیہ کی بیعت صرف تلوار کے خوف سے کی تھی تو ساری دنیا کے اسلام پر جس میں صحابہ اور تابعین بھی شامل تھے "تقیہ کا الزام" عائد ہو جائے گا اور اس کا جواب دینا مشکل ہو گا!

عہد بنی امیہ میں بھی امیرالمومنین کی حقانیت کا اعلان و اعتراف ہار ہار ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے انتقال کے صرف ساڑھے تین سال بعد بنی امیہ کے تیسرے خلیفہ ابولیبی معاویہ بن یزید نے بھرے دربار میں یہ اعتراف کیا کہ امیر

المومنین حق پہ تھے اور معاویہ نے مسئلہ خلافت میں آپ سے جو تنازعہ کیا وہ سراسر سید زوری و دھاندلی اور غلط کاری پر مشتمل تھا، امیرالمومنین کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود امیر معاویہ کے وارثین نے صرف یہ کہ اپنے دلوں کو ناحق کوشش قرار دیا بلکہ اس سلطنت پر ٹھوکر مار دی جس کے لئے امیر معاویہ نے امیرالمومنین سے تنازعہ کیا تھا۔

معاویہ بن یزید کا یہ اعلان حق اس امر کا ثبوت ہے کہ ابو سفیان اور معاویہ کی نسل نے بلاخر اسی اسلام کے سامنے سر نیز خم کر دیا جسے یہ دونوں تلوار سازش اور مکر کے سارے مٹا دینا چاہتے تھے اور یہ سیاست علویہ کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ امیرالمومنین سے پیشتر والے خلفاء نے بے بس اور ناخلاق بنی امیہ کو شام کی گورنری کی رشوت دی لیکن وہ ان کو نہ صرف یہ کہ مسلمان نہیں بنا سکے بلکہ ان کو اسلام و وحشی کی ایک بہت بڑی قوت عطا کر گئے۔ آل رسول نے اس کے برعکس بنی امیہ کے کفر باطنی کا مقابلہ کیا اور اپنی قربانیوں کے سارے یہ عظیم فتح حاصل کی کہ۔

۱۔ آل ابو سفیان کے ہاتھوں سے پیش کے لیے حکومت کل معنی یعنی مدوی اقتدار سے اس کا خاتمہ ہو گیا اور

۲۔ اسے اسلام قبول کر لینا پڑا یعنی اس کی ظاہری حیثیت و اقتدار کے ساتھ اس کی کفر واز تحریک کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

یہ صحیح ہے کہ حکومت بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی لیکن خالد بن یزید کے بعد آل ابو سفیان حکمران نہیں رہی بلکہ بنی امیہ کی مروانی شاخ حکمران ہوئی۔ ابو سفیان کی نسل میں معاویہ کے صرف ساڑھے تین سال بعد تک حکومت رہی اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔

مردانی خلفاء میں عمر بن عبدالعزیز نے امیرالمومنین پر سب و شتم بند کر دیا اور اس طرح عملاً یہ تسلیم کر لیا کہ امیر معاویہ سے لے کر بنی امیہ کے دس خلفاء تک سب ایک مستقل گمنامہ کا ارتکاب کرتے رہے اور جو لوگ ان خلفاء کی بیعت کرتے رہے یا آج بھی ان سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں وہ ایک بڑی غلط کاری کے مرتکب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے کہ طلحہ اسلام عمر بن عبدالعزیز کو خلفائے راشدہ میں شامل کرتے ہیں اور اسے بنی امیہ کے ملک عضو سے علیحدہ ایک دہدار خلیفہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دنیا کے سارے مسلمان امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں کے اس فعل کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ پر سب و شتم کراتے رہے اور چاہے زبان سے اس کا اقرار نہ کیا جائے لیکن عمر بن عبدالعزیز سے جو بیعت اور اظہار عقیدت کرنے والے اس منطقی نتیجہ کی زد سے باہر نہیں جاسکتے کہ وہ امیر معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے حکمرانوں کو عملاً غلط کار تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اگر اس منطقی نتیجہ کو نہ مانا گیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ عمر بن عبدالعزیز سے جو بیعت کی گئی وہ بھی جھوٹی تھی اور جو اظہار عقیدت کیا جاتا ہے وہ بھی نمائشی ہے۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے آل رسولؐ کو فدک بھی واپس کر دیا جو آل رسولؐ کی ایک عظیم اخلاقی اور اصولی فتح تھی۔ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے اس عمل سے ثابت کر دیا کہ جن لوگوں نے فدک کو ضبط کیا تھا یا اس کی ضبطی کے لیے ایک حدیث کا سارا لیا تھا وہ غلطی پر تھے اور جس حدیث کو انہوں نے اپنے فعل کی دلیل قرار دیا تھا وہ سرے سے جھپول اور وضعی تھی اس لیے کہ اگر اس منطقی نتیجہ کو تسلیم نہ کیا جائے تو عمر بن عبدالعزیز کے اس اقدام کی مذمت کرنا واجب

ہو جائے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے حضرت ابو بکر حضرت عمر اور حضرت عثمان کی مخالفت اور توہین کی اس لیے وہ خلافت کا لٹل نہیں تھا لیکن کوئی مسلمان عمر بن عبدالعزیز پر یہ الزام عائد نہیں کرتا بلکہ سب سے ایک خلیفہ راشد تسلیم کرتے ہیں جو اس کا قیوت ہے کہ سارے مسلمان زبان سے نہ کسی لیکن اپنے عمل سے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فدک کی ضبطی بھی غلط تھی اور وہ حدیث بھی وضعی تھی جسے اس ضبطی کی دلیل قرار دیا گیا تھا۔ عمر بن عبدالعزیز کی بیعت کرنے والے مسلمان عملاً یہ ثابت کرتے ہیں کہ فدک کی ضبطی غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ تھی اور جو حکومت غیر عادلانہ حکومتوں کی مرتکب ہو اسے کم از کم خلافت کے محترم لقب سے نوازا قطعاً غلط ہے۔

فدک کے سلسلہ میں یہ چیز بڑی دلچسپ ہے کہ اسے بار بار ضبط کیا اور واپس کیا جاتا رہا جو خلیفہ چاہتا تھا اسے ضبط کر لیتا تھا اور جو چاہتا تھا واپس کر دیتا تھا اور سواد اعظم اسلام ان میں سے ہر خلیفہ کو خلیفہ برحق واجب اطاعت امیر اور اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ سواد اعظم کے نزدیک فدک کی ضبطی اور واپسی دونوں درست ہیں۔ کسی وقت یہ فعل جائز ہو جاتا ہے اور کسی وقت ناجائز جو بے اصولی کا ایک ایسا عجیب و غریب شاہکار ہے جس پر ہر سچا مسلمان شرم سے سر جھکا لینے پر مجبور ہے۔

فدک کی ضبطی اور واپسی کی یہ عجیب و غریب داستان اور مسلمانوں کی یہ بے اصولی کہ وہ ان متضاد نظریات رکھنے والے خلفاء میں سے ہر ایک کو امیر مطلق اور پیشوا تسلیم کرتے رہے امیرالمومنین کی ایک عظیم اخلاقی اور اصولی فتح ہے اس لیے کہ فدک کی ہر واپسی کے موقع پر دنیائے اسلام کو عملاً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فدک کو ضبط کرنا ایک غیر عادلانہ فعل تھا اور جو لوگ ایک غیر عادلانہ

فصل کے مرتکب ہوئے وہ خلافت کے سے عظیم منصب کے اہل نہیں قرار دیئے جاسکتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ بار ہا بار اقرار ان تمام خلافتوں کو باطل قرار دے دیتا ہے جو قریش نے امیرالمومنین کو نظر انداز کر کے قائم کی تھیں اور کم از کم دنیا پر یہ ضرور ظاہر کر دیتا ہے کہ بار بار امت کا "مجلس" اس امر پر ہو چکا ہے کہ ابتدائی تین خلافتوں نے فدک کو غصب کر کے ایک بڑا ظلم کیا تھا، ان خلافتوں کے غیر عادلانہ فعل پر بار بار "مجلس امت" کے سامنے اس ایک بار کے "مجلس" کی کیا حیثیت پتی رہ جاتی ہے جو وفات رسول کے بعد وجود میں آیا تھا؟

بنی امیہ کے بعد بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی اور ساری دنیائے اسلام نے ان کی بیعت کی۔ آل عباس کے پہلے خلیفہ ابو العباس السفاح نے حصول خلافت کے بعد ہی جو پہلا خطبہ پڑھا اس میں اس نے نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کے تمام خلفاء کی تکذیب کی بلکہ ابتدائی تین "مخلفائے راشدین" کی خلافت کو بھی ناجائز قرار دیا۔ السفاح نے کھلم کھلا الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جانشین، وارث اور خلیفہ بلا فصل امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام تھے اور جن لوگوں نے امر خلافت میں آپ سے تلامذہ کیا یا خود مستد آرائے خلافت بن بیٹھے وہ ہرگز اس فعل کے مجاز نہیں تھے۔

السفاح کا یہ خطبہ اس کے عقائد کا ایک واضح اعلان تھا اور اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ اس اعلان عقائد کے بعد ساری دنیائے اسلام نے اس کی بیعت کی یہ چیز تین حالتوں سے خالی نہیں۔

۱۔ یا تو ساری دنیائے اسلام نے السفاح کے ان عقائد کو تسلیم کر لیا۔

۲۔ یا دنیا بھر کے مسلمانوں نے "تقیہ" کے طور پر عباسیوں کی بیعت کی۔

۳۔ اور یا پھر سوو اعظم اسلام کا کوئی اصول نہیں اس لیے کہ وہ جب چاہیے

اسلام کے تین خلفاء اور بنی امیہ کے سلاطین کی بیعت کر سکتا ہے اور جب چاہے ان کو غاصب قرار دے سکتا ہے اور دونوں حالتوں میں اس کا مذہب قائم رہتا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت قبول کی جائے گی وہ امیرالمومنین کی فتح کھلانے کی اور مذہب اہل بیت کی کھلی ہوئی کامیابی تصور کی جائے گی۔

السفاح کے بعد منصور دو اشقی نے اپنے پیشرو کے عقائد میں ترمیم کی اور یہ دعویٰ کیا کہ خلافت دراصل حضرت عباس کا حق تھی یہ ایک عجیب و غریب دعویٰ تھا اور آج دنیا کا کوئی مسلمان اسے تسلیم نہیں کرتا لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس دعویٰ کے باوجود منصور کی بیعت کی اور خلیفہ تسلیم کیا۔

بہر حال حضرت عباس کے دعویٰ خلافت کے نتیجہ میں منصور نے پوری "خلافت راشدہ" کو مسترد کر دیا اور ان تمام صحابہ تابعین اور شیخ تابعین تکذیب کر دی جو اس نظام خلافت کے علمبردار تھے اور ساری دنیائے اسلام نے منصور کی بیعت کر کے اس کے اس فیصلہ پر مروتی شہت کر دی۔

اگر ہم یہ عرض کریں تو غلط نہ ہو گا کہ السفاح اور المنصور کے دور میں خلافت راشدہ کے باطل ہونے پر ساری امت کا "مجلس" رہا کیونکہ اگر اس صورت کو قبول نہ کیا جائے گا تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں نے ان دونوں کی خلافت کو دل سے تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ دنیا بھر کے مسلمان دراصل "تقیہ" کیے ہوئے تھے اور یہ ایک ایسی بات ہو گی جسے قبول کرنا آج کے مسلمانوں کے لیے آسان نہیں ہو گا۔

امیرالمومنین کی اس سے زیادہ شاندار کامیابی اور کیا ہو گی کہ اللہ میں مسلمانوں کے "مجلس" نے جن لوگوں کی خلافت کا فیصلہ کیا تھا انہیں کو صرف

ایک صدی کے بعد ۳۳ھ میں اسی اجماع مسلمین نے خلافت سے محروم کر کے قاصب قرار دے دیا۔ اب وہ ہی صورتیں رہ جاتی ہیں، ایک تو یہ کہ اس نئے اجماع کے فیصلہ کو بھی برحق شمار کیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ ارکان خلافت راشدہ قاصب تھے اور دوسرے یہ کہ سرے سے اصول اجماع کو باطل مان لیا جائے اس لیے کہ جو اجماع روز بروز بدلتا رہتا ہو اس پر شرعی مسائل کی بنیاد رکھ دینا اور اس کے فیصلوں کو برحق قرار دینا ویسی ہی الجھنیں پیدا کرتا رہے گا جیسی کہ آل عباس کے عقائد پر "اجماع امت" نے پیدا کر دی ہیں اور جن کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ خلافت کا وہ سارا عمل منہدم ہو جاتا ہے جس پر مسلمانوں کا ایمان ہے بلکہ وہ "عدالت صحابہ" بھی باطل ٹھہر جاتی ہے جس پر حدیث اور فقہ کی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت ہمارے سامنے آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ السفاح اور المنصور دونوں ابتدائی تین خلفائوں کو مسترد قرارینے میں تو متحد ہیں لیکن امیر المومنین کے بارے میں ان کے نظریات مختلف ہیں۔ السفاح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت بلا فصل کا اعلان کرتا ہے اور المنصور آپ کی خلافت سے بھی اسی طرح انکار کرتا ہے جس طرح ابتدائی تین خلفاء کی خلافت کا منکر ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے منصور کے دور میں اپنی بنائی ہوئی چاروں خلفائوں سے انکار کیا لیکن درحقیقت یہ بات خلاف واقعہ ہے۔ مسلمانوں نے ابتدائی تین خلفائوں کو منکر انکار پر تو خاموشی اختیار کی لیکن جب اس نے امیر المومنین کے حق خلافت سے انکار کیا تو فقہ اسلامی کے دو ائمہ یعنی ابو حنیفہ اور امام مالک نے المنصور کی بیعت توڑ دینے کا حکم دے دیا چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے انکار محال ہے کہ اہلسنت کے ان دونوں ائمہ نے خلیفہ

المنصور کے مقابلے میں محمد نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم کا ساتھ دیا اور اس طرح عملاً یہ ثابت کر دیا کہ وہ خلافت کو عباسیوں کے مقابلہ میں آل علی کا حق تسلیم کرتے تھے اور اس منصور کو خلافت کا اہل تسلیم نہیں کرتے تھے جو امیر المومنین کے خلافت کا منکر تھا۔

بنی عباس کے کئی خلفاء کے متعلق بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ابتدائی تین خلفائوں کو باطل تصور کرتے تھے اور امیر المومنین کو رسول اللہ کا پہلا اور سچا چاشمین مانتے تھے اور مسلمانوں نے ان سب کی بیعت کی ہے۔ ایسی حالت میں یا تو یہ مان لیا جائے کہ یہ بیعت غلط تھی اور یا پھر اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ امیر المومنین کی خلافت بلا فصل پر امت کئی مرتبہ اجماع کر چکی ہے جو امیر المومنین کی سمت بڑی کامیابی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے تین ارکان اور بنی امیہ کے سلاطین کی خلافت پر کبھی "اجماع" نہیں ہوا۔ اس لیے کہ شیعوں نے ان کی خلافت کبھی تسلیم نہیں کی البتہ ان کی خلافت کے باطل ہونے پر دور بنی عباس میں بار بار "اجماع امت" ہوا۔ اس لیے کہ جناب بھی اہل سنت نے بنی عباس کے ان سلاطین کی بیعت کی جو ان خلفاء کی خلافت تسلیم نہیں کرتے تھے تو وہ شیعوں کے ہم آواز ہو گئے اور ان خلفائوں کے بطلان پر ساری امت کا اجماع مکمل ہو گیا۔

آل رسول کے نوین، دسویں اور گیارہویں امام پر بنی عباس کے مظالم کی وجہ سے یہ بتلائی جاتی ہے کہ بنی عباس کو یہ معلوم تھا کہ آل رسول میں مہدی پیدا ہو گا اور ان کو اندیشہ تھا کہ مہدی کے ہاتھوں ان کی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خلفائے بنی عباس کا یہ خوف بھی امیر المومنین کی ایک بڑی کامیابی ہے۔

اس لیے کہ مسند خلافت پر بیٹھنے والے بھی اپنے دل کے پردوں میں یہ تسلیم کرتے تھے کہ قائم آل محمد امیر المؤمنین کے پوتے اور جانشین ہوں گے اور اسی اقرار قلبی کے نتیجے میں وہ اسے ضروری خیال کرتے تھے کہ آل رسول کے ان آئمہ برحق پر مظالم ڈھا کر عوام کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی جائے جن کی امامت حق کا خود ان کو وقتاً فوقتاً اقرار کرنا پڑتا تھا۔

جہاں تک عام مسلمانوں کا تعلق ہے واقعہ کربلا کے بعد سے گیارہویں امام کے دور تک ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کے دل ہمیشہ آل رسول کے ساتھ رہے اور مسلمانوں میں یہ عقیدہ عام رہا کہ خلافت دراصل آل رسول کا حق ہے۔ شاہان وقت بھی مسلمانوں کے اس رجحان سے بخوبی واقف تھے چنانچہ آئمہ اہل بیت کا قید و بند میں مبتلا رکھا جانا دراصل اس حقیقت کے اعتراف کا عملی نتیجہ تھا۔ امیر المؤمنین کی اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے کہ حکومت وقت کی قوتوں، زبانشیوں اور مخالفانہ پروپیگنڈہ کے باوجود دنیا آپ کی اور آپ کی اولاد کی حقانیت کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوئی اور جس شخص کے نام کو دنیا سے مٹا دینے کی ہر امکانی سعی و جہد کی گئی وہ تاریخ کے ہر دور میں اس اعتبار سے مسلمانوں کا سب سے بڑا قائد تسلیم کیا گیا کہ اس کی ذات پر ہمیشہ امت کا اعلان رہا حالانکہ تاریخ کی کسی دوسری اسلامی شخصیت کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا کہ اس پر ہمیشہ اور ہر زمانہ میں پوری امت کا اعلان ہوا ہو۔

تاجین مصر کا عروج اور دنیا کے مختلف گوشوں میں شیعان علی کی حکومتوں کا قیام بھی امیر المؤمنین کی ایک بڑی کامیابی ہے چنانچہ آج بھی ایران، یمن اور عراق میں شیعان علی کی حکومت قائم ہے۔ عراق بھی شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے اور وہاں چھ آئمہ کی زیارت گاہیں ہیں جن کی وجہ سے عراق کو عالم اسلام

میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خود شام میں جو آپ کے مخالفین کا سب سے بڑا مرکز تھا آج تک شیعہ موجود ہیں اور مذہبی اعتبار سے تو شام کی ساری اہمیت آل رسول کی مرہون کرم ہے اور مسجد اموی کے علاوہ شام میں جتنی زیارت گاہیں ہیں وہ سب امیر المؤمنین کے اصحاب اور اولاد سے تعلق رکھتی ہیں خود ہمارے برصغیر میں کوزلوں شیعہ رہتے ہیں اور جگہ جگہ امام باہوں کی شکل میں آل رسول سے تعلق رکھنے والی عمارتیں موجود ہیں۔ غرض آج اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں آپ کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے آپ کی اولاد یعنی سادات کرام کو ایک بلند تر مقام کا مالک سمجھا جاتا ہے اور آپ سے اظہار محبت و عقیدت کو ایمان کی نشانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

اصولی اعتبار سے بھی دیکھئے تو امیر المؤمنین کی فتح مبین آج کے دور میں ناقابل انکار ہے اس لئے کہ آپ کے مقابلہ میں خلافت کے جتنے اصول وضع کئے گئے تھے ان کو آج کی اسلامی دنیا بلا تعلق مسترد کر چکی ہے چنانچہ۔

۱۔ قہر و غلبہ کے اصول کو آج کا کوئی مسلمان دلیل حق تسلیم نہیں کرتا اس لئے قہر و غلبہ اول تو شخصی عکرائی کے لئے ہوتا ہے جسے آج کا ہر مسلمان مردود قرار دیتا ہے اور دوسرے اسے حریت کے اصولوں کے منافی تسلیم کیا جاتا ہے۔ آٹھویں، مصر، شام، ترکی اور پاکستان وغیرہ میں جمہوری حکومتوں کے قیام اور دوسرے ممالک اسلامیہ میں آجی بادشاہت کا وجود قہر و غلبہ کے اصول کا عملی استرداد ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کے مسلمان اس عمل اصول کے خلاف "اعلای" کر چکے ہیں جس کی اساس پر امیر معاویہ اور ان کے جانشینوں کی خلافت قائم ہوئی تھی۔

۲۔ جمہوری کے اصول کو بھی عامۃ المسلمین نے ٹھکرا دیا ہے اس لئے کہ

جمہوریت اور دستوریت میں نامزدگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔

۳۔ شوروی کا اصول بھی مسترد ہو چکا ہے اس لئے کہ آج کا مسلمان اسے کسی حالت میں قبول نہیں کرتا کہ چھ اکابر و اعیان بدکردوں میں بیٹھ کر اس کی قسمت کا فیصلہ کریں بلکہ آج حکمرانوں کا انتخاب عوام کے ووٹوں کے ذریعے کے جانا ہے۔

۴۔ اعلیٰ امت تو سرے سے ناممکن العمل شے ہے۔ چنانچہ اسی لئے مسلمانوں کے اکثریت رائے کے اصول کو اپنا لیا ہے جمہوریت کے اکثریت رائے والے اصولوں کا مسلمانوں میں تسلیم کر لیا جانا اس حقیقت کا عملی اعتراف ہے کہ اعلیٰ ایک ناممکن العمل شے ہے اور اسلام ظاہر ہے کہ ایک ناممکن العمل شے کی تعلیم نہیں دے سکتا۔

خلافت کے ان چاروں وضعی اور بے بنیاد اصولوں کا مسترد کر دیا جانا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ ان اصولوں پر جو خلافتیں قائم کی گئی تھیں وہ بے اصل تھیں اور جن مفاد پسندوں نے اسلام کے ایک متمم ہائشان امر کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کے لئے ایسے اصول گھڑ لئے تھے جن کو آج کے مسلمان نے سرے سے ناممکن العمل اور غلط قرار دے کر مسترد کر دیا ہے اس سلسلہ میں ملت اسلامیہ کی یہ بد قسمتی بھی ملاحظہ کے قابل ہے کہ جو اصول اساس خلافت قرار دیئے گئے تھے وہ چونکہ سب باطل اور غلط ثابت ہوئے اور آج کا مسلمان ان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے اس لئے سرے سے خلافت کا وجود ہی ختم ہو گیا ہے اور آئندہ بھی خلافت کا وجود میں آنا ناممکن ہے اس لئے کہ نہ

۱۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا کسی ایک شخص کی ولایت پر اعلیٰ عمل ناممکن ہے اس لئے کہ ایسی کوئی شخصیت ملنا محال ہے جو ساری دنیا کے مسلمانوں

میں مقبول و محبوب ہو۔

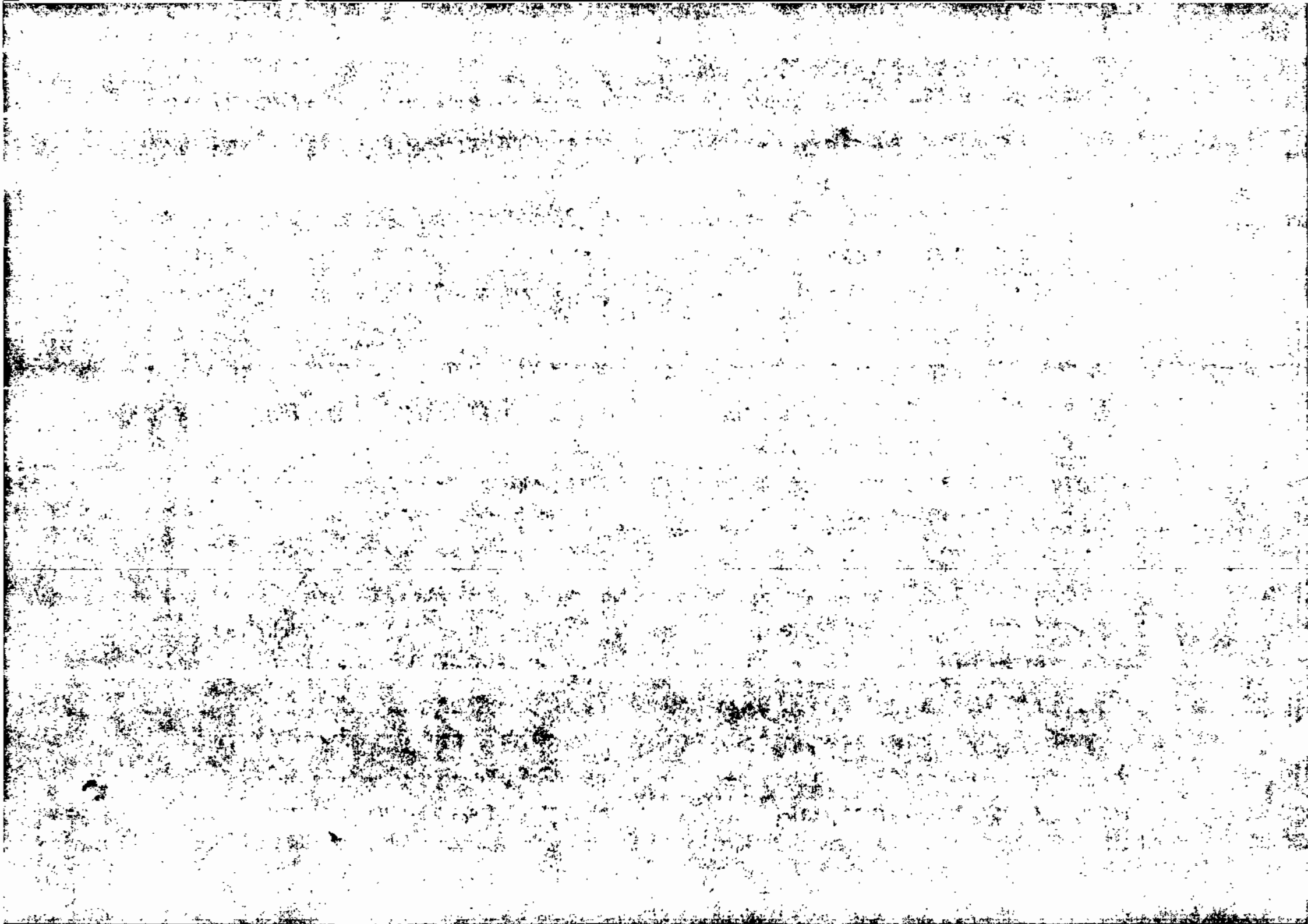
۲۔ نامزدگی کا بھی ایسی حالت میں ظہور میں آنا ناممکن ہے۔

۳۔ شوروی یعنی اکابر ملت کا فیصلہ بھی ناممکن العمل ہے اس لئے کہ اسے عام مسلمان اپنے حق رائے و ہمتی کے منافی تصور کرتے ہوئے قبول نہیں کریں گے۔ اور

۴۔ قہر و ظلم کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ اول تو ساری دنیائے اسلام پر بزدل شمشیر کسی شخص کا قابض ہو جانا ناممکن ہے اور اگر یہ صورت ممکن بھی ہو جائے تو اس شخصی حکمرانی کو غیر اسلامی قرار دیا جائے گا اور اسے خلافت الیہ کا مرتبہ عطا کرنے پر کوئی مسلمان تیار نہیں ہوگا۔

خلافت کے باب میں مسلمانوں کے ان مزعموات کا ابطال امیرالمومنین کی ایک ایسی عظیم الشان فتح ہے جس سے کوئی ہوش مند انسان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔

امیرالمومنین نے ان چاروں اصولوں کو جو قریش اور بنی امیہ کے خلافت سازوں نے وضع کئے تھے غلط قرار دیا تھا اس لئے کہ آپ کی دور بین نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ ایک زمانہ وہ آئے گا جب مسلمان اطراف و اکناف عالم میں پھیل جائیں گے اس لئے اعلیٰ نامزدگی اور شوروی کا امکان باقی نہیں رہے گا اور قہر و ظلم بھی ناممکن ہو جائے گا ایسی حالت میں اگر ان اصولوں پر خلافت کی اساس رکھی گئی تو دنیا سے خلافت کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور نظم ملی و ضبط شریعت کا وہ اہم ترین رکن جسے سرکار دو عالم کی خلافت سے تعبیر کیا جاتا ہے دنیا سے مفقود ہو جائے گا۔ مفاد پسندوں نے امیرالمومنین کی بات نہیں مانی اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ آج خلافت ہے اور نہ اس کے مبینہ اصول و دنیا علی کی





اصابت رائے اور پیشگی فکر کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہے اور عملاً یہ تسلیم کر رہی ہے کہ مدینہ کے قریش اور دمشق کے امویوں نے چند اصول وضع کر کے ملت اسلامیہ کو خلافت کے سے مہتمم ہائشان اوارہ سے محروم کر دیا۔ وقتی طور پر ان کی غرض ضرور پوری ہو گئی لیکن ملت اسلامیہ ان کی مفاد پسندی پر قربان ہو گئی۔ مسلمان شریعت کے ایک اہم جزو سے محروم ہو گئے ہیں اور عقیدہ کی سازش نے مسلمانوں کی سیاسی وحدت کا جنازہ نکال دیا۔

یہ ہے امیر المومنین کی وہ مہتمم ہائشان کامیابی جس پر عصر حاضر کا ہر مسلمان ایک خاموش گواہ بنا ہوا ہے اور چاہے زبانوں سے آج بھی اعلان نامزدگی، شور مچی اور قلم کے الفاظ جاری کئے جاتے ہوں لیکن ملت اسلامیہ کا عمل اس کی گواہی دے رہا ہے کہ نہ۔

یہ چاروں اصول باطل ہیں، اس لئے ان کی اساس پر جو خلافت قائم کی گئیں وہ بھی باطل تھیں اور خلافت حقہ وہی تھی، اس کا سچا اور دائمی اصول وہی تھا جس کا اعلان میدان غدیر میں کیا گیا تھا۔

☆══════☆☆══════☆

## صلح حسن

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد تحریک اسلامی کی قیادت کا بارگراں اس عظیم المرتبت امام کے کاندھوں پر آیا جسے دنیا سبط اکبر اور سید شباب اہل البیت کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

امام حسن علیہ السلام کی ذات گرامی پر دشمنوں نے ایسے پردے ڈال دیئے ہیں کہ دوست بھی آپ کے محیر العقول کارناموں سے بے خبر ہو گئے ہیں اور یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے وہ کم ہے۔

اس سید مظلوم نے جس وقت قوم کی قیادت سنبھالی اس وقت کے حالات کم و بیش کچھ ایسے تھے۔

۱۔ عراقی اپنا جذبہ جملہ کھو چکے تھے اور اسلام کی خاطر مزید جنگ جاری رکھنے پر تیار نہیں تھے۔ ان پر حکم طاری ہو چکی تھی۔ ان کے بازو جھول چکے تھے۔ دلوں پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا اور اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان سے کسی انقلابی یا اصولی تحریک میں مدد لی جاسکتی۔

۲۔ حجازیوں پر موت اس طرح طاری ہو چکی تھی کہ معاویہ کے سپاہیوں نے حجازی عورتوں کو کتیریں بنایا لیکن ان کی رگ حیات جوش میں نہ آئی۔ میر بن اوطاة نے مکہ پر لشکر کشی کی لیکن حجازی خاموش رہے اور اس طرح انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان میں لب اتنا بھی مذہبی جذبہ باقی نہیں ہے کہ وہ خانہ کعبہ کی حفاظت نہ سہی خود اپنی عزت و آبرو کا تحفظ بھی کر

سکیں۔

۱۔ مصری اور ایرانی اسلام کی انقلابی تحریک سے تقریباً نا آشنا تھے۔ ان کو گوار کے سارے اسلام پہنچا تھا اور ان لوگوں کے ذریعے پہنچا تھا جو خود اسلام کے مقاصد سے بڑی حد تک نا آشنا تھے اس لئے ان سے کسی اصولی جنگ میں مدد ملنے کا امکان نہیں تھا۔

۲۔ مسلمانوں کے نفوس اتنے خراب ہو چکے تھے کہ امیر معاویہ کا رویہ بڑے بڑے مسلمان اکابر کو آسانی سے خرید لیتا تھا۔

۵۔ مسلمانوں کے ذہنوں سے حکومت اہیہ کا تصور قطعاً ختم ہو چکا تھا۔ اور ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہو چکے تھے کہ علیؑ اور معاویہ کی حکومت میں فرق کیا ہے؟ انہوں نے حکومت اہیہ کو بادشاہت کا حروف سمجھنا شروع کر دیا تھا اور خلافت قیصریت کی ہم معنی قرار پانے لگی تھی۔

۶۔ جہالت کے نتیجے میں مسلمانوں کے عقائد بگڑنا شروع ہو گئے تھے اور تحصیل علم کے وسائل کم ہوتے جا رہے تھے۔

۷۔ مسلمان 'ابوزر' عمار اور ایسے ہی دوسرے بہت سے صحابہ کبار جو علم کے ستون ہدایت کے پیارے اور شریعت کے امین تھے دنیا سے اٹھ چکے تھے اور جو لوگ باقی تھے وہ اللاس، کسپہری اور بے چارگی کا شکار ہو چکے تھے۔

۸۔ شریعت اسلامی کے برباد ہو جانے کا وقت قریب آچکا تھا۔ اس لئے کہ مسلمانوں میں اتنی سکت باقی نہیں تھی کہ وہ اسے شامیوں کی دستبرد سے محفوظ رکھ سکیں۔

۹۔ مسلمان روحانی، اخلاقی اور دینی قدروں سے اتنے بیگانہ ہو چکے تھے کہ ان کو دوبارہ "مسلمان" بنانے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔

۱۰۔ مملکت اسلامی میں ہر طرف فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا شروع ہو گئی تھی اور امن و نظم کا خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔ بدامنی کی حالت میں علم، دین، تہذیب، تمدن، اخلاق اور دوسری اعلیٰ انسانی قدریں ختم ہو جاتی ہیں اس لئے جوں جوں بدامنی میں اضافہ ہو رہا تھا دوں دوں انسانیت کے اس اعلیٰ تصور کے مٹ جانے کے خطرات پیدا ہوتے جا رہے تھے جسے دنیا میں عام کرنا اسلام کا اولین مقصد تھا۔

۱۱۔ مملکت اسلامی میں بد نظمی پیدا ہو جانے کے نتیجے میں یہ خطرہ بھی ابھرنے لگا تھا کہ غیر مسلم طاقتیں دنیائے اسلام پر لشکر کشی کر کے اسلام کو فنا کر دیں گی اس لئے کہ اسلام گروہ پوش کے ممالک کی نگاہوں میں بری طرح کھٹک رہا تھا اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سیاسی قوت نے ہمسایہ ممالک کو مسلمانوں سے خوفزدہ کر دیا تھا۔

۱۲۔ ممالک غیر میں اسلام کی تبلیغ کا کام تقریباً بند ہو چکا تھا اس لئے کہ اندرونی خلفشار کی حالت میں اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے دوسرے قاصد کو جو کام انجام دینا تھے وہ صدمہ ذیل تھے:-

۱۔ دنیائے اسلام کو بنی امیہ کی اسلام دشمنی سے نجات دلانی جائے۔

۲۔ ملک میں داخلی سکون کا بندوبست کیا جائے تاکہ امن و سکون کی فضا میں مسلمانوں کی تربیت نفس کا انتظام کیا جاسکے۔ ان کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ قرآن اور حدیث کی تعلیم عام کی جائے۔ عوام کی اخلاقی حالت بہتر بنائی جائے اور مسلمانوں کو پھر ایک بار اس دین حقیقی سے آشنا کرایا جائے جسے وہ اب تقریباً بھول چکے تھے۔

۳۔ غیر ممالک تک اسلام کی آواز پہنچائی جائے اور غیر اسلامی قوتوں کا زور  
بل توڑ کر دوبارہ ان کے دلوں پر مسلمانوں کی حیثیت قائم کر دی جائے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ کیا ہو؟

جس وقت امام حسن علیہ السلام نے اسلام کے روحانی مشن کی قیادت  
سنبھالی اس وقت تواریس کبھی ہوئی تھیں۔ شام اور عراق کا سرحدی علاقہ ایک  
فوجی چھاؤنی نظر آ رہا تھا اور امیر معاویہ کی طاقت بڑھتی جا رہی تھی اس لئے کہ  
جہاں شامی سپاہی انتقام کے جذبہ میں سرشار پوری قوت سے ان کا ساتھ دے  
رہے تھے وہیں مسلمان موصوف کی سازشوں اور زہا شیوں کے نتیجہ میں بنی امیہ  
کے ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ امیر معاویہ کی طاقت بڑھنے کا لب ایک اور  
سبب بھی پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ موصوف نے اپنی جنگ کو حصول خلافت کی  
جنگ قرار دے دیا تھا اور اس طرح:-

۱۔ عام مسلمانوں کے ذہنوں سے یہ خوف دور ہو گیا تھا کہ امیر معاویہ کی  
ذمہ داری اسلام کی بربادی پر منتج ہوگی یا کامیاب ہونے کے بعد بنو امیہ ایام  
جاہلیت کی انعام پرستی کو دوبارہ رائج کر دیں گے۔

۲۔ آل رسول کے سارے دشمن جو انہی نظام حکومت کو اپنے مفادات اور  
اپنی ذرا اندوڑی کے منافی تصور کرتے تھے اب آسانی سے امیر معاویہ کا ساتھ  
دے سکتے تھے۔

۳۔ قریش چونکہ الہی حاکمیت کے مقابلے میں انسانی حاکمیت کے اصول کے  
پیشہ علمبردار رہے تھے اس لئے ان کو امیر معاویہ کی خلافت سے کوئی  
اختلاف نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس میں ان کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ  
جس نسلِ صحیبت کے علوی تھے وہ بنی امیہ کی حکمرانی میں پورے شباب کے

ساتھ طور میں آسکتی تھی۔

۴۔ وہ عراقی مسلمان بھی جو امیر معاویہ کے مقابلے میں حضرت علی علیہ  
السلام کا ساتھ دے رہے تھے انسانی حاکمیت کے تصور کے پروردہ تھے اور  
حضرت علی علیہ السلام کے شہید ہو جانے کے بعد خلیفہ کے "انتخاب" کے  
محلہ میں وہ "آزاد" ہو چکے تھے۔ یہ لوگ بھی خلافت کو کوئی منصوص من  
اللہ منصب نہیں مانتے تھے اور نہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اولی الامر کو موصوم  
ہونا چاہیے۔ ان کے ذہنوں میں یہ عقیدہ بالکل رچا بسا ہوا تھا کہ ہر مسلمان  
خواہ وہ ذاتی اعتبار سے کیسا ہی کیوں نہ ہو خلیفہ رسول ہو سکتا ہے اس لئے  
معاویہ کی خلافت مان لینے میں ان کو کیا عذر ہو سکتا تھا؟ اور وہ بھی اس  
حالت میں جب کہ امیر معاویہ کا ساتھ دینے میں ونوی منفعت بھی مضمر  
تھی۔ ایسی حالت میں عراقی بھی رفتہ رفتہ امیر شام کے ساتھ ہوتے جا رہے  
تھے۔

ان حالات میں اگر حضرت امام حسن علیہ السلام جنگ جاری رکھتے تو اس کا  
نتیجہ یہ ہوتا کہ:-

۱۔ آپ اور آپ کے ساتھی سچے مسلمان جو شریعت کے حزیں دار دین کے  
ستون اور علم و ہدایت کے امین تھے قتل ہو جاتے اور حقیقی اسلام تبلیغ  
کرنے والا یا دین بین کے حقائق دنیا کے سامنے پیش کرنے والا کوئی باقی نہ  
رہتا۔

۲۔ جنگ کی حالت میں شامی سپاہوں کا انتظامی جذبہ بیدار رہتا اور اسلام اور  
اس کے مآثر کو مٹا دینے کی جو تہما ان کے دلوں میں موجزن تھی وہ برابر  
موجود رہتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آل رسول کی شکست کے نتیجہ میں شامی

اسلام اور اس کے ماثر کو فنا کر دیتے۔

س۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ جنگ جاری رکھنے کی صورت میں امام حسن علیہ السلام کو فتح حاصل ہو جاتی، حالانکہ یہ قطعاً "بغیر از قیاس" ہے۔ تب بھی امام کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ اسلامی نظام حکومت قائم فرماتے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے نفوس اتنے بگڑ چکے تھے اور حرص دنیا ان پر اس حد تک غالب آچکی تھی کہ اب وہ اس نظام زندگی کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے جو علوی نظام حکومت کا خاصہ تھا۔

ایسی حالت میں فتح حاصل کرنا بے سود تھا اس لئے کہ امام حسن علیہ السلام کے نزدیک فتح حاصل کرنے کا مقصد اپنی ذاتی بادشاہت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ فتح کا مقصد اس نظام حکومت الہیہ کو وجود میں لانا تھا جس کا وجود میں آنا اب تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ نفوس کے بگڑ جانے، عقائد کے کمزور ہو جانے، قلوب پر دنیا پرستی طاری ہو جانے اور جذبہ دینی کمزور پڑ جانے کے بعد ایک دنیوی حکومت تو قائم ہو سکتی ہے لیکن ایک خالص اصولی شری اور دینی حکومت کا قیام ناممکن ہے۔

امام حسن علیہ السلام بادشاہ ہوتے تو ان کو اس سے کوئی غرض نہ ہوتی کہ عوام کے نفوس کا کیا عالم ہے؟ ان کی اخلاقی اور روحانی حیثیت کیا ہے؟ اور مذہب کے باب میں ان کی حالت کیا ہو رہی ہے؟ ان کو اگر مطلب ہو تا تو اپنی اپنی حکومت سے، خزانوں سے، دولت سے، خدام و حشم سے، شاہانہ جاہ و جلال سے، مملکت و قصور سے اور جب تک ان کو یہ سب چیزیں حاصل رہتیں تب تک ان کو عوام کی حالت سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ لیکن "امام حسن" تھے بادشاہ نہیں تھے۔ تحریک اسلامی کے قائد تھے سلطان نہیں تھے۔ امیر المؤمنین اور خلیفہ رسول

تھے۔ دنیوی حکومت کے طالب نہیں تھے۔ ان کا کام ایک شاندار عمل میں بیٹھ کر دلو عشرت دینا نہیں تھا، مسلمانوں کے نفوس کی اصلاح کرنا اور دین کی تبلیغ کرنا تھا۔ وہ جو اہل بیت سے کھینچنے کے لئے خلق نہیں ہوئے تھے، اسلامی تحریک کو پروان چڑھانے کے لئے پیدا کئے گئے تھے۔ ان کو حکومت سے اگر کچھ دلچسپی ہو سکتی تھی تو اس لئے نہیں کہ ان کا حکم چلے بلکہ اس لئے کہ اللہ کے احکام نافذ ہوں۔ ان کا مقصد حکمرانی ذاتی نظام میں قادیان کا قائد اور ملت کی شری مخلوط پر عظیم ان کا مطلوب تھی اور جس حکومت سے یہ مقصد ہی پورا نہ ہو اس کی ان کو کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایسی حکومت کا حاصل ہونا تحریک اسلامی کے قائد کی مقصدی شکست اور اس کے نقطہ نظر سے ایک قطعاً "فضول" اور بے کاری بات تھی۔ اس لئے امام نے وہ کیا جو حکمت ربانی کے امین کی حیثیت سے آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ آپ نے معاویہ سے "صلح" کر لی اور حکومت سے دستبردار ہو گئے۔

اس "صلح" پر کج فہم اور کم عقل لوگ بڑا اعتراض کرتے ہیں لیکن اعتراضات دراصل ان کی کوئی نظری اور نا سچی کے علاوہ اور کسی شے کا پتہ نہیں دیتے، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ:-

۱۔ اس "صلح" کے نتیجے میں امام حسن علیہ السلام اس شکست سے بچ گئے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آل رسول ذبح ہو جاتی۔ اسلام کے سچے پرستار قتل ہو جاتے اور دنیا سے اسلام اور اس کی تعلیمات کا خاتمہ ہو جاتا۔

۲۔ اس "صلح" کے نتیجے میں حدود مملکت اسلامی میں امن و امان قائم ہو گیا جس کے نتیجے میں امام حسن علیہ السلام کو یہ موقع مل گیا کہ آپ پر سکون حالات میں اسلام کی تبلیغ کر سکیں اور جہالت کے نتیجے میں اسلامی تصور زندگی پر جو پردے پڑ چکے تھے ان کو دور کر کے عربوں کے سامنے پھر

ایک بار اس اسلام کو پیش کر دیں جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا تھا۔

۳۔ مرکز حکومت و مشن شکل ہو جانے کی وجہ سے مدینہ سیاسی کوپروشوں اور دنیاوادلوں کی سرگرمیوں سے بڑی حد تک پاک ہو گیا اور آل رسول کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اس بلند محترم میں قیام پذیر ہو کر دوبارہ اسی شہر سے اسلام کا آواز بلند کرے جہاں سے خود رسول پاک نے چارواگ عالم میں اپنی آواز پہنچائی تھی۔ امام حسن علیہ السلام نے رفتہ رفتہ مدینہ کو وہی شکل عطا کرنا شروع کی جو امیرالمومنین علیہ السلام نے کوفہ کو عطا فرمائی تھی اور اپنی علمی سرگرمیوں کے ذریعے مدینہ کو ایک علمی مرکز کی شکل میں تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

۴۔ مدینہ کی مذہبی حیثیت کے پیش نظر ہر جگہ کے مسلمان اس شہر میں آتے تھے اور قبر رسول کی زیارت کے بعد آل رسول کی زیارت سے بھی شرف ہوتے تھے۔ ان مسلمانوں کے ذریعے پوری دنیا سے اسلام میں حقیقی اسلام کی تبلیغ کا موقع حاصل کر لیا گیا۔

۵۔ امام حسن علیہ السلام کی اسی تعلیم اور تبلیغ کا نتیجہ یہ تھا کہ کچھ عرصہ میں ایسے دیندار سرفروش اور فداکار مسلمانوں کی جماعت تیار ہو گئی جس نے کربلا کے میدان میں اپنے خون کی پاک دھاروں سے چہستان اسلام کو ہمارے جلوہ لای عطا کر دی۔ اگر امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے جنگ بند کر کے اپنی سرگرمیاں اسلام حقیقی کی تبلیغ و اشاعت پر مرکوز نہ کر دی ہوتیں تو معرکہ کرب و بلا کا وجود میں آنا ناممکن تھا۔ اگر یہ معرکہ وجود میں آتا بھی تو اس کے وہ ہمہ گیر اثرات ہرگز مرتب نہ ہوتے جو بعد میں ظہور

میں آئے۔ اس لئے کہ قربانی اسی وقت صحیح معنوں میں اثر انداز ہوتی ہے جب عوام ان بنیادی اصولوں سے متعلق ہوتے ہیں جن کے لئے قربانی پیش کی جاتی ہے۔ یہ قربانی مردہ دلوں کو زندہ اور سوتے ہوئے ضمیروں کو بیدار کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں عوام کی عملی قومیں جاگ پڑتی ہیں اور وہ ایک بے حس جمود پروردگار کے بجائے ایک زندہ، متحرک اور فعال جماعت بن جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوتا ہے جب عوام کے ذہن ایک تصور کی صحت، ایک عقیدہ کی درستی، ایک فکر کی اصابت یا ایک نظریہ کی حقیقت کے دل سے قائل ہو جاتے ہیں۔ جب عوام ایک چیز کو صحیح جاننے اور ماننے لگتے ہیں اور پھر اس چیز کے حق میں کوئی قربانی بھی پیش کر دی جاتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام میں ایک جوش اور ایک ولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس قربانی کے نتیجے میں پوری قوم اس تصور کو کامیاب بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر حضرت امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ سے ”صلح“ کر کے اسلام کے صحیح تصورات کو عام نہ کر دیتے تو امام حسین علیہ السلام کی قربانی قطعاً رائیگاں جاتی اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے ضمیر ہرگز اس شان سے بیدار نہ ہوتے جس کا مظاہرہ اس عظیم الشان قربانی کے بعد ہوا۔ مسلمانوں نے معرکہ کربلا کے بعد جس زندگی کا مظاہرہ کیا وہ دراصل اس تبلیغ اور تعلیم کا نتیجہ تھی جو امام حسن علیہ السلام نے فرمائی تھی اور جس کے نتیجے میں دنیائے اسلام کا گوشہ گوشہ آل رسول کی تحریک اسلامی سے واقف ہو چکا تھا۔

تحریک کے بنیادی تصورات عام ہو جانے کے نتیجے میں فلسفین کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جو اس تحریک کو علمی سطح سے بلند کر کے ایک عملی اور جاہلانی

صلح پر لانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر تیار تھا۔ یہی وہ جماعت تھی جس نے کربلا کے بن میں وہ عظیم الشان قربانی پیش کی جس پر تاریخ اسلام قیامت تک ناز کرتی رہے گی۔

امام حسن علیہ السلام کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کا اس سے بڑا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ آپ نے اسلامی تحریک کو جماعتی اور عوامی نفسیات کے مطابق ڈھال دیا۔ عصر حاضر کی تحریکات پر نظر ڈالنے تو آپ دیکھیں گے کہ وہی تحریکات کامیاب ہوتی ہیں جن کے قائدین مندرجہ ذیل طریق کار اختیار کرتے ہیں:-

۱۔ سب سے پہلے اس تحریک کے حق میں ذہن ہموار کی جاتی ہے۔ تحریک کے بنیادی تصورات کی خوب اشاعت کی جاتی ہے۔ ان کو عوام میں مقبول بنایا جاتا ہے۔ عوام کے ذہنوں میں اس کی صحت و اصابت کا یقین پیدا کیا جاتا ہے اور جب تحریک کے اساسی مقاصد عام ہو جاتے ہیں تو

۲۔ ایسے افراد تیار کئے جاتے ہیں جو اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے قربانیاں پیش کر سکیں تاکہ ان قربانیوں کے نتیجہ میں عوام میں جوش پیدا ہو جائے اور تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

امام حسن علیہ السلام نے یہی سائنٹفک طریقہ اختیار کیا اور ”صلح“ کے نتیجہ میں وہ حملت حاصل کر لی جس سے قائمہ اٹھا کر ایک طرف تو آپ نے اسلامی تحریک کو عام کر دیا جو جہالت، بد امنی، غرض مندی، حرص دنیا اور اسی قسم کی چیزوں کے نتیجہ میں دب گئی تھی اور دوسری طرف (فقہین کی وہ جماعت تیار کر دی جس نے معرکہ کربلا میں اپنے خون سے اس تحریک کی جڑوں کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ انسانی حاکمیت کے عرصہ سو سال بھی کچ تک حکومت ایسے کے اس تصور کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے جسے حسین علیہم السلام عام کرنا چاہتے

تھے

ہم نے تو ”صلح“ کو بیکہ بیکہ اس میں لگا ہے اس لئے کہ علماء و بزرگ علماء ہیں کہ  
امیر مومنین اور امام حسن علیہ السلام کے بائیں ہاں معاہدہ ہوا تھا وہ مرکز ”صلح“ کا صلہ میں  
تھا اور یہ ایک اعلیٰ درجہ کا صلہ تھا جس سے جس میں وا تو مورخین نے لکھا ہے اس کی  
اس کے ہر پہلو سے اس کو لکھا گیا ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے امیر مہلوبہ سے ہرگز صلح نہیں کی اس لئے کہ صلح کا مقصد ہوتا ہے دلوں کا صاف ہو جانا، جنگ کا خاتمہ ہو جانا، میل ملاپ ہو جانا، دوستانہ تعلقات بحال ہو جانا اور آپس کی آویزش کا ختم ہو جانا لیکن دنیا کا کوئی مورخ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ امیر مہلوبہ اور امام حسن علیہ السلام میں صفائی ہو گئی تھی۔ دوستانہ لفظ قائم ہو گئی تھی یا اس ٹکراؤ کا خاتمہ ہو گیا تھا جو آل سفیان اور آل رسول میں مدت سے جاری تھا۔

واقعہ صرف اتنا ہے کہ امام حسن علیہ السلام اور امیر مہلوبہ کے بائیں ”صلح“ کا معاہدہ نہیں ہوا تھا بلکہ

”التوائے جنگ“ یا ”جنگ بندی“ کا معاہدہ ہوا تھا جسے انگریزی زبان میں Cease Fire کہتے ہیں۔

جنگ بندی کے اس معاہدہ کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ طرفین اپنے اپنے موقف پر قائم ہیں لیکن ایک دوسرے کے مقابلہ میں ٹکراؤ نہیں چلا رہے ہیں۔ التوائے جنگ کا مقصد صلح نہیں ہونا، صرف سچ و تفک کا استعمال ترک کر

دینا ہوا کرتا ہے۔ امام حسن علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ آپ نے شمشیر و سنان کی جگہ بند کر دی تھی لیکن اس کے متنی ہرگز یہ نہیں تھے کہ آپ نے مطلق جگہ ہی کاغذاً کر دیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ آپ نے "گرم جگہ" کا رخ "سرد جگہ" کی جانب موڑ دیا تھا اور نمود شمشیر کی جگہ "اصطلاحی جگہ" (Cold War or War of Nerves) شروع کر دی تھی۔ یہ ہے حقیقت اس معاہدہ کی جسے "صلح حسن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی بنیاد پر ناظم لوگ جو حکمت ربانی کے مصلح کو نہیں سمجھتے یا فکر امامت کی بلند پروازیوں کا کوئی اندازہ نہیں رکھتے، طرح طرح کے اعتراضات کیا کرتے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے "صلح" کر لی ہوئی تو معمولی روایت اور شراکت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ بھی معاویہ کے خلاف لب کشائی نہ کرتے۔ اس کی حکومت کو جائز مان لیتے اور اس حکومت کا ساتھ دیتے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ معاہدہ پر دستخط کرتے ہی خود امیر معاویہ کے خیمہ میں امام حسن علیہ السلام نے جو خطبہ پڑھا اس کا آغاز آپ نے ان الفاظ سے کیا کہ:-

"۱۳۰ معاالناس! ہم تمہارے رسول کے لیل بیتہ تھیں۔

ہم تمہارے امیر اور سردار ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے ہر

رجس سے پاک کیا ہے۔"

"ہم تمہارے امیر ہیں" کا دعویٰ بجائے خود یہ ثابت کر رہا ہے کہ امام حسن علیہ السلام اپنے سابقہ موقف پر قائم تھے۔ اپنے حق خلافت سے دستبردار نہیں ہوئے تھے، امیر معاویہ کو جائز حکمران تسلیم نہیں کرتے تھے اور آپ نے صرف اتنا ہی جگہ کا معاہدہ کیا تھا کہ اب تواریک کی اس جگہ کے بجائے جس میں شکست ہو جانا لازمی تھا۔ عدم تشدد والی جگہ کا آغاز کر کے اس معاہدہ سے

دشمن کو شکست فاش دے دی جائے۔

امیر معاویہ بھی نا سمجھ نہیں تھے، وہ یہ جانتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام نے جگہ ختم نہیں کی ہے بلکہ صرف شمشیر و سنان کا مظاہرہ بند کیا ہے۔ آل رسول اور بنی امیہ، حق اور باطل کے مابین صلح نہیں ہوئی ہے بلکہ صرف جگہ کا اندازہ بدل دیا گیا ہے۔ جگہ اب بھی جاری ہے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اب یہ جگہ تلوار سے نہیں لڑی جائے گی، زبان و قلم سے لڑی جائے گی۔ اس کا فیصلہ میدان حرب و ضرب میں نہیں ہو گا۔ سیاست اور ظم کی برہم میں کیا جائے گا۔ چنانچہ امیر معاویہ بھی غافل نہیں رہے اور انہوں نے اس "اصطلاحی جگہ" میں فتح حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ امیر المومنین پر سب و شتم اور آل رسول کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈا اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ امام کی عقل چونکہ عام عقول بشری سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اس لئے امیر معاویہ اس "جگہ" میں بری طرح ہارے اور امام حسن علیہ السلام کو ان کے مقابلہ میں وہ فتح مبین حاصل ہوئی جس کی وہ تاریخیں بھی گواہ ہیں جو بنی امیہ کے اثرات کے ماتحت لکھی گئی ہیں۔

معاہدہ کرتے وقت امیر معاویہ نے شاید یہ محسوس کیا ہو کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان کو یہ محسوس ہو گیا کہ ان کو سیاسی اقتدار سے زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے اور امام حسن علیہ السلام نے تلوار کی جگہ روک کر ان کو ایسی دک دی ہے جو ان کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے دل کے پردوں میں جس اسلام کو منانے کے تمنائی تھے اس کی حسن پہ نظیرین م تبلیغ کر رہے تھے۔ مسلمانوں میں بنی امیہ کی بادشاہت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہونا چاہ رہا ہے اور رفتہ رفتہ عوام میں یہ

احساس بیدار ہو رہا ہے کہ لن کی قیادت و رہنمائی کا کام صرف آل رسولؑ ہی انجام دے سکتی ہے لن کی دورنیں لگا ہوں نے یہ دیکھ لیا کہ حسنؑ جس روش پر چل رہے ہیں اس کا لازمی نتیجہ ایک دن دولت بنی امیہ کے زوال کی شکل میں برآمد ہو گا اور آل رسولؑ کی تبلیغی مہم وہ بارود ثابت ہو گی جس سے بنی امیہ کے اقتدار کا محل بھک سے اڑ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ محسوس کیا کہ حسنؑ نے معاہدہ کے جو شرائط رکھے ہیں لن کے نتیجہ میں جہاں آل رسولؑ حکومت امیہ کے تصورات کو عام کرنے اور اسلام کے ملوکیت دشمن نظام زندگی کو دنیا کے سامنے پیش کرنے میں پورے طور پر آڑلو ہے وہیں لن شرائط نے بنی امیہ کے ہاتھوں کو ہاندہ کے رکھ دیا ہے۔ لن کو بے بس بنا ڈالا ہے اور لن کو کسی جوابی کارروائی کے قابل نہیں رکھا ہے۔ اس لئے کہ جب معاہدہ کی رو سے بنی امیہ علی اور آل علی پر سب و شتم نہیں کر سکتے اور علی کے دوستوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ تحریک اسلامی پھلتی پھولتی رہے گی۔ الہی نظام زندگی کی تبلیغ جاری رہے گی اور لوگ ملوکیت کے اثرات بد کو دیکھتے ہوئے رفتہ رفتہ اس خلافت ربانی کی جانب جھکتے چلے جائیں گے جس کے امام حسن علیہ السلام علیہ السلام طبردار تھے۔ اس سیاسی شکست سے بچنے کے لئے امیر معاویہ اس پر مجبور ہو گئے کہ معاہدہ کی خلاف ورزی کریں چنانچہ شیعین علیؑ پر جو اسلام حقیقی کے داعی اور مبلغ تھے سختیاں شروع کر دی گئیں۔ جبر بن عدی، رشید ہجری اور دوسرے ممتاز طلبائے اسلام قتل کرادئے گئے۔ حضرت علیؑ علیہ السلام پر سب و شتم کیا جانے لگا اور جب یہ محسوس کیا گیا کہ لن تدبیروں سے بھی کام نہیں لگتا حسنؑ کی تبلیغ مملکت کو بنی امیہ کے لئے ایک کوا آتش نشان میں تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ عوام بنی امیہ کی حقیقت کو سمجھنے لگے ہیں۔ مرہہ دلوں میں اسلام کی روح

بیدار ہونے لگی ہے اور تحت خلافت کی چولیس کزور ہوتی جا رہی ہیں تو آخری تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دے دیا جائے اور اس طرح اس دولت بنی امیہ کو چاہی سے بچا لیا جائے جسے امام حسنؑ کی تبلیغی جنگ اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتی چلی جا رہی تھی۔

اگر امیر معاویہ اور امام حسن علیہ السلام میں واقعی ”صلح“ ہو گئی ہوتی تو امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوانے کی امیر معاویہ کو کوئی ضرورت پیش نہ آتی اور یہ بھی حنیفہ کے دل سے اس کے بعد نہ بھانپنے کا یہ واقعہ بچنے خود سے کا شکت ہے۔ جنگ چھیننے سے صرف یہ نہ بچتا ہے یہ تو صورت حسن نہیں ہو رہا تھا۔ عقل و دفاع کی جنگ ہو رہی تھی اور اس میں چونکہ امیر معاویہ مات کھا رہے تھے اس لئے وہ اس پر مجبور ہو گئے تھے کہ اپنے حریف کو زہر دلا کے اس کا کام تمام کرا دیں تاکہ اس شکست سے محفوظ رہ سکیں جو ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

لیکن امیر معاویہ اپنی لن تدبیروں میں بھی ناکام رہے اس لئے حکومت امیہ کا قبور ابھر کے رہا اور بنی امیہ کے خلاف ایسی نفرت پھیلی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف یہ کہ لن کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا لن کی نسل تک دنیا سے فنا ہو گئی بلکہ لن کی قبروں کے نشان تک محو ہو گئے اور یہ سب نتیجہ تھا امیر معاویہ کی اس سیاسی لفظی کا کہ انہوں نے عین اس وقت جبکہ فتح ان کے سامنے تھی انہوں نے جنگ کے معاہدہ پر دستخط کر دئے اور امام حسنؑ کو اس کا موقع دے دیا کہ وہ بنی امیہ کی جیتی ہوئی ہڈی کو الٹ کر اس اسلام دشمن جماعت کے مکمل خاتمہ کا بندوبست کر دیں۔

امیر معاویہ نے اس ہولناک نتیجہ سے بچنے کے لئے معاہدہ کی خلاف



ورزیاں شروع کیں جس کا ایک معمولی نتیجہ یہ ہے کہ ان کو دائمی بدنامی کا شکار ہونا پڑا اور کج دنیا کے ہر انصاف پسند انسان کی نگاہ میں وہ ایک معاہدہ سے منحرف انسان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام حسن علیہ السلام معاہدہ کرتے وقت اس حقیقت کو بخوبی جانتے تھے کہ معاہدہ اس کی پابندی نہیں کریں گے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھے کہ معاہدہ کی جانب سے شرائط معاہدہ کی خلاف ورزی تحریک اسلامی کو کمزور نہیں کر سکے گی، اسے مضبوط تر بنا دے گی۔ اس لئے کہ بدعہدی، مظالم، قتل، خونریزی اور سازشیں عوام کو بنی امیہ سے اور زیادہ بدظن کر دیں گی اور یہ اموی تداریک بنی امیہ کے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بجائے اس کے خاتمہ کا جلد تر بندوبست کر دیں گی۔ چنانچہ وہی ہوا جو امام کا اندازہ تھا۔ امیر معاہدہ نے وہی کیا جس کا امام کو علم تھا اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس کی امام کو امید تھی۔ بنی امیہ کے مظالم نے چند ہی سال میں عوام کو ان کی حکومت سے ہٹ کر دیا اور ان میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ مسلمانوں کی قیادت اور امارت کے حقدار صرف آل رسول کے افراد ہیں اور یہی امیر معاہدہ کی سیاسی شکست تھی۔

اس معاہدہ سے امیر معاہدہ کو بس ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ ان کو حکومت مل گئی لیکن ہم اسے ان کی فتح نہیں قرار دے سکتے اس لئے کہ ان کو جن شرائط کے ساتھ حکومت ملی تھی وہی خود اس حکومت کی محزیب کا سبب تھے اور اس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ بنی امیہ کا مقصد اصلی یعنی اسلام کو مٹا دینا ختم ہو گیا بلکہ وہ حکومت بھی کچھ عرصہ میں ختم ہو گئی جس کے لئے امیر معاہدہ نے خود اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کی تحریک کا گلا گھونٹنا قبول کر لیا تھا۔ امیر معاہدہ کو پادشاہت ضرور نصیب ہوئی لیکن ایک ایسی پادشاہت جو ان کے لئے دائمی بدنامی کا تفسہ بنی

اور پھر یہ حکومت بھی کتنے دن چلی۔ میں سارے امیر معاہدہ حکمران رہے اور سارے تین سال ان کی نواہ۔ اس کے بعد حکومت کے ساتھ ہی نسل تک کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت آل ابو سفیان سے نکل کر آل مولان میں چلی گئی۔ یہ تھا وہ فائدہ جو امیر معاہدہ نے حاصل کیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی بڑی کامیابی تھی؟

لب آئیے یہ دیکھیں کہ اس معاہدہ سے امام حسن علیہ السلام نے کیا کھویا؟ یہ کما غلط ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے امیر معاہدہ کو "خلافت" دے دی اس لئے کہ "خلافت" ایک ایسا منصب رہائی ہے جو نہ معاہدوں سے بنا کر تا ہے اور نہ لوگوں سے چھنا کر تا ہے۔ خلافت تقسیم ہونے والی چیز نہیں ہے اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ امام حسن علیہ السلام نے امیر معاہدہ کو خلافت دے دی یا امیر معاہدہ نے خلافت لے لی۔ امیر معاہدہ کو دراصل پادشاہت حاصل ہوئی تھی اور "پادشاہت" وہ چیز تھی جس سے امام حسن کو کوئی دلچسپی نہیں تھی امیر معاہدہ کو "پادشاہت" درکار تھی اور "پادشاہت" چونکہ ایک غیر اسلامی شے ہے اس لئے امام حسن علیہ السلام نے ان کو "پادشاہت" لے لینے کی اجازت دے دی۔ ظاہر ہے کہ اس میں امام حسن علیہ السلام کا کوئی نقصان نہیں تھا بلکہ اس کے نتیجہ میں خود امیر معاہدہ پر اسلام میں طوہرت کے قیام اور نسل پادشاہت کے اتناز کا الزام آیا ایسی حالت میں اگر امیر معاہدہ "پادشاہت" بین گئے تو امام حسن علیہ السلام کا کچھ نہیں بگاڑا۔ آپ کا جو منصب تھا وہ آپ کو حاصل رہا۔ چنانچہ معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد ہی آپ نے خود امیر معاہدہ کے دربار میں —

نحن امرناکم

کہہ کر اس کی وضاحت کر دی تھی کہ جہاں تک خلافت رہائی کا تعلق ہے وہ اس

بے اختیار جنگ جاتے ہیں، اسلام کے دشمن بنی امیہ اور شامی عیسائیوں کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اسلام دشمن مسیحی قوتوں سے ٹکرائیں اور اسلام کے لئے ممالک فتح کرتے پھریں اور اس سب کی قیمت محض وہ چند روزہ بادشاہت جو دائمی بدنامی کا سبب بنے۔ اس الٹی سیاست اور منصوص من اللہ قیادت ہی سے ممکن ہے جس پر ہمارے ائمہ فائز تھے۔

اس عظیم سیاست کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ شامیوں نے ۵۹۵ء میں اپنے چروں پر اسلام کی جو مصنوعی نقاب ڈالی تھی اسے وہ ۶۰۰ء تک ڈالے رہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس ۴۵ سال کے عرصہ میں لن کی وہ نسل ختم ہو گئی جس نے توار کے خوف سے اسلام قبول کیا تھا اور اپنے دل کے پردوں میں مسیحیت کو چھپائے تھی۔ اور وہ نسل وجود میں آگئی جو بنی امیہ کی تعلیم کے نتیجہ میں آل رسولؐ کی دشمن تو ضرور تھی لیکن اسلام سے مانوس تھی، یہ صحیح ہے کہ اس کا "اسلام" عقائد و اعمال کے اعتبار سے حدود درجہ پست اور سبک تھا لیکن یہ ہی نسل مسیحی نہیں رہی تھی، فلذا عقائد و افکار میں جٹا ہونے کے باوجود مسلمان تھی اور اس قابل ہو گئی تھی کہ۔

- ۱۔ ایک عظیم قربانی پیش کر کے اس کے ضمیر کو چھین دیا جائے اور
- ۲۔ پھر اس جاگے ہوئے ضمیر پر تبلیغ کا فریضہ انجام دے کر اسے سچا مسلمان بنا دیا جائے۔

اس میں سے اول الذکر فریضہ امام حسین علیہ السلام نے انجام دیا اور دوسرا کام بنیاد رکھنے پر پورا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے دشمنوں کا سب سے بڑا مرکز "شام" اسلام کے ایک ایسے مستحکم قلعہ میں تبدیل ہو گیا جسے دنیائے مسیحیت آج تک تسخیر نہیں کر سکی اور وہ شام چودہ سو سال سے آج تک مسلمان

ہے جسے امیر معاویہ اسلام کی فتح مکی کے مرکز میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔

امیرالمومنینؑ نے جنگ یمن کو طویل دے کر اسلام کے خلاف شامیوں کے غم و غصہ کو بڑی حد تک فرو کر دیا تھا لیکن امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کو بادشاہت کا کھلونا دے کے شامیوں کی بیاطن مسیحی اور بظاہر مسلمان نسل کو مسلمانوں کے مقابلہ میں مفلوج بنا دیا۔ اس مہم میں ۳۶۱ء سے ۶۰۰ء آگیا۔ چھتیس سال تک آل رسولؐ کو صبر اور استقلال سے کام لینا پڑا لیکن آج اسی چھتیس سال کی صبر آزما محنت اور لاکھ کی قربانی کا یہ نتیجہ ہے کہ شام مسلمان ہے اور وہاں آل رسولؐ کے مزارات اسلام کی عظیم الشان کامیابی کا اعلان کر رہے ہیں۔

امام حسن علیہ السلام کی شامیوں سے جنگ بادشاہت کے لئے نہیں تھی، اسلام کے لئے تھی اور اس سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ حسنؑ نے اپنے حسن قدر سے اسلام کی یہ جنگ اس شان سے جیتی کہ آج تک شام پر پرچم اسلام نہایت شان سے لہرانا نظر آ رہا ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے اس معاہدہ کے ذریعہ صرف یہی نہیں کہ امیر معاویہ کو اسلام اور کفر کے اس معرکہ میں پسپائی پر مجبور کر دیا جو چار سال سے یمن کی سرزمین پر جاری تھا بلکہ عقائد کی جنگ بھی بڑی خوبصورتی سے جیت لی جس پر بہت کم مورخین کی نظر جاتی ہے۔

آپؑ نے جہاد کی سب سے پہلی شرط یہ رکھی کہ "معاویہ کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کے مطابق حکومت کرے گا۔" اور معاویہ نے اس شرط کو قبول کر لیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ امیر معاویہ اور لن کے ساتھیوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ کتاب اللہ اور میراث الرسولؐ

کے ساتھ سیرت شیعین کی وہ شرط جو عبدالرحمن بن عوف نے ایجاد کی تھی اور جس کی اساس پر حضرت عثمان کو خلافت عطا کی گئی تھی قطعاً غلط تھی اور یہ ایک ایسی بدعت تھی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

تاریخ میں امیر معاویہ کو شیعین عثمان کا سرگودہ قرار دیا جاتا ہے اور آپ نے امیرالمومنین کے خلاف بغاوت کا پرچم بھی قصاص خون عثمان کے نام پر بلند فرمایا تھا لیکن سیرت شیعین کی شرط اڑا دیے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر معاویہ نے خود عملاً حضرت عثمان کی تکذیب کی اور حضرت علیؑ کے موقف کی تائید کر دی۔ گویا حصول حکومت کے لئے امیر معاویہ نے اپنا مذہب بدل دیا۔ عثمانی نظریہ کی جگہ ملوی نظریہ قبول کر لیا اور اس طرح دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ بنی امیہ کا "ایمان" صرف اقتدار، حکومت اور خزانوں پر تھا کسی اصول پر نہیں۔

دنیاۓ اسلام نے امیر معاویہ کی بیعت کر کے گویا یہ اصول مان لیا کہ حکومت کی بنیاد کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے اور سیرت شیعین کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دنیاۓ اسلام کے اس عملی اعتراف کے منطقی طور پر یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں:-

- ۱۔ حضرت عثمان کی خلافت باطل ہو جاتی ہے اس لئے کہ آپ کو ایک غلط اصول گھر کے اس کی بنیاد پر حکومت دے دی گئی تھی۔
- ۲۔ جن صحابہ نے یہ اصول وضع کیا تھا یا اسے تسلیم کیا تھا وہ ایک بدعت کے مرتکب ہوئے اس لئے ان کی عدالت کا نظریہ باطل ٹھہرتا ہے۔
- ۳۔ ملت اسلامیہ نے ۶۵ھ میں سیرت شیعین کے سوال پر "اجماع" کر لیا تھا اور ۶۶۰ھ میں اسے ختم کر دینے پر "اجماع" کر لیا۔ (جس کا ثبوت حضرت عثمان اور امیر معاویہ کی بیعت سے مل جاتا ہے جو سب مسلمانوں نے کی

تھی) اس سے ظاہر ہوا کہ "اجماع" کی کوئی حقیقت نہیں ہے اس لئے کہ جس اجماع امت کا فیصلہ پندرہ برس میں بدل جائے اسے غلطی سے ماوراء قرار دینا قطعاً منافی عقل و بصیرت ہے۔

۴۔ جب اجماع کے صحیح ہونے کا اصول باطل ٹھہرا تو حضرت ابو بکر کی خلافت بھی ختم ہو گئی جسے اجماع کے سارے جائز قرار دیا گیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ حضرت عمر کی خلافت بھی تشریف لے گئی۔ اس لئے کہ وہ ایک غلط اصول کے ماتحت منتخب کئے ہوئے ظیفہ کے نامزد کردہ جانشین تھے، جب نامزد کرنے والے کی حقیقت ہی ختم ہو گئی تو نامزد ہونے والے کی حقیقت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

بہر حال امام حسن علیہ السلام نے محض اس ایک شرط سے حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان تینوں کی خلافت کو باطل ٹھہرایا اور اس طرح مذہب حقہ کی وضاحت کا اہم دینی فرض جو آپ کے فرائض امامت میں شامل تھا اس خوبی سے ادا فرما گئے کہ منافقین اور دشمنان آل رسولؐ چاہے وہ شامی ہوں اور چاہے کسی یا مدنی اندھیرے میں رہے اور صاحبان بصیرت پر پوری حقیقت آشکار ہو گئی۔ معاویہ اور ان کے ساتھی خوش تھے کہ چلو حکومت مل گئی لیکن حسنؑ مسرور تھے کہ معاویہ کی پہلی ہی شرط ایسی منوالی گئی کہ خود دشمنوں کے دستخط سے حق واضح ہو گیا اور مذہب کے باب میں اجماع اور سیرت شیعین وغیرہ نے جو پردے ڈال دیئے تھے وہ بیک گردش قلم اٹھ گئے۔

مذہب کے باب میں امام حسنؑ کی یہ فتح مبین ناقابل انکار ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے اس تاریخی معاہدہ میں یہ شرط رکھ کر دنیاۓ اسلام پر ایک اور احسان عظیم فرمایا ہے اور وہ یہ کہ آپ نے ایک مختصر سے جملہ

میں یہ بتا دیا کہ ”مسلمانوں کی حکومت“ کا دستور ایسا ہی کیا ہوتا ہے اور وہ کونسی حکومت ہوتی ہے جسے ”مسلمانوں کی حکومت“ قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ سوال مستقبل کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس لئے کہ آنے والے زمانہ میں ”اسلام کی حکومت“ یا ”خلافت الیہ“ باقی رہنے والی نہیں تھی بلکہ اس کی جگہ ”مسلمانوں کی حکومتیں“ وجود میں آنے والی تھیں، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کے سامنے ”اسلام کی حکومت“ کا نقشہ پیش فرمایا تھا اور امیر المومنین علیہ السلام حدیثی مرتبت کے بعد اسی ”اسلامی حکومت“ کو وجود میں لانے کی سعی و جہد میں مصروف رہے۔ پھر جب آپ کو حکومت حاصل ہوئی تو آپ نے ”اسلام کی حکومت“ قائم فرمائی لیکن امام حسن علیہ السلام کے عہد تک دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ مسلمانوں کے نقوش بگڑ چکے تھے۔ دلوں کا عالم تہ و بلا ہو چکا تھا۔ اخلاق و دیانت کے چراغ گل ہو چکے تھے اور روحانیت کے پھول مرجھا چکے تھے۔ ان حالات میں ”اسلام کی حکومت“ قائم ہونے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔ اب صرف ”مسلمانوں کی حکومت“ قائم ہو سکتی تھی اس لئے یہ ضروری تھا کہ دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ ”مسلمانوں کی حکومت“ کسے کہا جائے گا؟ آیا ہر وہ حکومت جس کا سربراہ مسلمان ہو ”مسلم حکومت“ کے نام سے موسوم کی جاسکے گی یا اس حکومت کے لئے بھی کچھ قیود و شرائط ہوں گے؟ یہ تھا وہ سوال جسے امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ کی اس شرط سے پورے طور پر واضح فرمایا اور دنیا کو بتا دیا کہ محض مسلمان حکمران ہونا کسی حکومت کو ”مسلمانوں کی حکومت“ نہیں قرار دلا سکتا۔ ”مسلمانوں کی حکومت“ صرف وہی ہوگی جو کتاب اللہ اور سیرت رسول کی اساس پر قائم ہو۔

مسلمانوں نے اس اہم نکتہ کا خیال نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے

ہزاروں بے جا الزامات اپنے سر اوڑھے لئے اپنی بدنامی اور بے عزتی قبول کر لی اور مسلمان بادشاہوں کی بد اعمالیوں، عیاشیوں اور مظالم کے نتیجہ میں غیر اقوام کے سامنے ذلیل ہوئے۔ وجہ صاف ظاہر ہے، مسلمانوں نے ہر ظالم، عیاش، بدکار، نالائق، شرابی، دیوانی اور نالعل حکمران کی حکومت کو ”مسلمانوں کی حکومت“ قرار دے لیا، جس کے نتیجے میں بادشاہوں کی بد اعمالیوں کی ساری ذمہ داری ملت اسلامیہ کے سر آگئی اور غیر قوموں کو مسلمانوں کو بدنام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کے برعکس اگر پوری صفائی سے یہ کہہ دیا جاتا کہ مسلمانوں کی حکومت صرف وہ ہے یا صرف اس حکومت کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوگی جس کا عمل کتاب اللہ اور سیرت رسول پر ہو تو مسلمانوں پر ہرگز وہ الزامات عائد نہ ہوتے جو آج عائد کئے جاتے ہیں اور ملت اسلامیہ اٹھار کی نگاہوں میں اس ذلت و خواری کا نشانہ نہ بنتی جس کا نشانہ وہ آج بن رہی ہے۔

خود ہمارے برصغیر میں ہندو مسلم آپریشن اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں نفرت کا جذبہ پھیل رہا ہے جو بڑا ہاتھ ان حرکتوں کا ہے جو مسلمان بادشاہوں سے صادر ہوئیں اور ہم نے بلا سوچے سمجھے ان بادشاہوں کی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر کے ان تمام حرکتوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اگر ہم ایک ذرا متامل سے کام لیتے اور پوری جرات سے یہ کہہ دیتے کہ یہ حکومتیں ”مسلمانوں کی حکومتیں“ نہیں تھیں بلکہ چند افراد یا چند خاندانوں کی حکومتیں تھیں جن کی حرکتوں کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہے تو آج ان دونوں قوموں میں جو کشیدگی نظر آتی ہے وہ ہرگز وجود میں نہ آتی۔ اسی طرح عرب اور ترک سلاطین کی پیش قدمیوں اور ظلم کو شیوں کے افسانوں نے یورپ کی نظر میں مسلمانوں کا وقار جس طرح برباد کیا ہے وہ نہ ہونے پاتا۔ امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں

کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی شرط اسی لئے عامہ کی تھی اور اس طرح ملت اسلامیہ کو ایک بڑی بدنامی سے بچنے کا راستہ دکھایا تھا لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں نے اس پر اعتناء نہیں کیا اور اسی کا وہ نتیجہ ہے جو آج وہ ساری دنیا میں بھگت رہے ہیں۔

مسلمانوں نے بڑی غلطی یہ کی کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو حکومت کتاب اللہ اور سیرت رسولؐ کی پابندی کرتی ہے وہ تو ہے خلافت اور جس حکومت میں ان چیزوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے وہ مسلمانوں کی حکومت — اور یہی غلط تصور ان کی تاریخ کو واعدار بنا دینے کا سبب بنا۔ حقیقت یہ ہے کہ ”خلافت“ نام ہے اس الٰہی حکومت کا جس میں کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پیروی تو ضرور کی جاتی ہے لیکن خلیفہ وہ مامور من اللہ بزرگ ہوتا ہے جو حفظ شریعت اور بتائے دین کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ مسلمانوں کا حکمران ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کل کائنات کا امام اور ہادی ہوتا ہے۔ وہ بادشاہ نہیں ہوتا تحریک اسلامی کا قائد ہوتا ہے اور اس کے دوش پر اس عالمگیر اصلاحی انتداب کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جسے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے ایک گوشہ سے شروع کیا تھا۔ وہ صرف حکمران نہیں ہوتا بلکہ دین کا داعی، اسلام کا مبلغ، وحدانیت کا ناشر، حکومت الٰہیہ کا پاسپان، شریعت کا امین، اسرارِ قرآنی کا حافظ، انسانیت کا رہبر، عوام کا ہادی اور اللہ کی زمین پر اللہ کی جنت کا لہ بھی ہوا کرتا ہے اور جب تک ایسا حکمران برسرِ اقتدار نہ ہو تب تک کسی حکومت کو ”خلافت“ نہیں کہا جاسکتا۔ اسے اسلامی حکومت کے لقب سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ وہی مسلمانوں کی حکومت، تو ایسا نہیں ہے کہ جس حکومت میں مسلمان حکمران ہوں، اسے مسلمانوں کی حکومت کہہ دیا جائے، مسلمانوں کی حکومت وہ کہلائے گی جس میں

کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کی پابندی کی جائے۔ شریعت اسلام کا پاس و لحاظ رکھا جائے اور تمام احکام و قضایا فقہ اسلامی کے مطابق جاری اور نافذ ہوں۔ جس حکومت میں یہ ہو گا اسے مسلمانوں کی حکومت قرار دیا جائے گا اور جس مملکت میں ان امور کا لحاظ نہیں ہو گا وہاں چاہے حکمران مسلمان ہی کیوں نہ ہوں اسے ایک غیر مذہبی مملکت قرار دیا جائے گا۔ جس کے افعال کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہوگی۔

مثال کے طور پر آج ہی کے دور میں دیکھ لیجئے کہ ترکی، مصر، انڈونیشیا، شام اور دوسرے ممالک میں حکمران مسلمان ہیں لیکن ان کے انداز حکومت اور یورپی حکومتوں کے انداز حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے، ایسی حالت میں ان کو غیر مذہبی حکومتیں کہا جائے گا اور ان کے کسی فعل کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہوگی البتہ اگر کوئی ایسی حکومت وجود میں آجائے جہاں شرعی قوانین کا نفاذ ہو تو اسے مسلمانوں کی حکومت مان لیا جائے گا لیکن اسے خلافت سے تعبیر نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ مسلمانوں کی حکومت اور چیز ہے اور خلافت بالکل دوسری چیز!

امام حسن علیہ السلام نے ہمیں مسلمانوں کی حکومت کی تعریف بتلائی ہے اور یہ تعریف اتنی جامع ہے کہ آج جن مسلمان ممالک میں بھی شریعت حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہاں اسی کتاب اللہ اور اسوہ رسولؐ کو اساس حکومت بیان کیا جا رہا ہے اور مسلمان تیرہ سو سال کے تجربات کے بعد اسی نقطہ پر پہنچ گئے ہیں جو امام حسنؑ نے اپنے تاریخی معاہدہ کی پہلی دفعہ میں بیان فرمایا تھا۔

معاہدہ کی دوسری شرط یہ تھی کہ معاہدہ اپنے بعد کسی کو حاکم مقرر نہیں کرے گا۔ تاریخی، مذہبی اور سیاسی اعتبار سے یہ شرط بھی انتہائی اہم تھی۔ اس لیے کہ:-

جسے امام نے انجام دیا تھا۔

امیر معاویہ نے اس شرط کو مان کر بنی امیہ کے تمام حکمرانوں کی حکومت کو ناجائز اور غیر قانونی بنا دیا اور یہ سیاسی اہتمام سے ان کی ایک بہت بڑی شکست تھی۔

معاویہ کی تیسری شرط یہ تھی کہ کوفہ کے بیت المال کی ساری رقم امام حسن علیہ السلام کو ملے گی۔ یہ شرط خود امیر معاویہ کی نام نهاد خلافت پر ایک ضرب تھی اس لیے کہ کوفہ کا "بیت المال" خلافت اسلامی کا خزانہ تھا جو مسلمانوں کا حق تھا اور اسے ایک "پادشاہ" کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر امام حسن علیہ السلام امیر معاویہ کو "خلیفہ" مانتے تو بیت المال ان کے حوالہ کر دیتے لیکن چونکہ آپ نے امیر معاویہ کو محض "پادشاہ" تسلیم کیا تھا اس لیے آپ نے مسلمانوں کی دولت ان کے حوالہ نہیں کی بلکہ اسے خود اپنی عمرانی میں مسلمانوں فریبوں کو تقسیم کر دیا جو بہ حیثیت خلیفہ برحق ان کا حق بھی تھا اور ان کا فرض بھی!

امام حسن علیہ السلام نے اس طرح بیت المال اور شاہی خزانہ کا فرق بھی دنیا پر واضح کر دیا اور مسلمانوں کو بتا دیا کہ بیت المال ایک قومی امانت کا نام ہے جسے اس خزانہ شاہی سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے جو شاہوں کی پیش پرستیوں، ہوس کاریوں اور جنگ آزمائیوں کی نذر ہوا کرتا ہے۔ اس طرح آپ نے امت اسلامیہ کے معاشی نظام پر ایک دور رس عملی روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو اس آنے والے فتنہ سے باخبر کر دیا جو شاہ پرستی کے اقتصادی نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والا تھا۔ آج مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کے اہلاس اور سلطنت اسلامیہ کے زوال کا بڑا سبب یہ ہوا کہ ملت کی دولت

پادشاہوں اور ارکان دولت کی ذاتی ملکیت بن گئی اور ان لوگوں نے عوام کو اہلاس، بھوک، جمالت اور پریشانیوں میں مبتلا کر کے اس دولت کو اپنی پیش کو شیوں پر ضائع کر دیا۔ نظام ملکیت کا یہی نتیجہ ہونا بھی چاہیے تھا اور امام حسن علیہ السلام مسلمانوں کو اسی آنے والی جہاں سے باخبر کر دینا چاہتے تھے۔ آپ یہ چاہتے تھے کہ کوفہ کے بیت المال کی مثال مسلمان اپنے سامنے رکھیں اور یہ سمجھتے رہیں کہ سلطنت اسلامی کا خزانہ چند افراد کی ذاتی ملکیت نہیں بننا چاہیے بلکہ مسلمانوں کا ایسا مشترکہ سرمایہ قرار دیا جانا چاہیے جس میں ہر مسلمان برابر کا حقدار تسلیم کیا جائے، مسلمانوں نے اس اہم سیاسی گفتہ کو نظر انداز کر دیا اور نظام ملکیت پر ایسے ہی حکمرانوں نے بیت المال کی اس اساسی اور اصولی شکل کو اپنے ذہنوں سے تھپا "ٹھو کر دیا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا اور ملت اسلامیہ اہلاس، جہاں اور پریشان حالی کا شکار ہو کر نہ صرف یہ کہ سیاسی اور عسکری حیثیت سے ختم ہو گئی بلکہ علمی، ادبی، ذہنی اور فکری میدانوں میں بھی پس ماندہ اور حقیر بن گئی۔ آل رسول نے مسلمانوں کو مستقبل کی اس جہاں سے باخبر کرنے کی ہر امکانی سعی کی چنانچہ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ میں یہ شرط رکھی اور امام حسین علیہ السلام نے میدان کربلا کے خطبات میں بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ:-

"بیت المال کو ذاتی املاک بنا لیا گیا ہے"

لیکن مسلمانوں نے نہ تو معاویہ کے مصلحت آفرین اشارہ کو سمجھا اور نہ مظلوم کربلا کی تقریروں سے متاثر ہوئے اور اس کا جو نتیجہ نکلا ملکیت کے اقتصادی نظام نے مسلمانوں کو اہلاس اور جہاں کا جو روڈ بد دکھایا اور قومی دولت کے اہلاس کا جو نتیجہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیوں کو بھگتنا پڑا وہ کسی سے پوشیدہ

نہیں ہے۔

معاهدہ کے مالی شرائط میں ایک شرط یہ بھی رکھی گئی کہ ایران کے ایک صوبہ کا خراج امام حسن کو ملتا رہے اس شرط کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں کی توجہ آل رسول پر مرکوز ہو گئی اور آج اسی کا یہ ثمرہ ہے کہ ایران آل رسول کے شیعہ اہل بیتوں سے چمکتا نظر آ رہا ہے۔

امام حسن علیہ السلام کو اس رقم کی شدید ضرورت تھی اس لیے کہ اول تو آپ کو اپنی تبلیغی مہم کے لیے روپیہ درکار تھا دوسرے مدینہ سے مرکز حکومت منتقل ہونے کے نتیجہ میں یہ اندیشہ تھا کہ غریب اصحاب رسول مدینہ سے دوسرے شہروں کی جانب ہجرت کرنے لگیں گے اور اس طرح وہ جماعت منتشر ہو جائے گی جس نے زبان فیض ترجمان رسالت سے دین کی تعلیم حاصل کی تھی جہاں تک امرائے مدینہ کا تعلق تھا وہ زراعت و زری اور حرص کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر اپنا دینی جذبہ کھو چکے تھے اور اموی نژادہ انکو آسانی سے خرید سکتا تھا لیکن غریب اور پسماندہ طبقہ کے دل میں اب بھی دین کی سچی محبت موجود تھی اور اسی کے سارے رسول اللہ کی تعلیم کی اشاعت ہو سکتی تھی۔ امام حسن علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ اگر یہ طبقہ افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر منتشر ہو گیا تو تفسیر حدیث اور فقہ کا نام و نشان مٹ جائے گا اور بنی امیہ دین کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اس لیے یہ ضروری تھا کہ آپ اہل مدینہ کے اس طبقہ کے آؤقہ کا ہمدوست کر دیں تاکہ وہ غریب اصحاب پیغمبر جو اموی دولت پر اپنے دین کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں تھے مدینہ میں موجود رہیں اور ان کی مدد سے دین حق کی تبلیغ و اشاعت کا کام پورا ہوتا رہے امام یہ جانتے تھے کہ بنی امیہ کی تلواریں اور ان کا جاہلانہ انداز لوگوں کو آل رسول سے دین حاصل کرنے سے روک دے گا اور

حکومت وقت یہ چاہے گی کہ عوام یا تو جہل رہیں ورنہ آل رسول کے علاوہ دوسرے لوگوں سے علم حاصل کریں۔ یہ لوگ دو حصوں میں منقسم تھے ایک تو وہ طبقہ تھا جسے بنی امیہ نے خرید لیا تھا یہ جھوٹی حدیثیں گھڑ کر دین کو برباد کرنے والا تھا اور دوسرا طبقہ وہ تھا جو اپنے دین کو دنیا کے ہاتھوں فروخت کرنے پر تیار نہیں تھا اس لیے اس طبقہ کے ذریعہ تفسیر حدیث اور فقہ کے علوم کی اشاعت ہو سکتی تھی امام نے اس موخر الذکر طبقہ کو مضبوط بنا دینے پر پوری توجہ کی اور اس کو منتشر ہونے سے بچا لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی علوم کی بربادی کا جو خدشہ پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو گیا۔

امام حسن علیہ السلام کے دسترخوان کی وسعت بہت مشہور ہے لیکن بہت کم آدمیوں نے اس پر غور کیا ہے کہ امام حسن کے سے زہد پروردگار کو اس وسیع دسترخوان کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اسے محض فیاضی قرار دیا جائے تو دوسرے ائمہ نے اس قسم کی فیاضی کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟ امیر المومنین نے اپنا دسترخوان کیوں وسیع نہ رکھا؟ اور آل رسول میں صرف امام حسن علیہ السلام نے اس قسم کی فیاضی کا کیوں مظاہرہ فرمایا؟

ہات دراصل یہ ہے کہ امام کو غریب مگر ایماندار صحابہ رسول کی پرورش مقصود تھی تاکہ یہ لوگ مدینہ چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائیں اور ان کی مدد سے رسول اللہ کے پیغام کی اشاعت ہوتی رہے امام حسن علیہ السلام اپنی اس تدبیر میں کامیاب رہے اور آپ نے مرکز حکومت و دولت و مشن منتقل ہو جانے کے باوجود مدینہ کو اجڑنے نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علوم اسلامی کا ذخیرہ بڑی حد تک محفوظ رہا اور دسترخوان کی وسعت نے ان غریب صحابہ کے قدم مدینہ میں جمائے رکھے جنہوں نے دین کی تعلیم لسان فیض ترجمان رسالت سے حاصل کی تھی۔

دنیا مانے یا نہ مانے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں دشمن سے بدعتوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے اور بنی امیہ کے زر خرید بدگمان دنیا جھوٹی حدیثوں اور جھوٹے آثار کے انہار لگا رہے تھے وہیں حسن کی صلح کے نتیجے میں اسلامی دنیا میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو رسول اللہ کی سچی تعلیمات کو اپنے کلیجے سے لگائے اسلام کو بنی امیہ کی ممانعت سے محفوظ رکھنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اور آج یہ اسی طبقہ کا جسے امام حسن نے روزی کی جانب سے مطمئن کر رکھا تھا، ظلیل ہے کہ ہمارے پاس احادیث صحیح کا وہ صحیح گراں مایہ موجود ہے جسے بنی امیہ چاہ کر دینے پر تے ہوئے تھے۔

ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ زمانہ وہ تھا جب آل رسولؑ سے براہ راست حدیث حاصل کرنا موت کو دعوت دینے کے حروف تھا۔ اس لیے آل رسولؑ کو قطعاً اس کی ضرورت تھی کہ ایسے ایماندار لوگوں کی ایک جماعت مدینہ میں باقی رکھی جائے جو پیغام رسالت کی تبلیغ کرتے رہیں ان میں وہ صحابہ بھی تھے جو پوری دیانتداری سے لوگوں کو وہ چیزیں سنا دیا کرتے تھے جو انہوں نے خود رسول اللہ سے سنی تھیں اور وہ تابعین بھی تھے جو حدیث لیتے تو آل رسولؑ سے تھے لیکن مصلحت وقت کے پیش نظر اسے کسی دوسرے شخص سے منسوب کر کے امت تک پہنچا دیتے تھے اور اس طرح حق دنیا پر آشکار ہوتا رہتا تھا حسن بھری نے اس راز کو یہ کہہ کر ہم پر آشکار کیا ہے کہ "میں نے جو احادیث حضرت علیؑ سے سنی ہیں ان کو میں براہ راست رسول اللہؐ سے نقل کر دیتا ہوں" حسن بھری کا یہ انکشاف ہمیں نہ صرف یہ کہ اس زمانہ کی اصل حالت سے باخبر کرتا ہے بلکہ امام حسن علیہ السلام کے دسترخوان کی وسعت کا راز بھی ہم پر ظاہر کر دیتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح اس پر آشوب دور میں آل رسولؑ صحابہ و تابعین کے

غریب مگر ایماندار افراد کے ذریعے دنیا تک پیغام حق پہنچاتی رہی ہے کون جانے کہ حسن بھری کی طرح کتنوں نے آل رسولؑ سے احادیث اور احکام فقہ حاصل کیے ہوں گے اور اپنے پیام سے دنیا تک پہنچائے ہوں گے۔

امام حسن علیہ السلام کو اپنے پیام کی ضرورت نہیں تھی، حق کی اشاعت کی ضرورت تھی اور اگر یہ مقصد اس طرح پورا ہوتا تھا کہ حسن کا نام آئے بغیر رسول اللہؐ کی احادیث اور آپ کے احکام امت تک پہنچ جائیں تو اس سے زیادہ بے لوث تبلیغ اور کیا ہو سکتی تھی۔

دسترخوان کی وسعت سے ایک دوسرا نکتہ یہ تھا کہ ممالک اسلامیہ سے جو زائرین مدینہ آتے تھے وہ امام کے مصلحان ہوتے تھے اور ان پر دین کے حقائق پیش کیے جاتے تھے اور پھر ان کے ذریعے سے دور دراز علاقوں تک حق کی آواز پہنچائی جاتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس تبلیغی جہم کو منظم کرنے کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی اور یہ سرمایہ فراہم کرنے کی اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی کہ معاویہ سے روپیہ ملے کر اسی روپیے سے اموی خلفائے بنیادیں کھوکھلی اور اسلام کی دیواریں مضبوط کر دی جائیں۔

معاویہ کی ایک شرط یہ تھی کہ امیر المومنین پر سب و شتم نہیں کیا جائے گا۔ اس شرط کے دو پہلو تھے ایک سلبی اور دوسرا ایجابی اور دونوں پہلو امام حسن علیہ السلام کے لیے مفید تھے اور بنی امیہ کے لیے چاہ کن۔

اگر امیر معاویہ اور بنی امیہ کے دوسرے سلاطین معاویہ کی اس شرط کی پابندی کرتے تو وہ قرآن اور حدیث کے فرمان سے مجبور ہو کر نہ سہی ایک سیاسی معاویہ سے ہی مجبور ہو کر آل رسولؑ کا احترام کرتے اور اس طرح دین کے ایک اہم رکن کو مان لیتے۔ یہ آل رسولؑ اور اسلام کی ایک اہم اصولی فتح ہوتی اور بنی



امیہ اس دین کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے جسے وہ مٹا دینا چاہتے تھے آل رسول کے خلاف انکا معاہدہ نہ پروردگار بند ہو جاتا اور آل رسول کو اس کا موقع مل جاتا کہ وہ فراغت اور اطمینان کے ساتھ دین مبین کی اشاعت کر سکیں۔ یہ معاملہ کا اہمابی رخ تھا کیونکہ دراصل معاہدہ کے روپ میں معاہدہ کے سامنے دین پیش کیا جا رہا تھا جو آل رسول کی حکمت آفرین تلخ کا ایک شاہکار تھا لیکن اس اہمابی رخ کے ساتھ معاملہ کا ایک سلیبی پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ اگر معاہدہ نے اس شرط پر عمل نہ کیا تو:-

۱۔ آل رسول پر سب و شتم کرنے کے نتیجے میں جہاں ان پر دین سے خارج ہو جانے کا الزام عائد ہو گا وہیں معاہدہ کی خلاف ورزی ان کی اخلاقی پستی اور ان کے کردار کی دیانت کو عالم آشکار کر دے گی۔

۲۔ مسلمانوں کے چوتھے مسلم اثبوت خلیفہ پر سب و شتم کرنے والے بنی امیہ اور ان کے حامی مسلمانوں کے اس ذمہ میں بھی شامل نہیں کیے جا سکیں گے جو حضرت علی کو چوتھا خلیفہ تسلیم کرتا ہے۔

۳۔ حضرت علی کو چوتھا خلیفہ ماننے والے مسلمانوں کے لیے اصولاً یہ جائز یا ممکن نہیں رہے گا کہ وہ معاہدہ اور بنی امیہ کے دوسرے سلاطین کو خلیفہ مقرر نہ لکھائیں اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ایک ایسی بے اصولی ہو گی جسے وہ عقل و منطق کے کسی اصول سے جائز قرار نہیں دے سکیں گے۔

۴۔ جو صحابہ، تابعین اور تبع تابعین اس فعل فحیح میں شریک ہوں گے یا اس پر خاموش رہیں گے ان کی "عدالت" کا پہل دنیا پر کھل جائے گا اور ارباب بصیرت پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ یہ لوگ یا تو حرص دنیا میں اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ محض بنی امیہ کی خوشنودی خاطر کے لیے

رسول اسلام کے گھرانے کی توہین و تذلیل کرنے پر تیار تھے یا پھر اتنے بڑھل تھے کہ امویوں کے خوف سے اس گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے تھے اور یا پھر خود ان کے دلوں میں خالواہ رسول کے خلاف اتنا زہر بھرا ہوا تھا کہ جیسے ہی ان کو موقع ملا وہ آل رسول پر سب و شتم کے لیے تیار ہو گئے۔ ان تینوں صورتوں میں نہ صرف یہ کہ ان کی عدالت تشریف لے جاتی ہے بلکہ صحابہ پر بلا تیز نیک و بد ایمان رکھنے کا اصول بھی ختم ہو جاتا ہے۔

۵۔ امام حسن علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ مستقبل میں امیر معاہدہ کو خلیفہ برحق سے جنگ کے جرم سے بچانے کے لیے ان کے چہرے پر "خطائے اجتہادی" کی نقاب ڈالی جائے گی اور اس طرح ان کو بے خطا ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی، لیکن معاہدہ کی اس شرط نے اس نقاب کو تار تار کر ڈالا اس لیے کہ اگر امیر المومنین پر معاہدہ کا خروج خطائے اجتہادی مان بھی لیا جائے تب بھی معاہدہ کے بعد امیر المومنین پر سب و شتم کیا جاتا خطائے اجتہادی یا ثلوانی کی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عظیم عہد شکنی کے بعد معاہدہ کو "بہتہ" قرار دینا ہی ناممکن ہو جاتا ہے کیونکہ عہد شکنی کا گناہ کبیرہ ان کی "عدالت" کا خاتمہ کر دیتا ہے اور جو شخص "عادل" نہ ہو اسے کسی حالت میں بہتہ نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جب معاہدہ بہتہ ہی نہیں تھے تو ان کو "خطائے اجتہادی" کے واسطے میں پناہ نہیں دی جا سکتی اور امام حسن علیہ السلام نے معاہدہ میں یہ شرط داخل کر کے حامیان بنی امیہ سے ان کی آخری آڑ یا سپر بھی چھین لی اور معاہدہ کے گناہوں پر اجتہاد کا جو پردہ ڈالا جانے والا تھا اسے تار تار کر کے پھینک دیا۔

۶۔ بنی امیہ کو چونکہ اس معاہدہ کی بنیاد پر حکومت حاصل ہوئی تھی اس لیے معاہدہ کی پابندی نہ کرنے کی حالت میں اصولاً "اور قانوناً" ان کو حکومت کرنے کا حق باقی نہیں رہا۔ ان کی حکومت غیر قانونی ہو گئی۔ اس لیے اس حکومت سے عدم تعاون یا اسے ختم کر دینے کی ہر کوشش جائز ہو گئی اور اس حکومت سے تعاون یا اس کی بیعت حرام ہو گئی۔

معاہدہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ جن لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا ان سے نہ کوئی مواخذہ کیا جائے گا اور نہ ان کو مزادی جائے گی امیر معاویہ نے اس شرط کی بھی پابندی نہیں کی اور حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل سے اپنے ہاتھ رتھیں کر لیے۔ ان کے علاوہ دوسرے موالیان امیرالمومنین پر طرح طرح کے مظالم کیے گئے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ معاویہ پر ظلم و خونریزی کا الزام عائد ہوا بلکہ یہ جرم اس اعتبار سے اور زیادہ گھناؤنا اور قاتل مواخذہ ہو گیا کہ یہ سب مظالم ایک اہم دستاویزی معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کیے گئے تھے اور اس اعتبار سے معاویہ کا کردار تاریخ میں اتنا پست ہو گیا کہ آنے والی نسلیں معاویہ اور ان کے بعد والے بنی امیہ کی "بیعت خلافت" کرنے کے باوجود یہ ہمت نہ کر سکیں کہ ان کو "صلیٰ منہلج النبوة" والی خلافت میں شامل کر سکیں اور بنی امیہ کی حدیث سازی کے باوجود امت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ "خلافت راشدہ" حسن پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جو "خلافت" وجود میں آئی وہ "ملک مفوض" کی بادشاہت تھی!

امام حسن علیہ السلام اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ معاویہ معاہدہ کی پابندی نہیں کریں گے۔ آپ معاویہ کی سیرت اور ان کے کردار سے بخوبی واقف تھے اور آپ نے کوئی دھوکا نہیں کھایا، آپ نے جو کچھ کیا خوب سوچ سمجھ

کے کیا اور ایک ایسا معاہدہ ترتیب دیا جس کی ہر دفعہ آپ کی سیاسی بصیرت اور کامرانی کا ثبوت تھی اس معاہدہ کی ہر شرط معاویہ اور بنی امیہ کے لیے چاہ کن ثابت ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ان کے چہروں پر پڑی ہوئی ساہری نقابیں الٹ گئیں۔ بنی امیہ امت اور تاریخ کے دربار میں پایہ ذمخیر قیروں کی حیثیت سے کھڑے ہونے پر مجبور ہو گئے ان کے عقائد و افکار سے دنیا روشناس ہو گئی۔ ان کی سیرت کے جو نقوش اب تک دھندلے تھے وہ روشن ہو کر امت کے سامنے آ گئے اور آل رسولؐ نے محض ایک ایسی حجر سے، ایک ایسی دستاویز سے جس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا۔ اپنی حقانیت اور اپنے مخالفین کی باطل نوازی کے ایسے امت نقوش دنیا کے سامنے پیش کر دیے جن سے ادہاب بصیرت کو ہمیشہ کے لیے حق کی تلاش آسان ہو گئی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہمیشہ کے لیے واضح ہو گیا۔

بعض کم فہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام نے دھوکا کھلایا اور ایک ایسا معاہدہ کی بنیاد پر حکومت چھوڑ دی جس پر عمل نہیں کیا گیا۔ ان کے خیال میں معاویہ نے امامؑ کو سیاسی طور پر ذک وے دی اس لیے کہ اس نے حکومت بھی لے لی اور معاہدہ پر عمل بھی نہیں کیا اور اس اعتبار سے معاویہ امامؑ کے مقابلے میں زیادہ صاحب عقل اور زیادہ بڑا سیاست دان ثابت ہوا۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس معاہدہ نے الٹا یہ ثابت کر دیا کہ معاویہ کی عقل و سیاست کے سارے افسانے فلفل ہیں۔ اس میں نہ عقل تھی نہ سیاست بلکہ صرف وہ معمولی درجے کا سیاستدان تھا جسے سیاست کے اعلیٰ ایوان میں جگہ دینا خود لفظ سیاست کی توہین کرنا ہے۔

معاویہ کی عقلی اور سیاسی بے بصیرتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا

ہے کہ :-

- ۱۔ جب جنگ میں اس کی فتح یقینی ہو چکی تھی تو اس نے صلح کر لی۔
- ۲۔ جنگ جاری رکھ کے وہ خانوادہ نبوت کا خاتمہ کر سکتا تھا جو اس کا مقصد اصلی تھا لیکن صلح سے اس کا یہ مقصد فوت ہو گیا۔ آل رسول باقی رہی اور صرف باقی ہی نہیں رہی بلکہ دنیائے اسلام پر اس کا اثر اس حد تک قائم رہا کہ آج بھی دنیا کا ہر مسلمان مودت اہل بیت کو جزو ایمان تسلیم کرتا ہے۔
- ۳۔ اس نے صلح کے نتیجے میں وہ حکومت حاصل کی جسے خود حامیان بنی امیہ بھی خلافت راشدہ میں شامل نہیں کرتے بلکہ اسے انتقالِ ولوکیت سے تعبیر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔
- ۴۔ اس پر اسلام میں نسلی بادشاہت قائم کرنے کا الزام عائد ہوا جس کے لیے مسلمان اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے۔
- ۵۔ اس پر عہد شکنی، ظلم اور خونریزی کے وہ الزامات عائد ہوئے جو قیامت تک دور نہیں ہو سکتے اور جن کے نتیجے میں پوری تاریخ بنی امیہ اتنی داغ دار ہو گئی ہے کہ دنیا کا کوئی سچیدہ مسلمان اس پر اظہارِ نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔
- ۶۔ اس نے عملاً "تیسرے خلیفہ کی بیعت کو ناجائز تسلیم کیا اور درپردہ اہل اہل بیتوں خلافتوں کا چہرہ داندہار بنا دیا۔
- ۷۔ اس نے اپنے لیے دائمی بدنامی کا وہ لہانہ خرید لیا جس پر جھوٹی حدیثوں کا انبار بھی پردہ نہیں ڈال سکا۔
- ۸۔ اس نے ہر مسلمان کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ اس سے اظہارِ برات کرے کیونکہ جو مسلمان ایسا نہیں کرتا وہ اسلام کے چوتھے خلیفہ پر سب و

شتم جائز قرار دے کر خود دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

- ۹۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کے نتیجے میں خود اس کی اور تمام بنی امیہ کی حکومت غیر قانونی اور غیر اصولی ہو گئی۔ جس کی بیعت کرنا بھی مسلمانوں کے لیے قلط ہو گیا۔
- ۱۰۔ ایک غیر قانونی، غیر اسلامی اور ناجائز حکومت کے مقابلہ میں امام حسین علیہ السلام کا جہاد قطعاً جائز ہو گیا اور بنی امیہ اپنے پروپیگنڈہ کی ساری قوتوں کے باوجود اسے "ظلیفہ پر خروج" قرار دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔
- ۱۱۔ مسئلہ خلافت کے باب میں امیر المومنین علیہ السلام کا موقف بالکل صحیح ثابت ہو گیا۔
- ۱۲۔ آل رسول کو تبلیغ اسلام کا پورا موقع ہاتھ آ گیا اور اسلام کو مٹا دینے کی تمناؤں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔
- ۱۳۔ عام مسلمانوں کو بنی امیہ کی حکومت سے یہ احساس پیدا ہو گیا کہ خلافت کے باب میں ان کے وضع کردہ سارے اصول قلط ثابت ہوئے۔
- ۱۴۔ صحابہ پرستی کا ظلم پاش پاش ہو گیا اس لیے کہ بنی امیہ اور ان کے حامی صحابہ و تابعین کے کردار نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ بلا تیز ٹیک و بد ہر صحابی کو حامل عدالت قرار دینا قلط ہے۔
- ۱۵۔ امیر معاویہ اگر واقعی اٹھنے ہی ٹھنڈے اور سیاستدان ہوتے جتنے کہ مشہور کیے جاتے ہیں تو وہ ہرگز یہ معاہدہ کر کے ان نقصانات کا شکار نہ ہوتے۔ ان کا امام حسنؑ سے معاہدہ کر لینا ان کے سیاسی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے اور دنیا کا ہر غیر جانبدار شخص جو تعصب اور اسلاف پرستی کا شکار نہ ہو یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ امیر معاویہ صلح سیاست اور دفاع کی جنگ بڑی طرح ہار گئے اس لئے

ان کو اس معاہدہ کے نتیجے میں سوا اس کے اور کچھ حاصل نہیں ہوا کہ چند روزہ حکومت حاصل ہو گئی اور اس حکومت کی قیمت ان کو ایک ایسی دائمی بدنامی کی شکل میں ادا کرنا پڑی جس پر ہر شریف انفس انسان شرم محسوس کرنے پر مجبور ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے جنگ بند کر دینے کے بعد مدینہ کو اپنا مستقر قرار دیا اور تبلیغ و اشاعت دین کی مہم میں مصروف ہو گئے ملت اسلامیہ کی یہ انتہائی بد قسمتی ہے کہ امام کی زندگی کے اس انتہائی اہم دور کے حالات تاریخوں میں بہت کم ملتے ہیں اور شیعہ روایات نے بھی ان حالات کو جمع کرنے پر بہت کم توجہ دی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ امام حسن علیہ السلام کی یہ زندگی رسول اللہ کی زندگی کے مانند سیاسی اقتدار سے بہت خاموش گزری ہے دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تاریخیں صرف سلاطین کی داستانیں ہیں جن میں امام حسن علیہ السلام کے خاموش تبلیغی مجاہدات کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ تیسرے یہ کہ مورخین میں چونکہ خود ہی سیاسی بصیرت بہت کم تھی، اس لیے وہ اس معاہدہ کو امام حسن علیہ السلام کی عمل شکست کا مظہر سمجھے اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ معاہدہ کے بعد امام نے باقی زندگی ایک ناکام و نامراد انسان کی حیثیت سے حسرت و اندوہ میں گزار دی ہو گی۔ اس لیے ان کو اس عہد کی تفصیلات معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ رہے شیعہ روایات تو ان کی دلچسپی کا مرکز زیادہ تر وہ روایات رہیں جن سے تفسیر فقہ یا مناظرہ میں مدد ملتی تھی اور امام حسن علیہ السلام کی زندگی میں چونکہ ان کو ایسی چیزیں بہت کم ملتی تھیں اس لیے انہوں نے بھی امام کے حالات جمع کرنے کی پوری کوشش نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

کئی زندگی کے ورثہ وار تھے اور اس اعتبار سے آپ کی ساری توجہ دین کے ان اہم اصولوں کی تبلیغ و اشاعت پر مرکوز تھی جن کے فنا ہو جانے کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ وقت فقہ کے جتنی مسائل بیان کرنے کا نہیں تھا بلکہ اصول اسلام کو بنی امیہ کی طاقت سے محفوظ رکھنے کا تھا۔ اس عظیم جنگ کی تیاریوں کا تھا جو کربلا کے میدان میں لڑی جانے والی تھی، مسلمانوں کو اس ”حق“ سے آشنا کرنے کا تھا جس پر باطل نے گمراہی ڈال دی تھی اور اس پر آشوب دور میں اسلام کو محفوظ رکھنے کا تھا۔ جب ایک طرف تو بنی امیہ کے خوف سے مسلمان آل رسول کے قریب آتے گھبراتے تھے اور دوسری طرف اموی پروپیگنڈہ ان کو جہالت اور گمراہیوں کی ہولناک ظلمت میں دھکیل دینے پر تلا ہوا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ انتہائی خاموشی اور راز داری سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ جب ایک ذرا سی فطرتی آل رسول کی موت اور اسلام کی فنا کا سبب بن سکتی تھی۔ جب ایک ذرا سا بھانڈا شامی عیسائیوں اور اموی دشمنان اسلام کو مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کی دعوت دے سکتا تھا اور جب اسلام کے لیے شاید اس سے بھی زیادہ کٹھن وقت تھا جس کا مقابلہ پیغمبر اسلام کو کئی زندگی میں کرنا پڑا تھا، اس لیے کہ رسول کے مقابلہ میں تو محض شیوخ قریش تھے جو اسلام کو ایک نوخیز اور معمولی سی تحریک تصور کرتے ہوئے اس کے مقابلہ میں اپنی پوری قوتیں صرف نہیں کرتے تھے، لیکن اب مقابلہ ایک منظم اور طاقتور حکومت سے تھا اور یہ حکومت بھی ان لوگوں کی تھی جو اسلام کی توانائیوں کا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، اس لیے اگر یہ لوگ یہ محسوس کر لیتے کہ مدینہ کو اسلام کی حیات نو کا گوارہ بنایا جا رہا ہے اور حسن کی تحریک ان کو پھر ایک بار وہی روز بد دکھائے گی جس کا تجربہ وہ رسول کی مدنی زندگی میں کر چکے تھے تو یہ لوگ حکومت کی ساری قوتیں امام حسن

اور ان کے رفتائے کار کے خلاف استعمال میں لے آئے اور اس کے نتیجہ میں اسلام کا خاتمہ ہو جائے۔ ایسی حالت میں امام حسن علیہ السلام کو تلواری کی دھار پر رہتے ہوئے تلخ کا کام انجام دینا تھا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ نے یہ فریضہ اس خوبصورتی سے انجام دیا کہ دشمن کو آپ کے خلاف اقدام کرنے کا ہمانہ بھی نہیں ملا اور اس اسلام حقیقی کی تلخ بھی ہوتی رہی جسے بنی امیہ مٹا دینا چاہتے تھے۔

ہم یہ بات کسی حسن عقیدت کے نتیجہ میں عرض نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا ثبوت معاویہ کی جانب سے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا دیا جانا ہے۔

زہر خورانی کا یہ واقعہ معاویہ کے دس سال بعد وجود میں آیا جبکہ اس دس سال کے دوران میں امام حسن کی جانب سے بظاہر کوئی ایسی حرکت ظہور میں نہیں آئی جس سے امیر معاویہ کو کوئی شکایت ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ پھر امیر معاویہ کو اس کی کیا وجہ تھی کہ وہ امام حسن علیہ السلام کو زہر دلوادیتے؟

امیر معاویہ پاگل نہیں تھے کہ بلا وجہ اتنا بڑا اقدام کر کے اپنے سرداگی بدنامی لے لیتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خالوہ رسالت کی دشمنی کے نتیجے میں وہ اس فعل کے مرتکب ہوئے تو دس سال تک وہ کیوں خاموش رہے؟ اور پھر صرف امام حسن علیہ السلام کو زہر کیوں دلوایا گیا؟ بنی ہاشم کے دوسرے افراد کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ امام حسین علیہ السلام اس واقعہ کے دس سال بعد تک زندہ رہے۔ آپ پر معاویہ نے حملہ کیوں نہیں کیا؟

ظاہر ہے کہ دس سال کی خاموشی کے بعد امیر معاویہ کا امام حسن علیہ السلام کے درپے آزار ہو جانا محض خاندانی دشمنی کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر

صرف خاندانی دشمنی اس کی محرک ہوتی تو دس سال کے انتظار کی کوئی وجہ نہیں تھی اور صرف امام حسن علیہ السلام کو شہید کر دینے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ امیر معاویہ کے اس اقدام کی وجہ کچھ اور تھی۔

امیر معاویہ کو حکومت حاصل ہو جانے کے بعد امام حسن علیہ السلام سے تنازعہ کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی تھی اور چونکہ امام علیہ السلام کسی سیاسی معاملہ میں حصہ نہیں لے رہے تھے۔ اموی حکومت کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر رہے تھے۔ بنی امیہ کے حکومتی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے امیر معاویہ اپنی جگہ مطمئن ہو گئے تھے۔ امیر معاویہ دنیا دار آدمی تھے اور آل رسول کو بھی عام دنیا دار انسانوں کی طرح سمجھتے تھے، انہوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ آل رسول ان کے سیاسی معاملات میں مداخلت نہیں کر رہی ہے تو یہ سمجھ بیٹھے کہ خالوہ رسالت کی ہمت ٹوٹ چکی ہے۔ اس کا عزم ٹکٹ ہو گیا ہے اور اب اس کی جانب سے بنی امیہ کے اقتدار کے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں ہے رہا مذہبی معاملہ تو امیر معاویہ اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کے نزدیک اسلام کی تحریک صرف حصول حکومت کا ایک ہمانہ تھی۔ چنانچہ آپ کے والد کا حضرت حمزہ کی قبر پر ٹھوک مار کر یہ فرمانا کہ :-

”کیوں اے بنی ہاشم! تم نے اسی حکومت کے لیے ہم سے تنازعہ کیا تھا۔ اب دیکھ کہ امیہ کے فرزند اس سے کس طرح کھیل رہے ہیں۔“

یا آپ کے فرزند یزید کا سر امام حسین علیہ السلام دیکھ کر یہ ارشاد کیا۔  
کہ ”تو کوئی وحی آئی نہ کوئی پیغام آتا“ یہ تو ایک دھوکہ



نے اپنے نانا جان سے بھی تھی، جس پر ناسمجھ مسلمان جو تبلیغ کی حکمتوں اور  
نہایتوں سے نا آشنا ہیں تفریب کی نگاہیں ڈالا کرتے ہیں!

وہ تدبیر تھی نکاح! — امام علیہ السلام نے بالکل اسی طرح جس طرح  
آپ کے نانا جان نے کئی نکاح فرمائے تھے مختلف قبائل عرب میں بہت سی  
شادیاں فرمائیں اور جس طرح سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ان شادیوں  
سے یہ مختلف قبیلوں کی حمایت حاصل کی جائے یا ان قبائل میں تبلیغ کی راہ ہموار  
کر لی جائے۔ اسی طرح امام علیہ السلام نے بھی کثرت ازدواج کے ذریعے عرب  
کے مختلف قبائل کو آل رسول کا ہمنوا بنادیا اور ان سے ایسے دوستانہ رولہا قائم  
کر لیے جن کے نتیجے میں ان پر تبلیغ آسان ہو گئی۔

شادی بیاہ کے ان تعلقات کے نتیجے میں عرب کے زیادہ سے زیادہ قبائل کو  
آل رسول سے قریب تر آنے اور ان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا  
اور پھر اس میل جول کے نتیجے میں لازمی طور پر دین کے حقائق آل رسول کے  
افکار ان تک پہنچے جس سے ان میں حق و باطل کی تمیز کا جذبہ ابھرنا انہوں نے  
ایک طرف بنی امیہ کے کردار اور ان کے افکار کا مطالعہ اور دوسری طرف آل  
رسول کے تصور دین اور ان دولتِ مقدسہ کے کردار و عمل کا جائزہ لیا۔ جس کا  
نتیجہ یہ ہوا کہ حق پر باطل کے جو خلاف ڈال دیے گئے تھے منبروں سے باطل کا جو  
شور بہا تھا اور جھوٹی حدیثوں کی مدد سے مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ  
ڈالنے کی جو تدبیریں کی جا رہی تھیں ان کا سارا اثر ختم ہو گیا۔ باطل کے شور بے  
ہنگام کے باوجود حقیقت برابر لوگوں کے سامنے آئی رہی حق کی آواز عمل کی شکل  
میں برابر ابھرتی رہی اور ازدواجی تعلقات کی مدد سے مسلمانوں کا دوسرا امام اموی  
پروردگار کے اثرات کو اس خوبصورتی سے مٹانا چلا گیا کہ حکومت وقت کو

اعتراض کا موقع بھی نہیں ملا اور جس حق کو دہانے پر حکومت کی ساری قوتیں  
مركز تھیں وہ نہ صرف بے کہ وہب یا مٹ نہ سکا بلکہ مختلف قبائل میں اس  
خوبصورتی سے عام ہو گیا کہ حکومت کا جبر اور پروردگار کی قوتیں بھی اسے دہانے یا  
مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

ظاہر ہے کہ حکومت وقت اس کی اجازت ہرگز نہ دیتی کہ امام حسن علیہ  
السلام بھری مسجدوں میں تقریریں کرتے یا ساری مملکت اسلامی میں دورہ کر کے  
جگہ جگہ آل رسول کی حمایت کا اعلان کرتے ہر قبیلہ میں جا کر لوگوں کو تحریک  
اسلامی کی دعوت دیتے۔ بنی امیہ کی اسلام دشمن حرکتوں کو علانیہ بیان فرماتے اور  
ان کے مقابلہ میں خلافتِ امیہ کے اصولوں کو واضح کرتے — ایسا کرنا بلاوجہ  
موت کو دعوت دینے کے حروف تھا اور حسن کی موت اسلام کی موت ثابت  
ہوتی اس لیے کہ بنی امیہ اسلام کی کلمہ نکلا تبلیغ پر لانا چل پڑا ہوتے آل  
رسول کے سارے افراد اسی طرح صحیح کر دیے جاتے جس طرح ان کی حمایت  
کے جرم میں حجر اور ان کے ساتھی صحیح کر ڈالے گئے اور عام مسلمان بھی اس  
قریبی کا کوئی اثر نہ لیتے اس لیے کہ ابھی بنی امیہ اور آل رسول کے افکار و اعمال  
کا فرق عام مسلمانوں پر واضح نہیں ہوا تھا اور اس فکر کو محض دو طلبکاران شاہی  
کا فکر قرار دے کر نظر انداز کر دیا جاتا۔ قربانیوں کا اثر جمعی ہوتا ہے جب عوام  
ان مقاصد کے ہم نوا ہو جاتے ہیں جن کے لئے قربانی پیش کی جاتی ہے اس لیے  
قربانی پیش کرنے سے قبل مقاصد کی اشاعت اور ان کی صحت کا ثبوت فراہم کرنا  
ضروری ہوا کرتا ہے۔ حجر اور ان کے ساتھی قتل ہو گئے لیکن چونکہ ابھی تک  
عوام آل رسول اور بنی امیہ کے افکار و عمل کا فرق صحیح طور پر نہیں جانتے تھے  
اس لیے ان قربانیوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا بلکہ الٹا اثر یہ ہوا کہ عوام دہشت

لذا ہو کر اور زیادہ بنی امیہ کے مطیع ہو گئے اس کے برعکس میں سال کی تبلیغ کے نتیجے میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ علیہم السلام نے اسلامی دنیا کو اپنے مقاصد کی صحت و عظمت کا اس حد تک معترف بنا دیا کہ محرکہ کربلا کے بعد یزید کے لیے تخت حکومت کاٹوں کا بہترین گیا اور اس قربانی کے نتیجے میں آل ابو سفیان نہ صرف یہ کہ حکومت سے محروم ہو گئی بلکہ دنیا سے اس کا نام و نشان تک محو ہو گیا یہ تھی وہ صورت جو تحریک اسلامی کے دوسرے قائد کے سامنے تھی اس لیے وہ ایک فضول اور بے نتیجہ کراؤ کو دعوت دے کر نہ تو اپنی عظیم قربانی کو رائیگاں جانے دے سکتے تھے اور نہ بنی امیہ کو عتاب میں لا کر اسلام کو ملک میں جلا کر سکتے تھے امام حسن علیہ السلام ایسا کرتے تو یہ چیز قوموں کی نفسیات سے لاعلمی اور قیادت کی لٹلسی سے تعبیر کی جاتی۔ یہ وقت کراؤ کا قحطی نہیں بلکہ اسی طرح جس طرح کی زندگی مگر بار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کراؤ کا موقع نہیں تھی اس لیے امام حسن علیہ السلام نے دسترخوان کی وصحت اور ادواج کی کثرت کی وہ عجیب و غریب تبلیغی تدابیر اختیار کیں جن سے تبلیغ کا کام بھی جاری رہا اور حکومت بھی آپ پر کوئی شبہ نہیں کر سکی۔ آل رسولؐ کی جہم جاری رہی تحریک اسلامی پر دل چاہتی رہی اور دشمن قائل رہا۔ دس سال میں امام حسن علیہ السلام نے اسلام کے اکثرے ہوئے قدم پھر سے بنادے اور بنی امیہ کے پروردگار کو اتنا بے اثر کر ڈالا کہ اب حکمران طبقہ کو اپنی ناکامی کا احساس ہونے لگا وہ یہ سمجھ گیا کہ دسترخوان پر محض دو بیاباں تقسیم نہیں ہوتیں اموی ملوکیت کے مقابلہ میں خلافت ربانی کی نعمتیں تقسیم ہوا کرتی ہیں اور حسنؑ کے نکاح و طلاق کا مقصد نہ عیش ہے نہ جمود بلکہ اس تدبیر سے خلف قبائل عرب کو قریب تر لا کر ان کو دعوت اسلامی سے ہمکنار کیا جا رہا ہے لیکن چونکہ یہ سب کچھ اس خاموشی سے

ہو رہا تھا کہ حکومت امام حسن علیہ السلام کے خلاف کوئی ثبوت فراہم کرنے سے قاصر تھی اور ان پر کھلم کھلا حکومت کی مخالفت کا الزام عائد کرنا ناممکن تھا۔ دوسرے امام حسنؑ کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے یا ان کو قید کرنے میں ان قبائل سے کراؤ کا خطرہ تھا جن سے امام رشتہ داریاں کر چکے تھے اس لیے امیر معاویہ اس پر مجبور ہو گئے کہ ایک ہزول سازشی کار کردار انجام دیتے ہوئے امام حسن علیہ السلام کو زہر دلا دیں اور اس طرح تحریک اسلامی کی دعوت کے اس عجیب و غریب نظام کو ختم کر دیں جسے اس عظیم المرتبت اور عرش بنا حسل و فہم رکھنے والے قائدین و امام عصر نے منظم فرمایا تھا۔ لیکن امیر معاویہ اپنی کوتاہی فہم کے نتیجے میں پھر ایک بار دعو کا کھا گئے۔ حسنؑ تحریک کو اتنا مضبوط بنا چکے تھے کہ اب ان کی مظلومانہ شہادت اس تحریک کو ختم کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی تحریک اسلامی نے دلوں میں اتنی جگہ نہیں پکڑی تھی کہ امام حسنؑ کی شہادت پر مسلمان اسی طرح حشناک ہو کر شمشیر بکھت ہو جائے جس طرح امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر ہوا لیکن پھر بھی یہ تحریک دماغوں پر اتنا اثر ضرور ڈال چکی تھی کہ اب لوگوں پر بنی امیہ کی شکستیں آنے لگیں۔ لوگ امیر معاویہ سے مرعوب ہونے کے بجائے ان پر اعتراض کرنے لگے۔ زبانوں پر چڑھے ہوئے قفل کھل گئے چنانچہ یزید کی ولید کی سلسلہ میں امیر معاویہ کو جن اختلافات کا سامنا کرنا پڑا وہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ امیر معاویہ کے اقتدار کا عمل لرز چکا تھا اور بنی امیہ کی وہشت اور بیت دلوں سے رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ مسلمانوں میں جرأت کردار پیدا ہونے لگی تھی اور وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انہوں نے بنی امیہ کو حکمرانی عطا کر کے ایک بڑی لٹلسی کا ارتکاب کیا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کی زہر خورانی کے سلسلہ میں دو بڑی اہم چیزیں



ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ امام کو جس عورت نے زہر دیا وہ حضرت ابو بکر کی بھانجی، حضرت عائشہ کی پھوپھی زاد بہن اور حضرت ابو بکر کے نواسے عبداللہ بن زبیر کی خالہ تھی جس سے حضرت ابو بکر کے خاندان اور آل رسول کے تعلقات پر کافی سے زیادہ روشنی پڑتی ہے اور دوسرے امام حسن علیہ السلام کے اسوہ حسنہ میں سیرت رسول کا رنگ کتنا گہرا تھا اس کا ہمیں بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے امام کو زہر دینے والی عورت جعدہ بنت اشعث بن قیس کنہی کی بیٹی تھی جو فرقہ خوارج کا بانی تھا اور جس کے مقابلہ میں امیر المومنین کو جنگ صفوان لڑنا پڑی تھی اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے ایسی عورت سے شادی کیوں کی؟ اور اس دشمنی کے پیش نظر جو اشعث بن قیس کنہی کو آپ کے خالو اور مبارک سے تھی۔ اس کی بیٹی سے عقد کیوں فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ امام حسن علیہ السلام کے سامنے بھی وہی مصلح تھے جو جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھے اور جن کے نتیجے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کی بیٹی سے عقد کیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم لوگ رسول و آل رسول کے افعال پر خود اپنے کردار و عمل کی روشنی میں غور کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم سے اگر کوئی شخص دشمنی برتے تو ہم اس سے شادی بیاہ کے تعلقات ہرگز قائم نہیں کریں گے لیکن رسول و آل رسول کی صورت بالکل دوسری تھی۔ ان کی دوستی اور دشمنی ان کے روابط و تعلقات ان کے شادی بیاہ کے معاملات ان کا میل جول سب اللہ اور اسلام کے لیے ہوتا تھا۔ ان کے کسی عمل میں نفسانیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا تھا سرکار دو عالم نے مختلف قبائل اور خاندانوں میں شادیاں کیں تاکہ ان کو اسلام سے

قریب تر کر دیں تاکہ کم از کم وہ اسلام کی مخالفت ترک کر دیں۔ بالکل یہی صورت حال امام حسن علیہ السلام کی تھی۔ اشعث بن قیس کی امیر المومنین سے جنگ کے نتیجے میں قبیلہ بنی کنندہ آل رسول کا حائف ہو گیا تھا اور اس طرح اسلام حقیقی سے دور ہوتا جا رہا تھا امام حسن علیہ السلام نے اس قبیلہ کی ایک عورت سے عقد فرما کر اس دیوار کو منہدم کر دیا جسے اشعث نے اپنی مخالفت کو روکنا چاہا اور اسلام دشمنی کے نتیجے میں آل رسول اور بنی کنندہ کے درمیان میں کھڑا کر دیا تھا اور اس طرح اپنی جان کو محکمہ میں ڈال کر آپ نے عرب کے قبیلہ کو جو اسلام اور آل رسول سے دور ہوتا جا رہا تھا اسلام سے قریب تر رہنے پر مجبور کر دیا۔ بالکل یہی صورت آپ نے بعض اور قبائل کے سلسلہ میں بھی برتی۔ چنانچہ آپ کی اولاد میں کئی عورتیں ایسی ملتی ہیں جو ان قبائل سے تعلق رکھتی تھیں جو آل رسول کے دشمن خیال کیے جاتے تھے ان میں سے بعض عورتیں ایسی بھی نکلیں جو آپ کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھیں لیکن آپ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی اور ان عورتوں سے عقد کر کے ان قبائل اور خاندانوں تک آل رسول کا پیغام پہنچایا جن تک اسلام کی گواہ اور آل رسول کی تحریک پہنچانے کا کوئی دوسرا وسیلہ اس دور میں موجود نہیں تھا۔

امام حسن علیہ السلام جعدہ کو بھی جانتے تھے اور ان دوسری عورتوں سے بھی بخوبی واقف تھے ان کے قبائل اور ان کے خاندانوں کا سارا کردار آپ کے سامنے تھا۔ آپ بخوبی سمجھتے تھے کہ ان عورتوں سے شادی آپ کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے لیکن پھر بھی ان قبائل اور خاندانوں کو آل رسول کی تحریک سے روشناس کرانے اور ان کو اسلام و پیغمبر اسلام سے قریب تر کر دینے کے لیے آپ نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور اس طرح اسلام کی تبلیغ کا وہ عظیم الشان

فریضہ انجام دیا جو صرف سید شباب لیل الجنۃ ہی انجام دے سکتا ہے۔

امام حسن علیہ السلام ملت اسلامیہ کے مامور من اللہ قائم کی حیثیت سے اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایک کامیاب انسان نظر آتے ہیں۔ آپ نے امیر معاویہ کو حکومت کا کھلونا دے کر بنی امیہ کو نہ صرف یہ کہ اسلام کی تاریخ میں مصروف رہنے سے روک دیا بلکہ وہی قومیں جو اسلام کو مٹانے پر صرف ہو تھیں حدود سلطنت اسلامی کی مدافعت اور مملکت اسلامی کی توسیع پر صرف ہونے لگیں۔ اسلام کے دشمن بنی امیہ اسلام کے لیے ممالک فتح کرنے لگے اور چونکہ ان کو حکومت کے اندرون ملک میں خاندان جنگی اور انتشار پھیلانے سے روک دیا گیا تھا اس لیے امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ دوبارہ عربوں میں صحیح اور سچے اسلام کی تبلیغ کر کے شیطان کی وہ بازی الٹ دیں جو وہ بنی امیہ کی مدد سے کھیلتا چاہتا تھا۔ چنانچہ حسن نے اپنے نانا کی مٹی زندگی کی خاموشی اختیار کر کے اور حسین نے نانا کی مٹی زندگی کا جہاد اختیار فرما کر دوبارہ وہی کام انجام دیا جو پیغمبر اسلام نے انجام دیا تھا اور آج یہ انہیں دونوں عظیم قائدین نسل انسانی کا کارنامہ ہے کہ دنیا میں وہ الہی پیغام زندہ اور موجود ہے جس پر انسانیت کی تکلیف کا انحصار ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر امام حسن علیہ السلام نے بنی امیہ کو بادشاہت سپرد کر کے ان کے چہروں سے غلامی کی نقابیں نہ الٹ دی ہوتیں اور حکومت انہیں اور انسانی حاکمیت کے فرق کو عملاً واضح نہ کر دیا ہوتا تو امام حسین علیہ السلام کو وہ کامیابی ہرگز نصیب نہ ہوتی جو آپ کو حاصل ہوئی۔ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے نکواری کی جنگ بند کرنے کا جو معاہدہ فرمایا تھا وہ دراصل معرکہ کربلا کی تمہید تھی کربلا کے فیصلہ کن معاہدہ کا آغاز تھا یہاں سے آل رسول کو یہ موقع ملا

تھا کہ وہ اسلامی دنیا کو اسلام کے صحیح تصورات سے آگاہ کرے۔ پھر جن لوگوں میں اسلام کی سچی لگن پیدا ہو جائے ان کو عظیم کرے اور اس جمعیت کو کربلا کے میدان میں اتار کر اپنی لائق قربانیوں سے اسلام کو حیات جاودا مل عطا کر دے۔

امام حسن علیہ السلام جنگ بدری کا معاہدہ نہ کرتے تو بنی امیہ حدود ملکیت اسلامی میں ویسا ہی غریب چپائے رہتے جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ میں انہوں نے عیا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ صحابہ و تابعین کی وہ شہر سی جماعت جو احادیث رسول کی امین اور شریعت اسلامی کی خزینہ دار تھی یا تو اموی نکواریوں کے گھاٹ اتر جاتی اور یا پھر منتشر ہو کر بے اثر اور جاہ ہو جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عرب میں دوبارہ دور جاہلیت پلٹ آتا۔ اسلام کی تعلیم دینے والے ختم ہو جاتے تھے اسلامی کے جاننے والے معدوم ہو جاتے اور اللہ کا آخری پیغام مٹ جاتا۔

امام حسن علیہ السلام نے جنگ بدر کر کے اس خطرہ کو دور کر دیا۔ آپ کے اس اقدام کے نتیجے میں بنی امیہ اسلام کی تاریخ مٹی کے بجائے انقضاء مملکت میں مصروف ہو گئے۔ ان کی توجہ اسلام دشمنی سے ہٹا کر سیاست مٹی پر مرکوز کر دی گئی اور ابو حرا ل رسول اور ان کے ساتھیوں کو سکون کی نفا میں اسلام کی تبلیغ کا موقع ہاتھ آ گیا۔ امام حسن علیہ السلام نے تبلیغ کا موقع فراہم کیا امام حسین علیہ السلام نے اس تبلیغ کے اثرات کو اپنی قربانی سے ناپائیدار بنا دیا اس طرح ان دونوں بھائیوں نے جو قدرت کی جانب سے نسل انسانی کی ہدایت پر مامور تھے اپنی جہ پناہ کا کارنامہ صلاحیتوں سے اسلام کو اموی فتنہ سے بچا لیا اور وہ کام جو بدر واحد میں رسول اللہ نے شروع فرمایا تھا مدینہ اور کربلا کی مقدس زمینوں پر رسول

یہ صلح خود علیؑ کی نیت سے ہوئی تھی۔ یہ صلح تیار کیا گیا۔ یہ صلح تیار کی گئی۔  
ایک بڑے حصہ پر اسلام کا پھر البرا رہا ہے۔

یہاں ہم امام حسن علیہ السلام کے بے پناہ تدریب و بصیرت کے ایک اور اہم مظاہرہ کی جانب ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ آپ نے معاویہ سے معاہدہ کر کے جہاں امام حسین علیہ السلام کو مناسب وقت پر ایک عظیم قربانی پیش کرنے اور اس طرح اسلام کو حیات نو عطا کرنے کا موقع عنایت کر دیا وہی مستقبل میں اس قربانی کی یادگار کو محفوظ رکھنے کا بھی سہارا کر گئے۔ امام کی دور بین نگاہوں پر دیکھ رہی تھیں کہ بنی امیہ امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دینے کے بعد جہاں جبر و قہر کا مسئلہ ایجاد کر کے قتل حسین کی ذمہ داری خدا پر ڈالیں گے۔ یا قتل الحسین بلیغ جہد کا نعرہ بلند کر کے قتل حسین کا الزام رسول پاکؐ کی ذلت پر لگائیں گے وہیں کوفہ والوں کی "شیعت" کا شور مچا کر کے اپنا جرم شیعوں کے سر تھوپنے کی کوشش بھی کریں گے اور بنی امیہ کے ہوا خواہ اس الزام کو ہمیشہ شد و مد سے دہراتے ہوئے حسین کی عزاداری کی مخالفت کریں گے۔ امام نے معاویہ سے معاہدہ کر کے شیعوں کو اس الزام سے قطعاً "بری اللذمہ" کر دیا اس لیے کہ معاہدہ پر دخل نہ ہوتے ہی کوفہ والوں نے امیر معاویہ کی بیعت کر لی اور اموی خلافت پر ایمان لے آئے ان کے اس اقدام نے یہ ثابت کر دیا کہ کوفہ والے ہرگز شیعہ نہیں تھے اس لیے کہ شیعہ امامت کے لیے عصمت اور منصوص من اللہ ہونا ضروری تصور کرتے ہیں اور امیر معاویہ نہ منصوص تھے نہ مامور من اللہ۔ ایسی حالت میں کوئی شیعہ نہ تو ان کی بیعت کر سکتا ہے اور نہ ان کو خلیفہ مان سکتا ہے۔ کوفہ والوں نے امیر معاویہ کی بیعت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ "انسانی حاکمیت" کے اصول پر ایمان رکھتے تھے اور یہ وہی لوگ تھے جو حضرت علیؑ

یہ صلح تیار کی گئی۔ یہ صلح تیار کیا گیا۔ یہ صلح تیار کی گئی۔

☆══════☆☆══════☆

## مکراؤ کی تیاریاں

امام حسنؑ کی شہادت کے بعد اسلامی تحریک کی قیادت امام حسینؑ کے ہاتھوں میں آئی۔ وقت بڑا پر آشوب تھا۔ بنی امیہ یہ سمجھ چکے تھے کہ آل رسولؐ کے قائدین ان کی بساط کفر و فحاشی کو الٹ ڈالنے پر تھے اور ان کی صلح دراصل ایک بڑی جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ اس سکون کے پردے میں ایک بڑا طوفان پرورش پا رہا ہے اور حسنؑ کی خاموشی درحقیقت ایک فیصلہ کن اور عظیم مکر اور پرتوج ہونے والی ہے۔ اسی لیے انہوں نے امام حسن علیہ السلام کو ڈر دلا دیا تاکہ آل رسولؐ مشتعل ہو کر ایک ایسے وقت میں مکراؤ پر مجبور ہو جائے جبکہ اس کی تیاریاں مکمل نہیں ہیں اور معاویہ کو صحابیتؓ کی وہ آڑ حاصل ہے جس کے پردے میں وہ گلشن اسلام کو تاراج کر ڈالنے کے باوجود اپنے چہرے پر بے گناہی اور مصومیت کی نقاب ڈالے رہ سکتا ہے لیکن بنی امیہ کا اندازہ بالکل غلط نکلا۔ آل رسولؐ کے افراد حکمت زہانی کے امین تھے اور وہ کسی وقتی اشتعال پر اپنے دائمی مقاصد کو قربان نہیں کر سکتے تھے۔ بنی امیہ اور ان کے ہمنواؤں کی تمام اشتعال انگیزیوں پر صبر کا ٹھنڈا پانی چھڑک دیا گیا حسنؑ کی فحش جھڑ رسولؐ میں دفن کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ حضرت عائشہؓ پھر سوار ہو مخالفت کرنے والوں کے پیش پیش تھیں۔ مروان اور اس کے ساتھیوں نے سبط اکبر کے نابوت پر حیر اندازی شروع کر دی۔ غرض اشتعال انگیزی کا ہر حربہ استعمال کیا گیا لیکن تحریک اسلامی کے تیرے قائد کی جین صبر پر کوئی شکن نمودار نہ ہو سکی حسینؑ جانتے

تھے کہ ابھی ان کے لیے مکراؤ کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اس وقت مکراؤ کے مستحق یہ ہوں گے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ اور خال المومنین امیر معاویہ دونوں صحابیتؓ اور خطائے اجتہادیؓ کی دواؤں میں منہ چھپا کے تاریخ کی نگاہوں میں بے گناہ بننے کی کوشش کریں گے اور آل رسولؐ کو ختم کر دینے کی سازش کامیاب ہو جائے گی۔ قرآنی راہنماں جائے گی جمل اور صفین کے پٹے ہوئے مرے جیت جائیں گے اور بنی امیہ دنیا کو یہ فریب دینے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ حسنؑ کے مرتے ہی حسینؑ نے ”مصول حکومت“ کی جنگ چھیڑ دی تھی جس میں وہ مارے گئے پھر مدینہ کا ماحول بھی کسی قرآنی کے لیے سازگار نہیں تھا اس لیے کہ جس مدینہ میں سبط اکبرؑ کی فحش مطہرہ تہوں کی بارش ہو اور لوگ اس واقعہ کو محض قرآنی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں وہاں اگر سبط اصغرؑ بھی ذبح ہو جاتا تو دلوں پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ مدینہ والوں کے دل مروہ اور ضمیر اشرف ہو چکے تھے۔ اس لیے وہاں کسی قرآنی سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے قائد کی حیثیت سے امام حسینؑ علیہ السلام نے یہی مناسب جانا کہ خانوادہ رسالت پر جو ظلم ہو رہا ہے اسے انگیز کر لیا جائے اور اسلام کو تاریخی سے بچا لیا جائے حسنؑ کی فحش جھڑ رسولؐ میں دفن نہیں ہو سکتی تو نہ ہو لیکن بنی امیہ کو اسلام کی تدفین کا موقع نہ ملنے دیا جائے معاویہ اور مروان کی سازش کو ناکام بنا دیا جائے اور اس جھڑ اسلام کی تاریخ کی نہ ہونے دی جائے جسے حسنؑ کی موت سے ناکارہ اللہ کے بنی امیہ ہمیشہ کے لیے کٹ دینا چاہتے تھے۔

مکراؤ کے لیے یہ وقت اس اعتبار سے بھی مناسب نہیں تھا کہ ابھی بنی امیہ کی سمت سی بد اعمالیاں مہر عام پر نہیں آئی تھیں اور عوام امیر معاویہ کو صحابی تصور کرتے ہوئے ”قریب عدالت“ میں جلاتے اس لیے یہ ضروری تھا کہ

ابھی انتظار کی روش قائم رکھی جائے اور جب فلاح کے چہرے پر پڑے ہوئے سب پر دے الٹ جائیں تو میدان میں قدم رکھا جائے تاکہ کراؤ میں کامیابی یقینی ہو جائے چنانچہ امام حسین علیہ السلام نے دشمن کی شدید اشتعال انگیزوں پر بھی در گذر سے کام لیا اور اپنے بھائی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان عظیم جہادوں میں مصروف رہے جو معرکہ کرب و بلا کے لیے درکار تھیں۔

مروان اور حضرت عائشہ مدینہ میں جنگ پھینک کر شامی مسیحی لشکر کو "جنگلات فرد کرنے" کے بہانے مدینہ پر لشکر کشی کی دعوت دے سکتے تھے۔ ان کو اس سے کوئی بھٹ نہیں تھی کہ مدینہ کی تاریخی اور اصحاب رسول کا قتل عام تفسیر حدیث اور فقہ کے خزانوں کی پامالی پر منتج ہو گا اور دنیا کے اسلام مٹ جائے گا ان کو بس لگ رہی تھی تو اتنی کہ اس طرح امیر معاویہ کے دربار میں مقیم ہو جائیں گے اور آل رسول کی فنا کے انعام میں امیر معاویہ ان کو سونے چاندی میں تول دیں گے لیکن امام حسین علیہ السلام اتنے پست اور ذلیل مقصد کی خاطر مدینہ کو خونریزی کا شکار نہیں ہونے دے سکتے تھے۔ آپ نے میر سے کام لے کر مدینہ اور علوم اسلامی دونوں کو چاہی سے بچا لیا اور ایک چپ سے وہ بلا ٹال دی جو اسلام کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

وقت گزر گیا اور بنی امیہ آل رسول کو خاموش دیکھ کر اپنی حرکتوں پر شیر ہونے چلے گئے ظلم و عدوان عام ہو گئے بیت المال اسلامی شاہی خزانہ بن گیا۔ فسق و فجور کی گرم بازاری ہو گئی اور اب ملت اسلامیہ کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ قیصریت شام کے راستے عربستان میں داخل ہو گئی ہے۔ قیصر کسری کی روح دمشق میں رقص کناں ہے۔ وہ آزادی جو اسلام نے انسان کو عطا کی تھی

سلب ہو رہی ہے اور انسان پر انسان کی احمقیت یا حکمت کے جس ظلم کو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑ ڈالا تھا وہ احمقیت کی شکل میں دوبارہ مسلمانوں پر نافذ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کے اس احساس کا اظہار قریش کے ایک بہت بڑے ستون سعد بن ابی وقاص نے معاویہ کے بھرے دربار میں اس طرح کیا کہ "آپ نے اسلام علیکم اے بادشاہ"

کہہ کر معاویہ کو سلام کیا اور جب معاویہ نے اس معنی خیز جملہ کا اثر کو کم کرنے کے لیے کہا کہ

"اے سعد اگر تم اسلام علیکم اے امیر المؤمنین کہتے تو کیا حرج تھا۔"

تو سعد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس جملہ کا یہ جواب دیا کہ  
"معاویہ خود اپنے دل سے پوچھو کہ میں نے تم کو جس لقب سے پکارا ہے وہ تمہارے دل کو کتنا محبوب ہے؟"

یہ تھی وہ کیفیت جو معاویہ کے دور سلطنت کے آخری ایام میں پیدا ہو چکی تھی لیکن ابھی حسین کو کچھ اور وقت درکار تھا۔ ابھی مسلمانوں کے قلب و ذہن پر ایک اچھوٹ لگنا باقی تھی اور تحریک اسلامی کا باطن نظر قائم اسی چوٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت نے یہ کسر بھی پوری کر دی امیر معاویہ نے یزید کی جانشینی کا فیصلہ کر دیا اور یہ فیصلہ اتنا مہیب اتنا جاہ کن اور اتنا خوفناک تھا کہ عبدالرحمن بن ابی بکر عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر کے سے عیان قریش بھی اس فیصلہ پر تھملا گئے مسلمانوں میں ایک الجھل سی پیدا ہو گئی اور عوام ملوکیت کا یہ ننگا ناچ دیکھ کر بے چین ہو گئے یہ پہلا موقع تھا جب امام حسین علیہ السلام نے سیاسی مطلع پر ظہور فرمایا اور آپ نے کلمہ کلاسیکی بادشاہت کے قیام پر اپنی ٹاپنڈیگی ظاہر فرمائی۔ لیکن یہ احتجاج محض زبانی تھا اس لیے کہ ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ جب

تحریک اسلامی کا قائد امویت پر فیصلہ کن ضرب عائد کرتا۔ ابھی نظام اسلامی کی بہیم مخالفتوں کے باوجود اموی حکمرانوں کے چہرہ پر مصلحت کی نقاب پڑی ہوئی تھی اور مسلمان آسانی سے جملائے فریب ہو سکتے تھے اس لیے امام نے خاموشی ہی مناسب جانی اور صرف احتجاج پر اکتفا فرمائی، لیکن امیر معاویہ سمجھ گئے کہ یہ احتجاج ایک ٹکراؤ کا پیش خیمہ ہے انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ آل رسولؐ کے متعلق ان کے سارے اندازے غلط تھے ان کا تصور مہمل تھا کہ آل رسولؐ کی ہمت ٹوٹ چکی ہے دل بیٹھ چکے ہیں۔ عزم ٹکٹھ ہو چکا ہے اور اب وہ بنی امیہ کی قہرمانی قوتوں کو چیلنج نہیں کرے گی چند سال قبل ان کو یہ احساس پیدا ہوا ہوتا تو وہ حسینؑ بن علیؑ کا بھی وہی حشر کر ڈالتے جو انہوں نے جبر بن ہدی اور رشید بھری کا کیا تھا۔ لیکن اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی دنیا میں حسینؑ کی پوزیشن بہت مضبوط ہو چکی ہے مسلم عوام میں فرزند رسولؐ کا وقار کافی بلند ہو چکا ہے۔ بنی امیہ کے افعال ناشائستہ کے نتیجہ میں عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ان کو دھوکا دیا گیا ہے اور اموی خلافت کے نام سے ان پر قیصری لوہیت نافذ کر دی گئی ہے۔ عوام میں اب یہ احساس بھی ابھرنے لگا ہے کہ آل رسولؐ کا موقف صحیح تھا آل رسولؐ اپنی ذاتی یا خاندانی بادشاہت کے لیے نہیں لڑ رہی تھی بلکہ ایک ایسے اصول کے لیے رزم آرا ہو رہی تھی جس میں خود مسلمانوں کا فائدہ تھا اور اس احساس کے نتیجہ میں عوام کی نگاہیں اپنی قیادت کے لیے حسینؑ کی جانب اٹھنے لگی تھیں۔ ایسی حالت میں امیر معاویہ کے لیے حسینؑ پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں رہا تھا اور وہی شخص جو چار سال تک امیر المومنینؑ کے مقابلہ میں سچ بکت رہ چکا تھا جس نے حسنؑ کو زہر دینا کا نشانہ بنا دیا تھا جس کے ہاتھ نیکیوں سے رنگین ہو چکے تھے اور جو قتل و غوریزی کو ایک کھیل

سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا۔ حسینؑ کے باپ میں کاہتا نظر آ رہا ہے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ علیؑ کے فرزند کو دعوت مہارت دے سکے یا یزیدؑ کی جانشینی سے انکار کے سوال پر حسینؑ کے قتل کا حکم جاری کر سکے۔

کیوں؟ — صرف اس لیے کہ اب ننانہ بدل چکا تھا۔ حرکتہ جعفرینؑ کو بیس سال بیت چکے تھے۔ اس بیس سال میں مسلمانوں کو کافی تجربے ہو چکے تھے۔ امویت پر اسلام کے جو پردے ڈال رکھے گئے تھے وہ سب اٹھ چکے تھے حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آ چکی تھی فریب کاروں کا ظلم ٹوٹ چکا تھا اور دنیا یہ سمجھ چکی تھی کہ — بنی امیہ کیا چاہتے ہیں؟

اور

آل رسولؐ کیا چاہتی ہے؟

آل رسولؐ کے مقاصد کی اتوج و اشاعت کی جنگ جیتی جا چکی تھی اور جن حقیقتوں پر قریش اور بنی امیہ نے اپنی مغلو پرستی کی خاطر پردے ڈال رکھے تھے وہ اس بیس سال کے عرصہ میں پورے طور پر عوام کے سامنے آ چکی تھیں۔ معاویہ کو اس چہرے کا پورا احساس تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ خود امام حسینؑ علیہ السلام سے ٹکراؤ لینا مناسب نہیں سمجھا بلکہ یزیدؑ کو بھی مشورہ دیا کہ حتی الوسع حسینؑ سے جنگ نہ کرنا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلم عوام کے دل آل رسولؐ کے ساتھ ہو چکے ہیں۔ اور ایسی حالت میں اگر جنگ ہوئی تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا کہ اسلام دشمن قوتوں کا خاتمہ ہو جائے اور وہ اسلام بھر سے سرہانہ ہو جائے جسے منانے کی خاطر بنی امیہ کو اپنے کل پر اسلام کا ملح چڑھانا پڑا تھا۔

معاویہ کی جانب سے خوف اور کمزوری کا یہ مظاہرہ تحریک اسلامی کے

تیسرے قائد کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

زمانہ نے ایک اور ورق الٹا۔ معاویہ کا انتقال ہو گیا یزید کو دمشق کا تخت و تاج حاصل ہو گیا افغانستان سے لے کر تونس تک اور شام سے لے کر یمن تک پھیلی ہوئی عظیم اسلامی سلطنت یزید کے ہاتھوں میں آگئی لیکن یزید نے تخت پر بیٹھتے ہی یہ سمجھ لیا کہ اس کی سلطنت محکم نہیں ہے۔ اس کی بادشاہت کے قدم لرزنا ہیں اس کا قصر حکومت کانپ رہا ہے اس لیے کہ مدینہ کے ایک گوشہ میں آل رسولؐ کا جو پورا لشکر قائم موجود ہے اسے نسل بادشاہت کا یہ فتنہ سخت ٹاپند ہے یزید اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ ولوا کا مقصد اسلام کو فاکر دینا تھا لیکن وہ اپنے اس مقصد میں محض اس لیے کامیاب نہیں ہو سکا کہ آل رسولؐ ان کی راہ میں مزاحم تھی۔ اور ان میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ آل رسولؐ کو ختم کر کے دنیا سے اسلام کے نقوش کو فنا کر ڈالتے۔ یزید جو ان تھا اور جوانی کے نشہ کو طاقت، سلطنت اور دولت کے نشہ نے دو آتشہ کر دیا تھا۔ شراب اور عیاشی نے عقل و خرد پر کچھ اور پردے ڈال دیے تھے۔ اس نے نام حکومت سنبھالتے ہی یہ حکم صادر کر دیا کہ۔

”حسینؑ سے بیعت لی جائے اور اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان کا سر گردن سے

جدا کر دیا جائے۔“

یزیدؑ دمشق کے ایوان حکومت میں پلا بڑھا اور جوان ہوا تھا اسے آل رسولؐ کی طاقت یا ان کے کردار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اسے صرف قیصری انداز کا علم تھا، لامت کے طریق کار کا کوئی علم نہیں تھا چنانچہ اس نے وہ کیا جو ایک قیصر کو کرنا چاہیے تھا۔ حسینؑ سمجھ گئے کہ وہ جس موقع کے منتظر تھے وہ آگیا ہے چنانچہ انہوں نے قیصریت کے مقابلہ میں اسلامیت کے حربے سنبھال لئے اور اس

عظیم کراؤ پر اٹھا ہو گئے جس پر اسلام کی حیات نو کا انحصار تھا۔

جنگ کا آغاز مدینہ کی سرزمین سے ہوا۔

یزیدؑ کے عامل ولید بن عقبہ نے امام سے بیعت کا مطالبہ کیا اور مروان بن حکم نے صاف صاف کہہ دیا کہ حسینؑ بیعت نہ کریں تو ان کا سر کاٹ لیا جائے۔ یہ پہلا کراؤ تھا جو حسینؑ اور یزیدؑ کے مابین ہوا۔ حسینؑ جانتے تھے کہ مدینہ میں تلوار سنبھال لینے کا نتیجہ قبر رسولؐ کی لہنت اور علوم اسلامی کے نوانہ داروں کی موت کی شکل میں برآمد ہو گا۔ اس لیے آپ نے تلوار کی جنگ سے گریز کیا اور مدینہ سے رخت سفر باندھ لیا۔ یزیدؑ کا حال نہ آپ کو قتل کر سکا اور نہ گرفتار کر سکا یہ یزیدؑ کی پہلی شکست تھی اور حسینؑ کی ایک عظیم کامیابی۔

یزیدؑ نے جنگ کے لیے مدینہ کا انتخاب کیا تھا اس لیے کہ مدینہ میں قتل حسینؑ کے ساتھ ساتھ اسلام کا نقش آخریں فنا کر دینے کا بھی موقع تھا لیکن حسینؑ نے دشمن کو یہ موقع نہیں دیا بلکہ اسے مجبور کر دیا کہ وہ اس مقام پر حسینؑ سے جنگ کرے جو حسینؑ کے لیے بہتر ہے جو حسینؑ کے مقاصد کے لیے مفید ہے اور جس سرزمین پر جنگ کا نتیجہ یزیدیت کی موت، الموت کی شکست اور جزیرہ نمائے عرب میں کفر و فحاشی کی قوتوں کی عمل برداری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

یزیدؑ کے لیے جنگ کا بہترین میدان مدینہ تھا اور حسینؑ کے لیے کراؤ کی بہترین جگہ کربلا، مدینہ وہ سرزمین تھی جہاں

حضرت علیؑ علیہ السلام کے مخالف ماجرین قریش کی باقیات کافی تعداد میں موجود تھی جسے ظاہر ہے کہ امام حسینؑ علیہ السلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔

- ۲۔ عوام اپنا کردار اور حرارت ایمانی اس درجہ کھوپچکے تھے کہ واقعہ حرم میں قبر رسول کی لہانت کے بعد لوگوں نے یزید کی غلامی تک پر بیعت کر لی۔
- ۳۔ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کے باوجود مدینہ والوں نے جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علی کی ہمت کم مدد کی تھی۔
- ۴۔ مدینہ میں امام حسین علیہ السلام قتل ہو جاتے تو مدینہ میں تو ابین یا عمار کی سی کوئی تحریک شروع نہ ہوتی اور مدینہ والے اس شہادت پر بھی اسی طرح بے حسی کا مظاہرہ کرتے جس طرح امام حسن علیہ السلام کی شہادت پر۔

اس کے مقابلے میں عراق وہ سرزمین تھی جہاں

- ۱۔ آل رسول کے موقف کو سمجھنے والے موجود تھے چنانچہ شہدائے کربلا میں کوفہ کے حضرات کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔
- ۲۔ عراقیوں نے جمل اور صفین میں بڑے پر جوش طریقہ سے آل رسول کا ساتھ دیا تھا۔
- ۳۔ عراقیوں میں حرارت ایمانی اور زندگی کے جوہر موجود تھے چنانچہ امام کی قربانی کا جیسا اثر عراقیوں نے لیا ویسا کہیں نہیں لیا گیا۔ تو ابین اور عمار اسی سرزمین سے اٹھے اور بنی امیہ کا خاتمہ کرنے میں عراقیوں نے پُر جوش حصہ لیا۔
- ۴۔ عراق میں قربانی دینے میں یہ مصلحت بھی تھی کہ عراق اس وقت کے اسلامی عالم کے عین قلب میں واقع تھا اور یہاں سے واقعہ شہادت کی خبریں تمام اسلامی دنیا میں جلد پہنچ جانا چاہی تھیں۔
- امام علیہ السلام نے مدینہ میں جنگ نہ کر کے اموی سیاست کو ایک بڑی

دک دی جس کے اثرات عالم میں آشکار ہیں۔

امام مدینہ سے نکل کر مکہ چلے گئے اور اس زمانہ میں گئے جب مکہ میں اطراف و اکناف عالم کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ دنیا بھر میں اپنے مقاصد کی اشاعت کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ امام نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور تلواریں کے ذریعے عالم اسلام کو آنے والے واقعات سے باخبر کرنا شروع کر دیا یہاں بھی یزید نے یہ چاہا کہ ٹکراؤ ہو جائے اور اموی لشکروں کو حرم کعبہ پر کرنے کا موقع ملے۔

کے پردہ میں مکہ چھپی گئی تاکہ وہ حسین علیہ السلام کا کام تمام کر دے۔

یزید جانتا تھا کہ اس وقت حسین کے ساتھ کئی ہزار آدمی موجود ہیں اس لیے اگر حسین پر کاٹنا نہ حملہ کیا گیا تو مکہ میں فتنہ برپا ہو جائے گا اور یزیدی لشکر کو "ہوائے امن" یا "مہجرت فرو کرنے" کے نام پر کعبہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا موقع مل جائے گا لیکن یہ اس کی بھول تھی کوئی اچھا جو نیل ایسی جگہ نہیں لڑتا جہاں اس کے مقاصد کو ناکست ہو سکے۔ تحریک اسلامی کا قائد اعظم بھی ایسی ظلی کا مرکب نہیں ہو سکتا تھا۔ حسین کو جنگ کا رقع کرنا تھا اسلام کے لیے اس لیے وہ ایک ایسی جگہ نہیں کر سکتے تھے جہاں جنگ کا نتیجہ اسلام کی برتری کی شکل میں برآمد ہو سکتا تھا اس لیے امام نے حج کو عمرہ سے بدل کر مکہ کو چھوڑ دیا۔ حج کے لیے جمع ہونے والے لاکھوں مسلمان فرزند رسول کو اس طرح مکہ چھوڑنے دیکھ کر خیران نہ گئے ہوں گے اور یقیناً ان کے دلوں اور دماغوں پر ایک ضرب سی لگی ہوگی انہوں نے سوچا ہو گا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اور جب ان کو یہ معلوم ہوا ہو گا کہ اموی خلافت حرم محترم کی عزت و عظمت لوٹنے پر آمادہ تھی تو ان کے دلوں میں جو جذبات پیدا ہوئے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا مشکل



نہیں ہے۔

امیر معاویہ کا انتقال ۲۲ رجب کو ہوا تھا اور امام نے ۲۸ رجب کو مدینہ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ امام نے شعبان، رمضان، شوال اور ذیقعدہ کے پورے چار مہینے اور ذی الحجہ کا ایک ہفتہ مکہ میں گزارا۔ اس میں بظاہر مصلحت یہ تھی کہ یزید کا کردار اسلامی دنیا پر پوری طرح روشن ہو جائے اور مسلمان اپنے حکمران کی جانب سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں چنانچہ یہ مقصد بھی پورا ہوا یزید کے حالات عام ہو گئے مسلمانوں میں بے چینی بڑھنے لگی اور عراقی مسلمانوں نے اپنی بے چینی کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں ہزاروں خطوط پہنچانا شروع ہو گئے جن میں یزید سے ہزاری کا اظہار کرتے ہوئے یہ درخواست کی جا رہی تھی کہ آپ عراق تشریف لا کر مسلمانوں کو اس غلامی سے نجات دلائیں جس میں وہ بنی امیہ کی بدولت مبتلا ہو گئے تھے۔

یزید کے خلاف یہ بے چینی صرف عراق تک محدود نہیں تھی بلکہ بعد کے حالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ پوری دنیائے اسلام میں اموی اقتدار کے خلاف بے چینی پیدا ہو گئی تھی جس سے سیاسی فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ بن زبیر نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔

مکہ چھوڑ کر امام نے عراق کا رخ کیا تاکہ ایسے مقام پر یزید سے ٹکرائو ہو جو اس وقت کی مملکت اسلامی کے عین قلب میں واقع تھا اور افریقہ اور ایشیا کے مابین قاتلوں کی سب سے بڑی گزرگاہ شمار کیا جاتا تھا عراق میں حسینی قربانی کا مقصد یہ تھا کہ یزید اور اس کے ساتھی واقعات پر پورہ نہ ڈال سکیں بلکہ ایران، شام، فلسطین اور عرب کے گوشہ گوشہ میں حسین کے مقاصد عام ہو جائیں یہ سرزمین

آل رسول کے مقاصد جنگ کے اعتبار سے بہت اچھی اور مناسب تھی اور امویوں کے لئے جنگی اعتبار سے قطعاً "جاہ کن یزید" اس رمز کو نہیں سمجھ سکا اور وہ ایک ایسے علاقہ میں حسین کا خون بہانے پر آمادہ ہو گیا جہاں اس پر پورہ ڈالنا محال تھا جہاں سے حسینی قربانی کی اطلاع جنگ کی آگ کی طرح پھیل جانا چاہی تھی اور جہاں سے وہ شرابے بلند ہونے والے تھے جو اموی بادشاہت کے ساتھ ہی ساتھ اموی اصولوں کو بھی جلا کر خاکستر کر دینے والے تھے۔

امام نے عراق کا رخ کرنے سے پہلے اپنے چچا زاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ عراقیوں کو امام کی آمد امام کے مقاصد اور آل رسول کی تحریک سے پوری طرح باخبر کر دیں۔ کوفہ میں اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے مسلم کی بیعت کی جو اس کا ثبوت ہے کہ مسلم عوام اموی حکومت سے رنج آچکے تھے اور وہ ان کے مانگوں میں یہ خیال گردش کرنے لگا کہ اموی حکومت اس خلافت الیہ سے بالکل الگ ایک چیز ہے جس کے قیام کا اسلام وادی ہے یہ صحیح ہے کہ بعد میں عبداللہ بن زیاد کے خوف اور طمع دنیا میں مبتلا ہو کر کوفیوں نے مسلم کی بیعت توڑ دی اور ان کو ذبح کر ڈالا گیا لیکن یہ واقعہ کہ کوفیوں نے مسلم کی بیعت کی اس امر کا ثبوت ہے کہ آل رسول کی تحریک دلوں میں گھر کر چکی تھی پیغام عام ہو چکا تھا اور اب ضرورت صرف اس امر کی رہ گئی تھی کہ ایک بڑی قربانی پیش کر کے اس احساس کو اعتقاد میں اور اعتقاد کو عمل میں تبدیل کر دیا جائے۔

کوفہ میں حسین کے قاصد اور ابن زیاد کے مابین جو ٹکرائو ہوا وہ بھی حق پرستی کی تاریخ میں اب زور سے لکھے جانے کے قابل ہے یہ صحیح ہے کہ مسلم شہید

ہو گئے لیکن لن کی گرفتاری کے لئے پے در پے تین دستوں کا رول نہ کیا جانا اور ہر دست کا ٹکٹ کھانا شجاعت کی تاریخ کا ایک حیرت انگیز باب ہے۔

بہر حال اس جنگ کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پہلے عراق میں امام حسین علیہ السلام کی آمد اور آپ کے مقاصد کی اشاعت ہو گئی اور یزید کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ حسینی قرظی پر پردہ ڈال دے اموی سیاست کے طریق کار کا اندازہ رکھنے والے اصحاب فہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ یزید کی کتنی بڑی شکست تھی۔

مسلم کی شہادت سے امام کو دوسرا قائد یہ ہوا کہ کوفہ کے سچے مسلمانوں کے دل لرز اٹھے اور لن کے خستہ ضمیر بیدار ہو گئے چنانچہ میدان کربلا میں امام کے ساتھیوں کی فہرت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء میں بڑی اکثریت کوفہ والوں کی تھی۔ بریر بن خبیر، مسلم بن عوف، حبیب بن مظاہر، سعید ابن عبداللہ، زہیر بن قین، حر بن یزید، عابس بن شیب، فرض سید الشہداء کے ممتاز ساتھیوں کی اکثریت کوفہ والوں پر مشتمل تھی۔

لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ امام نے مکہ اور مدینہ پر کوفہ کو کیوں ترجیح دی؟ لیکن وہ یہ بھولتے ہیں کہ حسن کی شہادت پر مکہ یا مدینہ میں ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو اموی حکومت کے خلاف محض زبانی احتجاج بھی کر دیتا لیکن کوفہ وہ جگہ تھی جہاں مسلم کی شہادت نے یہ اثر کیا کہ امام پر جان قربان کرنے کے لئے تقریباً پچاس آدمی میدان کرب و بلا میں پہنچ گئے اور پھر حسین کی شہادت نے کوفہ پر یہ اثر کیا کہ "یا غارات الحسین" کی گواہیں اس وقت تک نہ وہب سکیں جب تک کہ نہ صرف اموی حکومت کا بلکہ بنی امیہ کی نسل تک کا نام و نشان دنیا سے نہ مٹا دیا گیا تحریک اسلامی کے تیسرے قائد کی یہ انتہائی پانچ نظری تھی کہ وہ

یہ سمجھ رہا تھا کہ کوفہ لن مقاصد کے اعتبار سے بہترین جگہ ہے اور وہاں کے رہنے والوں میں لب بھی اتنی جرات اور زندگی موجود ہے کہ اگر ایک قرظی کے سارے لن کی رگ دل میں کھتر پھوس دیا گیا تو وہ اموت کا خاتمہ کر دیں گے اس کے برعکس مکہ اور مدینہ کے لوگ اتنے مردہ ہو چکے ہیں کہ کعبہ کا پردہ جل لٹھے گا حرم محترم پر آتشباری ہو جائے گی قبر رسول پر گھوڑے باندھ جائیں گے انصار کی عورتوں کی حرمت لٹ جائے گی لیکن مکہ اور مدینہ کے لوگ پھر بھی غیرت و حمیت کی چنگاریوں کو اپنے دلوں سے دور رکھیں گے اور ہر قسم کی ذلت برداشت کرنے کے باوجود اسلام کو دشمنوں کے پنجے سے رہا کرانے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کریں گے حضرت مالک کے چہیتے بھانجے حضرت ابو بکر کے حقیقی نواسے اور قرظی مغالوت کے بہت بڑے علمبردار عبداللہ بن زبیر کا خود مکہ میں قتل بھی لن کے دلوں میں کوئی حرارت نہیں پیدا کر سکے گا ایسی حالت میں حسین کو لن لوگوں سے کیا امید ہو سکتی تھی؟ جو قرظی و انصار اس عبداللہ بن زبیر کے نہ ہوئے جو لن کو دوبارہ سلطنت اور دولت کا مالک بنا دینے کا دعویٰ کر رہا تھا وہ پچھارے حسین کا ساتھ کیسے دیتے جو حکومت کو اللہ کے لئے اور دولت کو مساویانہ تقسیم کی شے قرار دیا کرتا تھا ایسی حالت میں یقیناً کوفہ امام کے مقاصد کے اعتبار سے بہتر تھا اور یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنی قرظی کے لئے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں اس قرظی کا زبردست اثر ہونا اور اس اثر کے نتیجے میں اموی اقتدار کے خاتمہ کی دلغ قتل پڑ جانا یقینی تھا۔

امام عراق کی سرحد میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے یزیدی فوجوں نے حر کی قیادت میں آپ کا راستہ روکا لیکن حر نہ تو آپ کو گرفتار کر سکا اور نہ ایک ایسی غیر مردہ جہل پر آپ سے جنگ کر سکا جہاں جنگ کا مطلب آپ کے لئے

گناہی کی موت ہو سکتا تھا مقصدی اعتبار سے یہ بھی یزید کی ایک بڑی شکست تھی اور اس نگرار میں بھی امام کو فتح مبین حاصل ہوئی اس لئے کہ امام برابر اپنی منزل کی جانب بڑھتے چلے گئے اور یزیدی لشکر آپ کو کوفہ سے قریب تر پہنچ جانے سے نہ روک سکا۔

اس سلسلہ میں امام کو ایک اور بڑی کامیابی یہ نصیب ہوئی کہ حر اور اس کے ساتھیوں کو امام کے کردار اور آپ کے بلند مقاصد کے مطالعہ کا پورا موقع حاصل ہوا اور جس کے نتیجے میں حر اتنا متاثر ہوا کہ جب وہ روز عاشور آپ پر قربان ہو گیا تو کم از کم اس کے لشکری اہلئے متاثر ضرور ہوئے ہوں گے کہ بعد شہادت ان کے لیوں پر مرگنا حکومت کے لئے ناممکن ہو گیا ہو گا اور یہ دشمن کے سپاہی حسینی مقاصد کی اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ بن گئے ہوں گے۔

امام کربلا پہنچے تو آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ یہ سرزمین ساٹھ ہزار درہم میں خرید لی اب امام سرزمین کربلا کے مالک تھے۔ شرعاً اور قانوناً اس سرزمین پر یزیدی فوجوں کی آمد ایک جارحانہ و براہ راستی کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار دی جاسکتی اور یزیدی کی یوزیشین صرف صاف ایک ایسے حملہ آور کی ہو جاتی ہے جو

ایک شخص کی زمین پر غمگین رہے اس کے آس پاس وہاں سے ہرگز نہ رہے۔ قانونی، اخلاقی اور شرعی ہر اعتبار سے اس سرزمین پر یزیدی فوجوں کا داخلہ ناجائز ہو جاتا ہے اور یزید کی حیثیت ایک مجرم کی ہو جاتی ہے وہ ایک ایسا غیر عادل انصاف ناشناس اور قانون شکن بادشاہ ثابت ہو جاتا ہے جسے ظلیفہ کا لقب دینا خود لفظ خلافت کی تہذیب و توہین کے علاوہ اور کچھ نہیں کما جائسکتا۔

امام چاہتے تو عشرہ محرم کی ابتدائی تاریخوں میں ہی یزید سے جنگ کر سکتے تھے لیکن آپ جنگ کو ٹالتے رہے تاکہ یزیدی فوجوں کا زیادہ سے زیادہ انجملع ہو

جائے چنانچہ نویں محرم تک کربلا کے میدان میں ۳۵ ہزار آدمیوں کا انجملع ہو گیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ چیز یزید کے لئے انتہائی مسلک ثابت ہوئی اس لئے کہ جس واقعہ کو ۳۵ ہزار آدمیوں نے دیکھا ہو اس پر پردہ ڈالنا یا آل رسول کو متحرک و دہم کے پائی "قرار دینا اب محض ناممکن ہو گیا اور بنی امیہ کی یہ تدبیر ناکام ہو گئی کہ خاموشی سے آل رسول کا خاتمہ کر دیا جائے۔

یزیدی لشکر نے نویں محرم کی شام کو جنگ چھیڑنا چاہی لیکن امام نے عبادت کے لئے ایک رات کی سہولت سے رات اس طرح گویا لشکر یزید کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ حسین اور یزید کے کردار دونوں کے مقاصد جنگ اور دونوں کے موقف پر غور کرے۔ جنگی نقطہ نظر سے یہ ایک بہت ہی اہم ضرب تھی جو یزید پر مائد کی گئی اس لئے کہ جس لشکر کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ حق کی خاطر نہیں لڑ رہا ہے اور ایسے لوگوں کے مقابلہ میں ہمد آنا ہے جو سرتا سر حق پر ہیں اس لشکر کا نظم لانا بگڑ جاتا ہے اس کے سپاہیوں کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور اس میں کمزوری کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں یزیدی لشکر میں زیادہ تر کوفہ کے لوگ تھے جو حسین کی شخصیت سے واقف تھے اور سب وہ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے

تھے۔ ایک ایک شخص جو حسین سے دوستی کرتے تھے وہ بھی حسین سے دوستی کرتے تھے۔

یہ کہ موت کو لیک کہہ رہا ہے بلکہ موت پر اتنا مطمئن بھی ہے کہ اپنی تہذیبی عبادت پر اپنی کرتے کے لئے ایک رات کی سہولت طلب کر رہا ہے اس واقعہ نے یزیدی سپاہیوں پر جو اثر ڈالا ہو گا اور رات بھر خیام حسینی سے اٹھتی ہوئی تسبیح و تمجیل کی آوازوں نے دشمن سپاہیوں کے قلب پر جو تاثرات پیدا کئے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے عزم و حرب پر جتنے خراب اثرات مرتب ہوئے ہوں گے نفسیاتی طور پر ان کے دلوں میں جو کمزوری

پیدا ہوتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے مشکل نہیں ہے  
دسویں کی صبح کو امام نے صفوف لشکر آراستہ کرتے ہی بربر بن خضیر ہمدانی  
کو لشکر مخالف کی جانب بھیجا کہ وہ اسے سمجھائیں نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی ایک  
کاری ضرب تھی جو یزیدیت پر حاکم کی مٹی اس لئے کہ بربر کوفہ کے ایک مشہور  
عالم تھے اور لشکر مخالف میں سینکڑوں ایسے افراد موجود تھے جنہوں نے بربر سے  
قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی۔ کوفہ کے سب سے بڑے عالم اور معلم قرآن  
کو سامنے دیکھ کر کوئی سپاہیوں کے دلوں کی جو کیفیت ہوئی ہوگی ان میں اپنے  
طریق کار کی غلطی کا جو احساس ابھرا ہو گا اور ان پر جو ندامت طاری ہوئی ہوگی  
اور پھر اس کے نتیجے میں ان کے جذبہ جنگ میں جس حد تک کمی آئی ہوگی ان  
کے دلوں میں ہرگز زوری پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگانا بھی ہمارے لئے کچھ مشکل  
نہیں ہے۔

صبح عاشور کے اس پہلے ٹکراؤ میں حسینؑ کی کامیابی ناقابل تردید ہے بربر  
کی واپسی کے بعد خود امامؑ میدان میں برآمد ہوئے اور کوفیوں کو اپنی حرکت سے  
آگاہ کرنے کے بعد آپ نے ان کے سامنے وہ خطوط پیش فرمائے جو انہوں نے  
امامؑ کو کوفہ تشریف لانے کے متعلق روانہ کئے تھے۔ نفسیاتی اعتبار سے یہ بھی  
ایک غضب کا وار تھا اور اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ  
دشمن ندامت کا شکار ہو کر ہمت چھوڑ دے چنانچہ امامؑ اس مقصد میں یہی حد تک  
کامیاب ہوئے دشمن کا عزم جنگ اس کی جرأت اور اس کی جنگ آزمائی کی قوتیں  
اتنی کمزور ہو گئیں کہ بہتر آدمیوں کی ایک مختصر سی جماعت ۳۵ ہزار کے لشکر کے  
مقابلہ میں دن بھر جنگ جاری رکھ سکی جب کہ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ جنگ  
فورا سے زیادہ گودہ گودہ میں ختم ہو جاتی اور یزیدی لشکر ایک ہی ریلے میں حسینؑ

جماعت کا خاتمہ کر دیتا۔

عاشور عزم کی جنگ حق پرستوں کی تاریخ میں ہمیشہ آب و زور سے لکھی  
جائے گی اس لئے کہ تین دن کے بھوکے پیاسے مٹی بھر انسانوں کا ایک لشکر عظیم  
سے دن بھر مردانہ وار مقابلہ اور دشمن کے کئی ہزار سپاہیوں کا قتل تاریخ شجاعت  
کا ایک ایسا عظیم القبول کارنامہ ہے جس پر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔  
عمر بن محضاب زیدی کی سرکردگی میں یزید کے دس ہزار سواروں نے امام کے  
میسرہ پر جو صرف تیس آدمیوں پر مشتمل تھا حملہ کیا۔ کمال دس ہزار سوار اور  
کمال تیس پیادے لیکن جنسیتاً بن مظاہر نے اس خوبصورتی سے اس ریلے کو روکا کہ  
دشمن کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے اور بالآخر اسے پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ تاریخ  
اسے "حملہ اولیٰ" کے لقب سے یاد کرتی ہے اور اس میں یزیدی فوج کی شکست کا  
صاف صاف اعتراف کرتی ہے۔

شہر کے وقت شمر کی سرکردگی میں یزید کے دس ہزار سپاہیوں نے پشت کی  
جانب سے خیام حسینؑی پر حملہ کیا لیکن یزیدی فوج اس حملہ میں بھی ناکام رہی اور  
شمر کو کافی نقصان اٹھانے کے بعد پسپائی کا رخ اختیار کرنا پڑا۔  
شہر کے چار ہزار پاساؤں کی حضرت عباسؑ کے مقابلے میں شکست تاریخ کی  
ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

حضرت علی اصغرؑ کی شہادت یزیدی فوج کی وہ اخلاقی لہری شکست ہے جس  
پر پردہ ڈالا جانا قطعاً "حلال" ہے۔ عرسہ کے لشکر کا بے شہرگی لنگھی پر رو دینا اس  
امر کا ثبوت ہے کہ اس حسینی حربہ نے دشمنوں کے دلوں میں بھی سوئی ہوئی  
انسانیت کو تھوڑی دیر کے لئے جگا دیا تھا اور یزیدی لشکر کو ایک مرتبہ یہ احساس  
پیدا کرا دیا تھا کہ اس کی روش حق دشمنی اور انسانیت دشمنی پر مشتمل ہے۔

حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد خود امام حسین علیہ السلام نے جنگ فرمائی اور اس قیامت کی جنگ فرمائی کہ لشکر یزیدی میں بھگدڑ مچ گئی مورخین اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ لشکر یزیدی کا قلم اس درجہ بگڑ چکا تھا کہ اس میں ایک یکہ و تما انسان کا مقابلہ کرنے کی قوت باقی نہیں رہی تھی اور امام نے اپنی مختصر سی جنگ میں تقریباً دو ہزار یزیدی سپاہیوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ اس جنگ سے امام کا مقصد محض یہ تھا کہ جہاد کا فریضہ پورا کر لیا جائے اور یہ ظاہر کر دیا جائے کہ حق پرست مردانہ وار جنگ سے کبھی منہ نہیں پھیرتے۔

چنانچہ یہ مقصد پورا ہو گیا تو آپ نے تلوار نیام میں رکھ لی جنگ بند کر دی اور اس مقصد عظیم کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے جو یزیدیت کی شہ رگ کو ہمیشہ کے لئے کاٹ دینے والا تھا یعنی شہادت عظمیٰ!

امام علیہ السلام شہید ہو گئے لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ امام کی شہادت کے ساتھ جنگ کا خاتمہ ہو گیا جنگ اب بھی جاری رہی بالکل اسی طرح جس طرح حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد جاری رہی یہ اور بات ہے کہ حق پرستوں کے لشکر ہمدرد بدل گیا۔ حسین بن علیؑ کی جگہ علی بن ابی طالبؑ سلار لشکر ہو گئے یا جس طرح امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام حسن علیہ السلام نے جنگ کا انداز بدل دیا تھا اسی طرح امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام نے انداز جنگ بدل دیا صحیح و سنان کی جگہ ہتھیاریوں اور بیڑوں نے لے لی اور حبیب و زبیر و علی اکبرؑ کے بجائے زینبؑ و ام کلثوم و فاطمہ کبریٰ نے مورچے سمجھال لئے بہر حال انداز جنگ بدلا۔ جنگ ختم نہیں ہوئی اور اسی حقیقت کو نہ سمجھنے کے نتیجے میں بعض کو تباہ قلم لوگ یہ فیصلہ دے دیا کرتے ہیں کہ معرکہ کربلا میں آل رسولؐ کو ظاہری طور پر شکست ہو

گئی واقعہ یہ ہے کہ ایک جنگ عظیم میں دو جنوں چھوٹے بڑے معرکے ہوتے رہتے ہیں جن میں کبھی ایک فریق کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کا لیکن ان چھوٹے چھوٹے معرکوں کی اساس پر شکست یا فتح کا فیصلہ نہیں کیا جاتا شکست و فتح کا فیصلہ دراصل انتہام جنگ پر ہوتا ہے اگر عاشورہ کے روز جنگ ختم ہو گئی ہوتی تو ہم لانا یہ کہہ سکتے تھے کہ آل رسولؐ کو ظاہری شکست ہوئی لیکن چونکہ جنگ ختم نہیں ہوئی اس لئے امام کی ظاہری شکست کا فیصلہ کر دینا حقیقت سے بعید اور کوتاہ فہمی کا مظاہرہ ہے معرکہ کرب و بلا دراصل مجاہدہ حق و باطل کا ایک معرکہ تھا جس میں بظاہر پلہ یزید کی جانب جھکا نظر آتا ہے لیکن محض اس معرکہ کو اصل جنگ تصور کر لینا غلط ہے ابھی جنگ جاری تھی اور میدان جہاد میں نہ سہی قید خانہ کی دیواروں میں لڑی جا رہی تھی اس لئے امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر فتح و شکست کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا اس فیصلہ کے لئے ہمیں انتہام جنگ کا انتظار کرنا پڑے گا۔

امام علیہ السلام کی شہادت کے بعد لشکر یزید نے خاتونہ رسالت کی خواتین کو گرفتار کر لیا اور بیٹوں سے بنی امیہ کی شکست کا آغاز ہو گیا یہ لانا ہوا قاتلہ کوفہ پانچا ہم دربار کوفہ کے تفصیلی واقعات بیان نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف اس حقیقت کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ محض تین دن کے اندر اندر کوفہ کے حالات ایسے بدلے کہ عبید اللہ بن زیاد اہل حرم کو کوفہ سے دمشق روانہ کرنے پر مجبور ہو گیا اس لئے کہ اس نے یہ سمجھ لیا کہ اگر خاتونہ عصمت کی خواتین چند روز اور کوفہ میں رہ گئیں تو عراق میں زبردست بغاوت ہو جائے گی اور یہ بغاوت ایسی ہو گی جس پر قابو حاصل کرنا اموی حکومت کے لئے ناممکن ہو جائے گا عبید اللہ بن زیاد کے اس اقدام کو بظاہر ایک بڑی سیاسی دور بینی قرار دیا جائے گا لیکن

درحقیقت یہ اس کی انتہائی خوفناک غلطی تھی اس لئے کہ اس کے اس اقدام کے نتیجہ میں آل رسولؐ کو پہلی بار شام کی سرزمین پر قدم رکھنے اور شامیوں کے سامنے حقیقت اسلام اجاگر کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ امام حسین علیہ السلام اپنے ساتھ خواتین کو جس غرض سے لے گئے تھے وہ پوری ہو گئی اور شام کے جن دروازوں پر بنی امیہ نے پہرے بٹھا رکھے تھے وہ آل رسولؐ کے لئے پائوں پات کھل گئے۔

مقتدی القبار سے یہ بھی اموی سیاست کی ایک ہولناک شکست تھی۔ کوفہ سے دمشق تک کا راستہ ایک دریائے خون تھا جس سے یزیدی لشکر کو گزرنا پڑا۔ راستہ میں انہیں مقامات پر یزیدی لشکر کو مقامی آبادیوں سے جنگ کرنا پڑی جس میں صرف ایک مقام پر یزیدی لشکر کامیاب ہوا اور اٹھارہ مقامات پر اسے شکست اور فرار کا منہ دیکھنا پڑا۔ یہ لڑائیاں چھوٹی چھوٹی سی لیکن ان سے یہ ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ قتل حسینؑ کے نتیجے میں مسلمانوں کے سونے ہوئے ضمیر بیدار ہو چکے تھے اور بنی امیہ کا ظلم ٹوٹنا جا رہا تھا۔ آل رسولؐ کو سیاسی پسپائی گمانی اور جہاں کے غاموں میں دھکیل دینے کی سازش ناکام ہو چکی تھی اور اسلامی دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کو سمجھنے لگی تھی کہ قریش کے مفاد پرستوں اور بنی امیہ کے منافقوں نے اسے سخت دھوکا دیا ہے اور آل رسولؐ بھیجے۔ اس سلوک کی مستحق نہیں تھی جو اس سے کیا گیا ہے۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ عراق کی یہ لڑائیاں ایک وقتی اشتعال کا نتیجہ تھیں اور ان کو کوئی اصولی حیثیت نہیں دی جاسکتی لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت سے وہ بھی انکار محال ہے کہ آل رسولؐ کی حمایت میں اس جذباتی مظاہرہ کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ مسلم عوام آل رسولؐ کی تحریک اور اس کے

موقف پر فور کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آخر وہ کیا حالات تھے جن میں آل رسولؐ کو اتنی عقیم قربانی پیش کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اسلامی دنیا میں وہ کون سی دور رس اصولی تبدیلیاں وجود میں آ رہی تھیں جن کو روکنے کے لئے کربلا کا ہولناک سانحہ وجود پذیر ہوا؟ رسولؐ کے انتقال کے پچاس سال کے اندر یہ کیسے حالات ہو گئے جن میں رسولؐ ذابواں قید و بند کے مصائب جھیل رہی ہیں؟ یہ یزید کون ہے جس کے ہاتھوں ضمیر اسلام کی اتنی کھلی ہوئی توہین ظہور میں آ رہی ہے؟ یزید کے منصب خلافت پر آنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی؟ اگر اسے خلافت محض وراثت پوری کے طور پر حاصل ہوئی ہے تو اسلام میں اس نسلی بادشاہت کا جواز کیسے پیدا کر لیا گیا؟ اگر نسلی بادشاہت کا اسلام میں امکان تھا تو حضرت ابو بکر کے بعد ان کے بیٹے محمد یا عبدالرحمن کیوں خلیفہ نہیں بنائے گئے؟ یا حضرت عمر کے بعد عبداللہ بن عمر کو منصب کیوں نہ حاصل ہوا؟ اگر نسلی بادشاہت کا اسلام میں کوئی وجود نہیں تو امیر معاویہ نے باوجود شرف صحابیت و عدالت یہ بدعت کیوں جاری فرمائی؟ اور پھر ذہن یہیں جا کر نہیں رک سکتے تھے بلکہ داغوں میں یہ خیالات پیدا ہونا بھی ناگزیر تھے کہ امیر معاویہ کون تھے؟ تاریخ اسلام کے ابتدائی دور میں ان کا کردار کیا تھا؟ بدر و احد کے میدانوں میں وہ کس فریق کے ساتھ تھے؟ ان کے خاندان کی اسلامی خدمات کیا تھیں؟ ان کو خلافت کا استحقاق کس طرح حاصل ہو گیا اگر وہ محض بزرگ شمیر بلا کسی حق کے خلیفہ بن بیٹھے تو کیا یہ بات اصولاً صحیح ہے کہ جس کی لامٹی اس کی بیہوشی جس کو سازش فریب کاری خونریزی اور قتل و غارت میں ملکہ حاصل ہو وہ نہ صرف یہ کہ خلیفہ رسولؐ بن سکتا ہے بلکہ اس کی خلافت کو دینی جواز بھی حاصل ہو سکتا ہے اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ اس قسم کے آدمی کو اتنی طاقت حاصل کر لینے کا موقع کیسے حاصل ہو

گیا اور اگر اسے یہ موقع اس لئے حاصل ہو گیا کہ اسے حضرت خلیفہ ثانی نے  
مملکت شام سپرد کر دی تھی تو کیا یہ خلافت مابک کی احتمالی چاہ کن فطی نہیں تھی  
کہ انہوں نے ایک ایسے شخص کو شام کا گورنر بنا دیا جس نے اول تو خلافت میں  
بجس کی لاشی اس کی بیخس کا قانون نافذ کر دیا اور دوسرے نسل بادشاہت کی  
دراغ تیل ڈال دی؟

ممکن ہے کہ بعض آدمیوں نے اس کے بعد یہ بھی سوچا ہو کہ جس  
صاحب نے امیر معاویہ کے سے آدمی کو اتنی بڑی طاقت کا مالک بننے کا موقع دے  
دیا وہ خود کس آئین و اصول کے ماتحت خلیفہ بن گئے تھے اگر وہ نامزدگی کے نتیجہ  
میں خلیفہ مقرر ہوئے تھے تو ایک ایسے شخص کو جس نے معاویہ کے سے سازش  
اور قاتل فرزند رسول کو حصول خلافت کا موقع عنایت کر دیا۔ مسد خلافت پر بٹھا  
دینے کی فطی کس سے صادر ہوئی تھی؟ اگر یہ فطی ان کے پیش رو بزرگ سے  
ہوئی تھی تو ایک ایسے شخص کو دینائے اسلام کی قیادت کیوں دے دی گئی جو اپنا  
جانشین مقرر کرنے میں اتنی بڑی فطی اور ایسی غیر محتاط روش کا مرتکب ہوا؟ اور  
یہاں سے فتنوں کا دھارا یقینی طور پر قریش کی سازش کی جانب مڑا ہو گا عقیدہ نبی  
سامعہ کے انتخاب اور اس کے اصول معرض بحث میں آئے ہوں گے اور اس  
طرح لوگوں کے لئے گزشتہ حالات کی تحقیق و تنقید اور اسلامی سیاست کے پس  
منظر پر بحث و نظر کے دروازے کھل گئے ہوں گے اور یہی آل رسول کی بہت  
بڑی کامیابی ہے۔

یہ صرف قیاسی بات نہیں ہے بلکہ واقعہ کربلا کے اسباب پر اس وقت سے  
لے کر آج تک جب بھی بحث کی جاتی ہے تو فتنوں میں ہمیشہ یہی سوالات ابھرا  
کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کوفہ سے

دفع تک آل رسول کی تفسیر نے لازمی طور پر لوگوں کے فتنوں میں یہ خیالات  
پیدا کئے ہوں گے۔ چنانچہ اس انداز فکر ہی کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ عبداللہ بن زبیر  
کو قریش کی پوری حمایت حاصل ہونے کے باوجود حصول حکومت میں ناکامی ہوئی  
اور آل رسول کربلا میں پامالی اور قتل و غارت گری کا شکار ہونے کے باوجود  
مسلمانوں کے فتنوں پر اتنی حاوی ہو گئی کہ بنی عباس نے اس کا نام لے کر بنی  
امیہ کا وجود تک صخرہ ہستی سے مٹا دیا اور مسلم عوام میں عام طور پر یہ احساس  
پیدا ہو گیا کہ خلافت آل رسول کا حق تھا جس حق سے اسے سازشوں کے ذریعے  
محروم کر دیا گیا تھا۔

عبداللہ بن زبیر نے یہ سمجھا تھا کہ لوگوں میں صرف یزید کی مخالفت عام  
ہوئی ہے یا زیادہ سے زیادہ مسلم عوام بنی امیہ سے برہم ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت  
میں وہ لازماً دوبارہ قریش کے اس مفاد پرست طبقہ کو برسر اقتدار لانے میں مدد  
دیں گے جس کو بنی امیہ نے حصول اقتدار کے بعد دودھ کی مکھی کی طرح نکال کے  
پھینک دیا تھا لیکن یہ ان کی بھول تھی قل حسین سے لوگوں کے دلوں کو جو  
زبردست دھچکا لگا تھا ان کے دماغوں پر جو شدید جھٹکے پڑے تھے ان کے نتیجے میں  
نہ صرف یہ کہ لوگ بنی امیہ کے مخالف ہو گئے تھے بلکہ قریش کا طلسم سیادت بھی  
نوٹ کر تار تار ہو چکا تھا لوگ یہ سمجھ گئے تھے کہ یزید کے ہاتھوں فرزند رسول کا  
قتل اور رسول زادوں کی تفسیر صرف ایک فرد واحد کی ذاتی فطی کا نتیجہ نہیں  
ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے گزشتہ پچاس سال کی سیاست کا قریش کی اس حرص اقتدار کا  
جس نے آل رسول کو مسلمانوں کی قیادت کے اتنی حق سے محروم کرا دیا تھا قریش  
کی اس سیاسی فطی کا کہ انہوں نے بنی امیہ کو شام کی گورنری تفویض کر دی تھی  
اور اس فطی سیاسی و معاشی نظام کا جو قریش کے حکمرانوں نے اسلامی دنیا پر نافذ کیا

تھا

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے نتیجے میں صرف بنی امیہ کے "استحقاقِ خلافت" کا خاتمہ نہیں ہوا قریش کے "استحقاقِ حکومت" کا طلسم بھی پاش پاش ہو گیا اور مسلم عوام نے یہ سمجھ لیا کہ مسد خلافت اگر شراب خورد یزید کے لئے نہیں تو خانہ کعبہ میں احکاف کا ڈھونگ رچانے والے عبداللہ بن زبیر کے لئے بھی نہیں ہے۔

اس مسد کے اٹل آل رسول ہیں اور یہ منصب صرف انہیں کو سبب دینا ہے چنانچہ شہادت حسین کے بعد کوئی مدعی خلافت، صحابیت، تابعیت یا قریشیت کی اساس پر خلافت کا دعویٰ نہیں کر سکا بلکہ خلافت کا مطالبہ اگر کیا گیا تو یا آل رسول کا نام پر جیسے بنی عباس یا مصر کے بنی فاطمہ کا مطالبہ اور یا پھر "جس کی لاشی اور اس کی بیہنس" کے اصول کی بنیاد پر جیسا کہ آل عثمان کی خلافت جو سر تا سر

"ہر کہ شمشیر زد مسکہ بنامش خواند"

کی اساس پر وجود میں آئی تھی۔

بہر حال راستہ کٹا اور لشکر یزید دمشق میں داخل ہوا یزید خوش تھا کہ اس نے آل رسول کو قتل اور قید کر کے اسلام کے خاتمہ کا بندوبست کر دیا ہے اور تحریک اسلامی کا چر تھا قائد حسین کا جانشین مسود تھا کہ شامیوں کے دلوں کو مسلمان بنانے کی جو تمنا علی "حسن اور حسین" کے دلوں میں مستور رہی وہ اس کے ہاتھوں پوری ہو رہی ہے۔

تاکہ بڑھتا رہا اور اس کے ساتھ جہوم میں اضافہ ہوتا گیا۔ خلیفہ خانی کے دور کی نسل جسے جبراً مسلمان بنا لیا گیا تھا جو بظاہر مسلمان اور باطنی عیسائی تھی۔

چالیس سال بیت جانے کی وجہ سے تقریباً ختم ہو چکی تھی اب اس مجمع میں وہ لوگ تھے جو اپنی پیدائش کے وقت سے یہ سنے رہے تھے کہ وہ "مسلمان" ہیں لیکن اسلام کیا ہے؟ اس سے قطعاً بے خبر تھے۔ ان کو صرف "معاویہ شامی اسلام" کی خبر تھی۔ "آل رسول" کے اسلام کا کوئی علم نہیں تھا۔ پیغمبر اسلام کا انہوں نے نام ضرور سنا تھا لیکن آنکھیں کھول کر دیکھا صرف معاویہ اور یزید کو تھا اور انہیں کو وہ اسلام کا مظہر تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اللہ کی اطاعت اور باری تعالیٰ کی محبت کا نام نہیں تھا یزید اور اس کے خاندان کی اطاعت و محبت اسلام تھی۔ اس مجمع نے پہلی بار ایک ایسے بیمار اور چند ایسی قیدی عورتوں کو دیکھا جن کے متعلق اسے معلوم ہوا کہ یہ پیغمبر اسلام کی ذریت ہیں۔ یہ اس کے لئے انتہائی حیرت انگیز تھی سکتہ میں ڈال دینے والی تھی ایسی چیز تھی جس کا ایسے وہم و گمان بھی نہ تھا لوگوں کے دلوں پر ایک جھکا سا گاہہ ششدر سے وہ گئے ان کے ذہن توڑی دیر کے لئے باؤف ہو گئے ان کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو گئیں۔ آخر یہ کیا؟ جس رسول کا ان کو کلمہ پڑھوایا گیا ان کا فرزند زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ اس کی بیٹیاں رسن بستہ اور اس کے جگر پاروں کے سر لوک نیزہ پرا آخر کیوں؟ نسل رسول اور جانشین رسول میں جنگ کیوں؟ خلیفہ وقت کے ہاتھوں خانوادہ رسالت کی جہتی آخر کس لئے؟ اور اگر رسول کے مسد تھیں یزید اور رسول کی آل میں ایک غوثی ٹکراؤ ظہور میں آیا تو اس میں خلا کس فرق کی ہے؟ کون حق پر ہے اور کون غلط کار؟ کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟

ناممکن ہے کہ اس قسم کے خیالات شامیوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوئے ہوں اور آل رسول نے اس نفسیاتی صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اس کے



محترم ارکان نے اس مجمع کو حقیقت حال سے آشنا کیا اور سید سجاد سیدہ نے محترم ام کلثوم نے اس مجمع کے سامنے وہ دل بلا دینے والی تقریریں کیں جن سے دمشق کے دروہام کانپ اٹھے یہ صحیح ہے کہ یزیدی سپاہیوں نے ان کو زیادہ بولنے کا موقع نہیں دیا لیکن غیسات کے ماہرین یہ جانتے ہیں کہ ایسے پرہول مقام پر زیادہ بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ابھرے ہوئے جذبات پر چند موثر الفاظ ہی وہ کام کر دکھاتے ہیں جو دوسرے مقالات پر لمبی لمبی تقریروں سے نہیں لیا جا سکتا آل رسول کے محترم ارکان کی زبانوں سے نکلے ہوئے چند الفاظ نے شامیوں کو سوچ میں ڈال دیا۔ ان کو فکر کی ایک نئی راہ دکھا دی۔ آپس میں بات چیت کا ایک نیا موضوع دے دیا تاکہ جب وہ اپنے اپنے گروں کو واپس ہوں تو گروں میں بازاہوں میں ہر جگہ صرف اسی موضوع پر بات چیت کریں کہ

”پیغمبر کی اولاد ذبح کر ڈالی گئی“ بقیہ

الیف ہمارے شہر میں قیدی کی حیثیت

سے لائی گئی ہے۔“

ظاہر ہے کہ دمشق میں لے چلی بار آل رسول کو دیکھا تھا اور بالکل غیر معمولی حالات میں دیکھا تھا اس لئے یہ لازمی چیز ہے کہ دمشق کے گھر گھر میں یہ موضوع زیر بحث آیا ہو گا لوگوں نے یزید اور حسین کی جنگ کے اسباب پر گفتگو کی ہو گی دونوں کے کردار کا تقابل کیا ہو گا۔ اسلام اور باطنی اسلام سے دونوں کے رشتہ و تعلق پر تامل خیال کیا ہو گا آل رسول سے یزید اور معاویہ کے تعلقات زیر بحث آئے ہوں گے اور ان سب کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آل رسول کی جیت بیشہ اسی چیز میں رہی ہے کہ لوگوں میں فکر کا جذبہ ابھر آئے اس لئے کہ جب بھی لوگ معاملات کی تحقیق کریں گے چھان بین کریں گے

اور تقصبات سے ہٹ کر آزادانہ فکر کریں گے تو حق کے چہرے پر پڑی ہوئی نقابیں لانا۔ الٹ جائیں گی آفتاب حقیقت پر چھائی ہوئی بدلیاں جتنی طور پر بھٹ جائیں گی اور اسی میں سچائی کی فتح تھی۔

دارالافتاء میں یزید کی پہلی شکست تھی۔

دربار میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کے واسطے آج تک محفوظ ہے یزید نے قیدیوں سے سخت گفتگو کی تاکہ اہلیانِ دربار پر اس کی شرکت طاقت اور وہد بہ ظاہر ہو۔ لیکن آل رسول کی جانب سے اس کو جو جواہرات دیئے گئے وہ ایسے تھے کہ حاضرین پر سنا چھا گیا۔ خود یزید کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی۔ طاقت کے ساتھ ہی شرب کا نشہ بھی ہرن ہو گیا اور یزید کو اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لئے آل رسول کو قید خانہ میں بھیج دیا۔

دربار میں سینکڑوں آدمی موجود تھے اس لئے یہ لازمی امر ہے کہ دربار کے واقعات بھی شہر میں مشہور ہوئے ہوں گے اور مشہور ہونا بھی چاہئے تھے اس لئے کہ یہ قیدی کوئی معمولی لوگ نہیں تھے یہ وہ آل رسول تھے جس کا ذکر و مشقیوں نے ہمیشہ سنا تھا لیکن جسے دیکھنے کا شرف اور پھر قطعاً غیر معمولی اور حیران کن حالات میں دیکھنے کا موقع ان کو زندگی میں پہلی مرتبہ نصیب ہوا تھا ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں پھینکا لوگوں کو فکر اور تشویش ہو گی لوگ واقعہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ جزو معلوم کرنے کے لئے بیجا ہوں گے۔ دربار سے پلٹنے والوں سے ایک ایک بات مکرر سہ کر پوچھی گئی ہو گی اور پھر اس پر آپس میں گفتگو کے سلسلے چمڑے ہوں گے۔ ہماری تاریخیں اس باب میں خاموش ہیں اس لئے کہ تاریخیں صرف سلاطین و ملوک کی داستان بیان کرتی ہیں عوام کی کیفیات جمہور کے افکار اور نفسیاتی اثرات و عوامل سے بحث نہیں کرتیں تاریخ کی اس کمی کو پورا کرنا ہمارا

فرض ہے اس لئے کہ نفسیاتی عوامل اور عوام کی ذہنی و فکری کیفیات کو سامنے رکھے بغیر تاریخ کی رٹا اور واقعات کی نوعیت کو سمجھنا ناممکن ہوتا ہے و مشق کی جس کیفیت کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ اس قسم کی حالات میں نفسیاتی اعتبار سے بالکل درست ہے اور شاہی عوام کے ان افکار اور اس لئے رجحان کا اموی سیاست پر جو اثر پڑنا چاہئے وہ انظر من الشمس ہے۔

کل رسول کی دربار میں بار بار طلبی یزیدی سیاست کی ایک اور بڑی شکست تھی یزید کا خیال تھا کہ اس طرح عوام پر اس کی سطوت شہانہ اس کی قوت و جبروت اس کے قہر و اقتدار اور اس کے قلب و جلال کا اثر قائم ہو جائے گا لیکن نفسیاتی اور سیاسی نقطہ نظر سے اس کا یہ اقدام اس کے لئے تباہ کن تھا آل رسول کو عوام کی ہمدردیاں حاصل ہوتی جا رہی تھیں عوام میں یزید کی فطرت کاری کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ شام جسے کل رسول سے بے خیر رکھنے پر مجاہد نے اپنی ساری قوتیں مرکوز کر دی تھیں یزید کی اس فطرتی کے نتیجے میں آل رسول کے تدارک مبارک سے گونجنے لگا تھا دربار اور زندان خانہ کے درمیان جو خاموش محرمہ جاری تھی اس میں روز بروز سید سجاد کا پلہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔

امام زین العابدین کو بھی اپنی اس کامیابی کا پورا احساس تھا چنانچہ آپ نے بھی رفتہ رفتہ اپنے انداز میں تبدیلی کرنا شروع کی۔ پہلے آپ دربار میں آتے تھے تو ایک مجبور اور بے بس قیدی کی طرح لیکن جب آپ نے یہ دیکھا لیا کہ اب شاہی عوام میں آل رسول کی ہمدردی کا جذبہ بیستہ جا رہا ہے تو آپ نے یہ انداز تبدیل کرنا شروع کر دیا اور یزید پر دہاؤ ڈالنے کی روش اختیار کی پہلے آپ کا رخ بالکل وقای ہوتا تھا اب آپ نے یزید کو وقای رخ اختیار کرنے پر مجبور کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ جامع مسجد دمشق میں آپ نے

اشھد ان محمد رسول اللہ

کی آواز پر یزید سے جو سوالات کئے وہ آپ کے اس بدلے ہوئے انداز کا کھلا ہوا ثبوت ہیں اور اس موقع پر یزید کی یہ پہچانی اور مجبوری قاتل دید ہے کہ وہ اپ کو مسجد جامع میں خطبہ سننے کی اجازت دے دیتا ہے لیکن خطبہ یہ دیکھتا ہے کہ ہادی الٹی جا رہی ہے تو مجبوراً اقامت کا حکم دے کر اس تقریر کو جو ایک بے بس قیدی کے انداز میں نہیں ایک فاتح کے انداز میں کی جا رہی تھی ختم کرا دیتا ہے اس تقریر کا انداز دیکھنے اس کے تصور دیکھنے اس کی رجز خوانی ملاحظہ فرمائیے اور پھر سوچئے کہ کیا کوئی مجبور اور بے بس قیدی اپنی شان میں ایسی باتیں کہنے کی جرات کر سکتا ہے؟ کیا کسی شکست خوردہ اور پابال انسان کی یہ مجال ہو سکتی ہے کہ وہ قاتلین کی موجودگی میں اس انداز سے اپنی بڑائی بیان کرے؟ اور کیا کوئی مطلوب، مقہور اور مغضوب فریق بھرے مجمع میں وہ الفاظ اپنی زبان پر لا سکتا ہے جو سید سجاد کی زبان سے لوا ہو رہے تھے؟ یہ بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ حالات بدل چکے تھے عوام میں آل رسول کی حمایت بڑھتی جا رہی تھی اور یزید کی عارضی کامیابی شکست میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

زمانے نے ایک اور کموٹ بدلی اور اب دنیا نے دیکھا کہ یزید اپنے منہ پر طمانچہ مار رہا ہے اور اس کی زبان سے ملی ولقتل الحسن کے ندامت خیز الفاظ جاری ہو رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ ندامت کس قسم کی تھی؟ کیا یزید کو قتل حسین کے نتیجے میں بڑی بڑی باتیں ہو گیا تھا؟ کیا اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ آل رسول لائق احترام تھی اور اس نے اس کی تبدیل کر کے ایک گناہ کبیرہ انجام دیا ہے؟

جس نے بالکل نہیں!!

یزید نہ جنت و نار کا قائل تھا نہ نبوت و رسالت کا ماننے والا تھا جس کا نبوت آج بھی اس کے اقوال سے ملتا ہے ایسی حالت میں اس کو "گنہگار" کا احساس پیدا ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا گناہ و ثواب، جزا و سزا، انعام و عتاب کا سوال اس شخص کے لئے پیدا ہوتا ہے جو دین پر ایمان رکھتا ہے جو رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے لیکن جو شخص یہ کہتا ہو کہ "نہ کوئی وحی آئی نہ کوئی پیغام" بلکہ یہ سب ایک ڈھونگ تھا جو بنی ہاشم نے حصول سلطنت کے لئے رچایا تھا۔

یا

"پی! اے محبوبہ طائر پی! اگر مذہب اسلام میں پیغام ممنوع ہے تو دین مسیحی پر پی! اس لئے کہ اس دنیا کے بعد کوئی زندگی نہیں، جنت اور دوزخ سب ڈھکوسلہ ہیں۔"

اسے قتل حسینؑ کو "گنہگار" تصور کرتے ہوئے اس پر ٹاوم ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی؟

دراصل یزید کو ندامت اپنی "سیاسی فکر" پر تھی اس لئے کہ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ حسینؑ کے قتل اور آل رسولؑ کی گرفتاری سے اس کی جو غرض تھی وہ ناکام ہو چکی ہے وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ جس اسلام کو وہ مٹانا چاہتا تھا اس کی جڑیں خود شام میں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں اسے یہ احساس پیدا ہو چکا تھا کہ جو شاہی پہلے سو فیصدی بنی امیہ کے حامی تھی اب آل رسولؑ کی طرف دار ہوتے جا رہے ہیں اور جس مملکت کے انتظام کے لئے اس نے آل رسولؑ کو قتل کر ڈالا

اس مملکت کی بنیادیں اس قتل کے نتیجے میں مل گئی ہیں بادشاہ کی حیثیت سے اسے مملکت کے ہر حصہ کی خبریں پہنچتی تھیں ایسی حالت میں وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ قتل حسینؑ نے عراق کو برہم کر دیا ہے حجاز میں آگ بھڑکا دی ہے ایران اور یمن میں فطرت پھیلا دی ہے سواور خود شام میں عوام کے تیز بدل چکے ہیں رعایا میں بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ بنی امیہ کا سارا وقار جسے جمہورٹی حدیثوں کے سارے قائم کیا گیا تھا ایک بڑے جھٹکے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ خود اس کا نام لوگوں کے لئے گالی بن گیا ہے نسل ابو سفیان فطرت و عمارت کا مرکز بن گئی ہے اور جس آل رسولؑ کو مٹانے کی حکم میں قریش کے مخالف پرستوں اور بنی امیہ کے منافقوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا وہ عوام کی نگاہوں میں اور عقیدتوں کا مرکز بن گئی ہے اور یہ سب قتل حسینؑ کی بدولت۔۔۔۔۔ اس لئے یزید کو حسینؑ کے قتل پر ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ مذہبی اساس پر نہیں خالص سیاسی مصلح کی بنیاد پر

یزید کو حسینؑ کی مذہبی حیثیت کا احساس ہو جاتا اور وہ اپنے "گنہگار" پر ٹاوم ہوتا تو خانہ کعبہ پر آتش بازی نہ کرتا مسجد نبویؐ میں گھوڑے نہ بڑھواتا اور ان مقدس شہروں میں خون کی ندیاں نہ بہائی جاتیں ان واقعات کا ظہور بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ یزید میں کوئی مذہبی احساس نہیں تھا اور آل رسولؑ کی تاریخی پر اس کا ماتم اس لئے نہیں تھا کہ دوزخ کا خوف ستا رہا تھا، یا رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عتاب کا خوف اس کے دل پر غالب ہو گیا تھا، واقعہ بس اتنا تھا کہ یزید کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ قتل حسینؑ کے نتیجے میں اسلام مٹنے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہو گیا ہے آل رسولؑ کے اثرات ختم ہونے کے بجائے ہزاروں گنا بیٹھ گئے ہیں اور اموی سیاست معرکہ کربلا کے نتیجے میں ذلت آمیز

طریقہ پر ناکام ہو گئی ہے۔

آل رسولؐ ایک سال شام میں رہی اور سال بھر میں حالات اتنے بدل گئے کہ یزید کو اپنا تخت حکومت لڑنا نظر آنے لگا اب اس کے سامنے صرف ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ آل رسولؐ سے صلح اور دوستی کا دھوکہ دیا کر معاملہ کو رفع دفع کر دیا جائے اس کا خیال تھا کہ آل رسولؐ ایک سال کی مسلسل امیری اور تکالیف کے نتیجے میں اتنی پریشان ہو چکی ہو گی کہ مزہ رہائی سنتے ہی شاد شو ہو جائے گی اور یزید سے "صلح" کو قیمت شمار کرتے ہوئے فیصلہ کن طریقہ پر لڑائی ختم کر دے گی جس طرح میدانِ صفین میں ختم ہو گئی تھی۔

یزید کی جانب سے رہائی کی پیشکش دراصل ویسی ہی چال تھی جیسی کی میدانِ صفین میں نیزوں پر قرآن بلند کر کے عمرو عاص نے چلی تھی اور جس کے نتیجے میں امیرالمومنینؑ کی جیتی ہوئی لڑائی غیر فیصلہ کن طریقہ پر ختم ہو گئی تھی۔ لیکن یزید اس حقیقت کو بھول رہا تھا کہ نہانہ بدل چکا ہے اب صفین کا میدان نہیں ہے اور اس مرتبہ آل رسولؐ کے ساتھ وہ ضعیف الاعتقاد لوگ نہیں ہیں جو عمرو عاص کی چال میں پھنس کر امام نہانہ کی مخالفت پر تیار ہو گئے تھے اب آل رسولؐ فیصلہ کن جنگ لڑ رہی ہے اور علیؑ ابنِ الحسینؑ بظاہر تیار کنزور اور ستم رسیدہ اتنے کنزور قلب و دماغ کے مالک نہیں ہیں کہ محض رہائی کی خاطر ایک جیتی ہوئی جنگ کو غیر فیصلہ کن نتیجہ پر ختم کر دیں اور بنو امیہ کو یہ موقع دے دیں کہ وہ دوبارہ اپنے اکثرے ہوئے قدم جمالیں اپنی شکست پر پردہ ڈال دیں اور معاملات پر لپ لپ پوت کر کے اپنا کھویا ہوا وقار چند دن میں دوبارہ بحال کر لیں یزید نے امام زین العابدین علیہ السلام کے حلق جو اندازے قائم کئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے خون بہا کی پیش کش عمارت کے ساتھ ٹھکرا دی گئی اور

امام نے صاف الفاظ میں یزید کو مطلع کر دیا کہ اب آل رسولؐ مکمل طور واضح دفع کے حصول سے کم پر راضی نہیں ہو سکتی۔ یزید نے چاہا تھا کہ خون بہا پر معاملہ ٹل جائے لیکن سیدِ جہاد نے یہ مطالبہ کر دیا کہ ہم دمشق میں اپنے شہداء کا ماتم کریں گے جس کا ہمیں موقع دیا جائے۔

بظاہر یہ بڑا مصونانہ اور بے حد مظلومانہ مطالبہ تھا لیکن درحقیقت یہ حکمتِ ربانی کے چوتھے امین کی سیاستِ الہیہ کا شاہکار تھا یزید کے شاہی محل میں حسینؑ کا ماتم نہیں ہو رہا تھا آل رسولؐ کی فتحِ مبینہ کا اعلان کیا جا رہا تھا اب یزید کی حیثیت ایک لونی قیدی کی تھی جو محل کے ایک گوشہ میں بیٹھا اموی سیاست کی ناکامی پر حسرت کے آنسو بہا رہا تھا وہ وہی شامی جو کبھی معاویہ کے جلن کار کہلاتے تھے سیدِ جہاد کی خدمت میں حاضر ہو کر آل رسولؐ کو نذرانہ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ شامی عورتیں سیدہ زینبؑ اور سیدہ ام کلثومؑ کے قدم چوم رہی تھیں۔ علیؑ ابنِ الحسینؑ کی امامت کا آفتاب دمشق میں چمک رہا تھا اور

"واحسبہ"

کی صداؤں سے بنی امیہ کی باطل پرستی کا اعلان کیا جا رہا تھا معاویہ اور یزید کے جس محل میں ہمیشہ آل رسولؐ کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں اس پر اب آل رسولؐ کا قبضہ تھا جن ابوالوں میں کبھی یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ علیؑ پر سب و شتم کیا جائے انہیں ابوالوں میں آج علیؑ اور آل علیؑ کی تعریفیں ہو رہی تھیں جس رنجِ محل میں آل حسینؑ کا فیصلہ کیا گیا تھا اسی کے در و دیوار حسینؑ کے نام سے گونج رہے تھے اور جس شام کے لوگ علیؑ حسنؑ اور حسینؑ کی دشمنی کو اپنا ایمان تصور کرتے تھے اسی شام کی کہادی آج آل رسولؐ کے قدموں پر سجدہ ریز تھی آج کوئی شامی یزید کا جالی نہیں تھا بنی امیہ کا پرستار نہیں تھا آل ابی سفیان کا مدح

خول میں تھا۔ آج سب کی زبانوں پر علی بن الحسین کا نام تھا۔ کلام کا نام تھا۔ ام کلثوم کا نام تھا اور اس اعتبار سے اس علی بن ابی طالب کا نام تھا جس سے شامیوں کو برگشتہ رکھنے کے لئے معاویہ نے حدیث سازی و عادت فرض ہر تدبیر استعمال کی تھی۔ میں سال کے قلیل عرصہ میں زمانہ ایسا بدلا کہ معاویہ کے شاہی محل میں علی کے لال کا ماتم ہونے لگا معاویہ کا جگر بند چوروں کی طرح ایک کمرے میں چھپ کر اشکانی پر مجبور ہوا اور علی کے فرزند کے ماتم سے شاہی محل کے در و دیوار بل گئے یہ فتح مبین کا اعلان تھا اس فتح مبین کا اعلان جس پر کوئی پردہ ڈالا جانا محال ہے۔

یزید کی جانب سے ”غون بہا“ کے نام سے جو رقوم حضرت علی بن الحسین کی خدمت میں پیش کی گئی تھیں وہ دراصل وہی تھیں جن کو آج کی اصطلاح میں ”تلون جنگ“ کہا جاتا ہے۔ یزید فاتح ہوتا تو وہ ہرگز تلون جنگ پیش نہ کرتا بلکہ شاید آل رسول سے تلون وصول کرتا اس لئے کہ تلون ہمیشہ منفتح لدا کرتا ہے فاتح نہیں دیا کرتا، یزید کا تلون جنگ پیش کرنا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی شکست کا اعتراف کر رہا تھا۔

یزید کے گھر سے آٹھ روز تک مسلسل حسین اور آل رسول کی حقانیت اور کامرانی کا اعلان ہوتا رہا اور جب یہ حقیقت ناقابل انکار حد تک واضح کی جا چکی کہ اس جنگ میں آل رسول کو کھل اور واضح فتح ہوئی ہے تو تحریک اسلامی کے چوتھے قائد نے یہ فیصلہ کیا کہ اس فتح مبین سے ساری دنیا کے اسلام کو آگہ کر دیا جائے چنانچہ دمشق سے کربلا جانے کا اعلان کیا گیا تاکہ جس عراقی سرزمین پر آل رسول کو قتل اور قید کیا گیا تھا جہاں اہل بیت کی خواتین گرفتار کی گئی تھیں جہاں عید اللہ بن زیاد کی بیعت سے کمزور دل مسلمان اپنے ایمان سے دست کش

ہو جایا کرتے تھے وہاں بھی آل رسول کی کامیابی و کامرانی کے پرچم بلند کر دیئے جائیں۔

آل رسول کا قاتلہ و مفتح سے روانہ ہوا اور اس شاہانہ کرو فر سے روانہ ہوا کہ آگے آگے پانچ سو آہن پوش محافظ ہاتھوں میں نیزے سنبھالے لگا ہیں جھکائے لوب سے رولان لن کی پشت پر زر کار مہملوں میں بیسیاں لن کے عقب میں تحریک اسلامی کا چوتھا قائد مسلمانوں کا امام رسول کا چاہنیں علی حسن اور حسین کا دل بند علی ابن الحسین اور آخر میں یزید اور اس کے ارکان سلطنت اپنی شکست اور ناکامی پر ماتم کٹاں اموی سیاست کی پامالی پر سینہ کوب اسلام کی اس عظیم فتح پر دل ریشیں

یہ کسی گرفتار عن دل شکستہ مجبور و مقهور شکست خورہ اور مغلوب انسان کی سواری نہیں تھی۔ یہ ایک فاتح کا جلوس تھا اس فاتح کا جلوس جس نے ایک مجبور قیدی بن کے شام میں زندگی کا ایک سال بسر کیا تھا اور اس قلیل عرصہ میں شام کو ہمیشہ کے لئے ”اسلام کا قیدی“ بنا دیا تھا۔

ایک ایسے فاتح کا جلوس جو صرف چند بے بس عورتوں اور چند کمزور بچوں کا ہلکے لے کر اسلام کی لڑائی لڑنے آیا تھا لیکن اس نے ایسا شاندار جہاد کیا کہ ایک عظیم اور عالم سلطنت اس کے سامنے سر بسجود ہو گئی جس نے دنیا کو حق پرستوں کی جنگ کے ایک بالکل نئے انداز کی تعلیم دی۔ حق و سناں کے مقابلہ میں انک و آہ اور ظلم و ستم کے مقابلہ میں مظلومانہ جرات و استقلال سے کام لینا سکھایا اور جس نے ہتھکڑیوں اور بیڑوں کی کھڑکھڑاہٹ سے باطل کے شور بے ہنگام کو دبا دینے کے وہ اصول دنیا کو چلائے جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے مشعل راہ کا کام دیتے رہیں گے۔

آج نہ وہ شہر تھا جو سید سجاد پر کوڑے برسانا تھا نہ وہ غولی تھا جو اپنے  
 نیزے پر سر حسین کی نمائش کرتا تھا نہ وہ عمرو سعد تھا جو سرداری لشکر پر نازل تھا  
 اور نہ وہ غوغوار سپاہی تھے جو عورتوں پر ستم توڑنے میں پیش پیش تھے یہ سب  
 سرے سے قاتل تھے ان میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ سامنے آئیں اس لئے  
 کہ وہ جانتے تھے کہ دنیا ان پر تھو کے گی وہ جنگ بھی ہار چکے تھے اور عزت کی  
 بازی بھی ہار چکے تھے آج وہ ذلیل تھے بدنام تھے حقیر تھے اور دوسرے تو خیر خود  
 یزید کی نگاہ میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں تھی اس لئے کہ یزید یہ سمجھ رہا تھا کہ  
 بنی امیہ کے مقاصد کی دائمی اور ابدی شکست کو قریب تر لانے کی ذمہ داری میں  
 ان لوگوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے!

قائد شاہی محل سے نکل کر بازار میں پہنچا اچانک سید سجاد نے قافلہ کو  
 رکنے کا حکم دے دیا اس لئے کہ تحریک اسلامی کے قافلے نے چلتے چلتے پھر ایک بار  
 اپنی فتح مبین کا اعلان ضروری سمجھا تھا ہزاروں شامیوں کے مجمع میں سید الساجدین  
 نے تقریر شروع کی وہ تقریر جس میں آپ نے اموی سیاست کو پوری طرح بے  
 نقاب کر ڈالا جس میں آپ نے آل رسولؐ کے مقاصد پوری وضاحت کے ساتھ  
 بیان فرمائے جس میں آپ نے شامیوں کے سابقہ کردار کا تفصیل سے جائزہ لیا اور  
 وہ ذلولہ خیز حقائق بیان فرمائے جنہیں سن کر مجمع میں کرام چل گیا ہر آنکھ الجھ بار  
 ہو گئی اور ہر گونہ ندامت سے جھک گئی ظاہر ہے کہ ایک مجبور قیدی قید زندوں  
 سے چھٹ کر دشمن کے دارالحکومت میں ایسی تقریر کرنے کی جرأت نہیں کر  
 سکتا۔ سید سجاد نے وہ تقریر فرمائی جو ایک ایسا قاتل ہی کر سکتا ہے جس نے دشمن  
 کو اس بری طرح کچل ڈالا ہو کہ اب اسے نفیم کے دوبارہ ابھرنے کا خوف مطلق  
 باقی نہ رہا ہو اور سید سجاد ایسا کیوں نہ کرتے؟ ————— اللہ نے ان کے

دست حق پرست پر اسلام کو وہ فتح عظیم عطا فرمائی تھی کہ جو قیامت تک شکست  
 میں تبدیل ہونے والی نہیں تھی آج قرشی مفاد پرست بھی ہار چکے تھے اور منافقین  
 بنی امیہ کی کمر بھی ٹوٹ چکی تھی دین حنیف کے لئے ہر خطرہ ختم ہو چکا تھا۔  
 خلافت ربانی کے اصول واضح ہو چکے تھے صحابیت کے پروردگار میں جو باطل ابھرا تھا  
 اس کا دامن تار تار ہو چکا تھا انسان پر انسان کی حکومت کے جس باطل اصول کو  
 قریش نے صحابیت سے اور بنی امیہ نے تلواریں سے نافذ کر دیا تھا آج شکست کیا جا  
 چکا تھا نسلی بادشاہت کو مثالی اسلام ثابت کیا جا چکا ہے خلافت کی تقدس اور آئینہ  
 بچالی معنی تھی اسلام کے اصول محفوظ کر دیئے گئے تھے ایمان کے آئینہ پر گزشتہ  
 پچاس سال میں جو گروہ پڑ گئی تھی اسے صاف کیا جا چکا تھا دنیا کے اسلام کے  
 بنی امیہ کے اثرات کے ماتحت مرتد یا گمراہ ہو جانے کا خطرہ دور ہو چکا تھا خون  
 حسینؑ اور لشک سجادؑ سے اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو چکی تھیں آل رسولؐ سے  
 آئندہ طلب بیعت کا خطرہ ختم ہو چکا تھا قوم کا ضمیر بیدار ہو چکا تھا مظلومیت کی  
 طاقت آشکار ہو چکی تھی انتہائی بے بسی کے عالم میں باطل کی تہرانی قوتوں کو  
 شکست دینے کے اصول دنیا کو سکھائے جا چکے تھے بنی امیہ نے بادشاہت  
 جاگیرداری اور نسل پرستی کے جو بت تیار کئے تھے وہ پاش پاش کئے جا چکے تھے  
 بادشاہوں کو "الوریت و ربوبیت" کو ٹھکراتے ہوئے اللہ واحد کی پرستاری کا عملی  
 درس دیا جا چکا تھا تاجروں کی فحاشی کے مقابلہ میں مرجانے اور صرف اللہ کی  
 عبادت اختیار کرنے کا فرمان سنایا جا چکا تھا بیعت پر عدالت کے خلاف چڑھا کر  
 اس کی مدد سے باطل کو ابھار دینے کی تدبیریں ناکام بنائی جا چکی تھیں۔ حکومت اور  
 بیت المال کے حقائق اسلام کا نظریہ واضح کیا جا چکا تھا اسلامی قوانین انشائیہ کی  
 عملی صورت دنیا کے سامنے پیش کی جا چکی تھیں ذریعہ سبب نماز ادا کرنے کے اولیٰ

سکھائے جا چکے تھے۔ شریعت اسلامی کی روح کو فنا ہو جانے سے بچا لیا گیا تھا۔ آل رسولؑ کے لئے تعلیم و تبلیغ کی آزادی حاصل کرنی گئی تھی دنیا دار سلاطین کی نام نہاد "خلافت" کے ساتھ مذہب کا تصور وابستہ رہنے کے نتیجہ میں اسلام کی جو بدنامی ہو سکتی تھی اس کا خطرہ دور کر دیا گیا تھا اس لئے کہ اب یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ دنیا داروں کی "خلافت" نری پادشاہت ہے اور اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اعلیٰ نامزدگی، شوری اور قہر و قلبہ کے سارے اصول قلعہ ثابت کر دیئے گئے تھے اس کے لئے جس بڑی کی ذات پر اعلیٰ بھی ہوا اور جسے معاویہ کے سے صحابی خلیفہ نے نامزد بھی کیا جس کے لئے اکابر بنی امیہ اور اکابر قریش کا شوری بھی ہوا اور جسے قہر و قلبہ بھی حاصل تھا اس کی "خلافت" جتنی غیر اسلامی تھی وہ قتل حسینؑ اور واقعہ حرا سے ثابت ہے۔ اعلیٰ نامزدگی، شوری اور قہر و قلبہ سے بنی ہوئی حکومتوں کی مخالفت جائز، آئینی اور سیرت صحابہ قرار پائی تھی اس لئے کہ جہاں ان اصولوں پر قائم شدہ بیزیدی حکومت کے خلاف صحابی رسولؑ حسینؑ بن علیؑ نے جنگ کی وہیں مکہ اور مدینہ کے ہزاروں صحابہ و تابعین نے بھی عبداللہ بن زبیر کی سرکردگی میں اس کے خلاف جنگ کر کے یہ واضح کر دیا تھا کہ ان نام نہاد اصولوں کی بنیاد پر بنی ہوئی کسی حکومت کو "مقدس" اسلامی یا الہی حکومت" کا درجہ حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ یہ اصول تو محض ایک وقتی سیاسی کرشمہ تھے ان کو نہ کوئی دوام حاصل تھا اور نہ تقدس چنانچہ خود صحابہ و تابعین نے ایک ایسی حکومت کو مردود قرار دے دیا جو بیک وقت ان چاروں اصولوں پر قائم تھی یہ آل رسولؑ کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی اور سید سجادؑ کو اس کامیابی کا پورا احساس تھا۔

آج سید سجادؑ اس احساس کامرانی کے ساتھ تقریر کر رہے تھے کہ انہوں

نے شام کو پیشہ کے لئے مسلمان بنا لیا ہے اور آل رسولؑ کے لئے وہ ہمہ گیر ہر دلعزیزی اور مرجعیت حاصل کر لی ہے کہ اب آل رسولؑ کو گناہی کے غار میں پھینک دینے یا مسلمانوں کو اس کی روحانی عظمت کا منکر بنا دینے کی کوئی سازش کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ لوگ آل رسولؑ کے دشمنوں کی "خلافت" بھی مانتے رہیں گے لیکن اس کے باوجود آل رسولؑ کی محبت کو صین ایمان تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ قرشی مغلو پرستوں، بنی امیہ کے منافقوں اور بنی عباس کے پیش پرست سلاطین کو "رضی اللہ عنہ" کا لقب بھی دیتے رہیں گے لیکن پھر بھی آل رسولؑ کی عظمت کے سامنے جھکتے رہیں گے اور فدک کی ضبطی، علیؑ کی خلافت سے طعین، علیؑ و اولاد علیؑ پر سب و شتم، آل رسولؑ کے قتل عام خانوادہ رسالت کی تشویر، فرض آل رسولؑ کے نام اور ان کی عزت و عظمت کو فنا کر دینے کی جتنی تدابیر اب تک کی گئی تھیں وہ اس بری طرح ناکام ہو چکی ہیں کہ ان کا ذکر تواریخ کی کتابوں میں باقی رہے گا لیکن ان کے اثرات کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں گے۔

قائد دمشق سے روانہ ہوا اور شام و عراق کی درجنوں بستیوں سے گزرتا ہوا کرلا پانچواں بے شک سید سجادؑ اور خواتین محترم کی یہ خواہش تھی کہ قبر حسینؑ کی زیارت کی جائے لیکن اس عظیم خواہش کے ساتھ ہی عراقیوں کو اور ان کے پیوس میں لبرائوں کو آل رسولؑ کی فتح مبین سے باخبر کرنا بھی ضروری تھا۔ آل رسولؑ کا قائد کرلا پانچواں سیدائوں نے اپنے وارثوں کا ماتم کیا اور اس ماتم کے پردے میں بنی امیہ کی ناکامی اور آل رسولؑ کی فتح مبین کا اعلان کیا۔ دنیا نے دیکھا کہ کوفہ میں ابن زیاد بھی موجود ہے۔ طاہران حسینؑ بھی مع ہیں لیکن آج وہ بے بس ہیں۔ ان پر کھلم کھلا لعنت کی جا رہی ہے۔ ان کے مظالم کا اعلان ہو رہا ہے۔ آل رسولؑ کے سلسلہ میں ان کے گناہوں نے کربت عام کئے جا رہے ہیں لیکن آج

نہ لن میں یہ جرات ہے کہ سید سجاد کو ٹوک سکیں۔ نہ یہ ہمت ہے کہ سیدائوں کو دل دوز نوحوں کی شکل میں بنی امیہ پر لعنت برسانے سے روک سکیں اور نہ وہ اس قتل ہیں کہ اسی آل رسول کے سامنے آسکیں جسے ابھی ایک سال قبل وہ گرفتار کر کے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے تھے۔ عراقیوں نے آل رسول کی قوت و کامرانی کا یہ منظر نہ صرف یہ کہ تعجب کی نگاہوں سے دیکھا بلکہ عبرت کی نگاہوں سے بھی دیکھا۔ اب لن کو معلوم ہوا کہ عبید اللہ بن زیاد اور یزید خدا نہیں ہیں جن سے ڈرا جائے یا جن کے ہاتھوں پر قلابی کی بیعت قبول کرنی جائے۔ یہ تو اتنے کمزور ہیں کہ چند بے بس خواتین نے لن کے ایوان اقتدار کو زمین بوس کر دیا اور اس احساس نے لن کے دلوں پر چھائی ہوئی بنی امیہ کی بیعت ختم کر دی۔ لن کے دہے ہوئے جذبات ابھرنے لگے، لن کی بیڑی کا ظلم ٹوٹ گیا اور وہی کوفہ والے جو عبید اللہ بن زیاد کے ڈر سے مسلم بن عقیل کی بیعت توڑ بیٹھے تھے پہلے تو این کی شکل میں یزید کے خلاف صف آرا ہوئے اور بعد میں عمار کی قیادت میں انہوں نے اسی عبید اللہ بن زیاد کو کینر کردار تک پہنچا دیا۔ بزدل عراقی بھادر بن گئے اور وہی لوگ جن کے ضمیر اتنے مرہ ہو چکے تھے کہ لن کی نگاہوں کے سامنے خالوہ رسالت کی خواتین کی تشہیر ہوئی اور وہ چپ رہے، اتنے جری ہو گئے کہ انہوں نے یزید اور عبید اللہ بن زیاد کی سیادت و حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔ یہی اثر ایران پر بھی پڑا، تلوار کی طاقت اور فاتحین کے جبر سے مسلمان ہونے والے ایرانی مقلوبیت کی اس عظیم فتح اور آل رسول کے حق پرستانہ کردار سے متاثر ہو کر دل سے مسلمان ہو گئے اور جس طرح شام کو داعی طور پر مسلمان بنا لیا گیا بلکہ آل رسول کا اس شدت سے حامی بنا لیا گیا کہ انہیں ایرانیوں کی تشہیر پر قلب نے بنی امیہ کی نسل کو دنیا سے فنا کر دیا اور آج تک ایران آل رسول

کے سیدائوں سے چمکتا نظر آ رہا ہے۔

کربلا سے اسلام کا قاریع اعظم اور دین مبین کی تحریک کا چرچا تاکہ مدینہ روانہ ہوا اس مدینہ کی جانب جسے حسین کو مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا لیکن سید سجاد اس شان سے مدینہ میں داخل ہوئے کہ سارے شہر نے استقبال کے لئے آنکھیں بچھا دیں۔ یہ وہی شہر تھا جہاں علی کو آسانی سے خلافت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جہاں فاطمہ کے آسوں کی بھی قدر نہیں کی گئی تھی۔ جہاں قریش کے مفاد پرستوں نے آل رسول کو گمناہی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا تھا۔ جہاں سیرت شیعین کے مذاق پر علی کا استحقاق ختم کر دیا گیا جہاں حسن کے جنازے پر تیر ہرمائے گئے تھے اور جس کی زمین حسین پر تنگ کر دی گئی تھی۔ لیکن آج سارا مدینہ جیتے ہوئے آسوں، دردناک نوحوں، تڑپتے ہوئے کلیجوں اور دل دوز چیخوں سے علی بن الحسین کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ آج نہ یزید کے گورنر میں یہ ہمت تھی کہ وہ حسین کے جگر بند سے بیعت کا مطالبہ کرنا اور نہ مروان میں یہ طاقت تھی کہ وہ حسین کی طرح علی بن الحسین کو قتل کی دھمکی دیتا، آل رسول کے دشمن یا تو گھروں میں روپوش تھے اور یا پھر سیاسی مصلح کا لقب، مدینہ پر علی ابن الحسین کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ مسجد نبوی جہاں حسین کے نانا قیصر کسریٰ کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔ حسین حسین کی دردناک آوازوں سے لرز لرز کر دینا کو آل رسول کی لہری اور داعی فتح کا پیغام سن رہی تھی۔ شاید مسجد کی دیواریں زبان حال سے یہ اعلان کر رہی ہوں کہ "دین کی جنگ ہمیشہ کے لئے جیت لی گئی۔"

انسان پر انسان کی حکومت کے ماحول اور جاہلی تصور کو بے نقاب کر دیا

گیا۔

خلافت کے باب میں مسلمانوں کی ساری غلط فہمیوں اور غلط اندیشوں کا



پروہ چاک کر کے اسلام کے صحیح تصور خلافت اور حکومت امیہ کے حقیقی اصولوں کو واضح کر دیا گیا۔

قریش اور بنی امیہ کی سرگرمیوں کے نتیجے میں دین کے مسخ ہو جانے کا جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا اسے پیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

تکوار کی طاقت سے جن علاقوں کو جبراً مسلمان بنایا گیا تھا ان کو آل رسول کی مظلومیت کا عکس دکھا کر پیشہ پیشہ کے لئے واقفاً مسلمان بنا لیا گیا۔

مسلمانوں میں یہ تصور عام کر دیا گیا کہ اسلام کی روحانی مذہبی اور اخلاقی قیادت و سیادت کے حقدار صرف وہ محترم ارکان آل رسول ہیں جو معصوم اور

مامور من اللہ ہیں۔

یہ تھی اس عظیم طویل اور صبر آزا جنگ کی داستان جو رسول کی آنکھ بند ہوتے ہی شروع ہوئی تھی اور زندانِ خالدہ شام سے اہل بیت کی رہائی پر تمام ہوئی۔ جو علی ابن ابی طالب نے شروع کی اور علی ابن الحسین پر ختم ہوئی۔ اور جس میں قدم قدم پر آل رسول کو وہ عظیم اور شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں جو ان کے مامور من اللہ قائد اور حکومت رہائی کا امین ہونے کا ایسا شاندار تابناک اور ناقابل تردید ثبوت ہیں جس پر تاریخ اسلام ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔

معاویہ اور یزید کے پاس دولت تھی۔ بادشاہت تھی، مملکت تھی، خزانے تھے، لشکر تھے، دربار کے خوشامدی ٹوٹے۔ ظاہری جاہ و جلال تھا، مادی شان و شوکت تھی۔ بیعت کرنے والوں کی اکثریت تھی۔ غرض خالص دنیوی نقطہ نظر سے ان کی طاقت اور قوت ناقابل انکار تھی۔ اس کے مقابلہ میں آل رسول بویا لعین تھی، مفلس تھی، اس کے پاس نہ خزانے تھے نہ لشکر تھے نہ حمایتوں کی

کثرت تھی اور نہ دنیوی ساز و سامان لیکن ان دونوں کے کراؤ کا جو نتیجہ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ نتائج کا پتہ چلانے کے لئے دور کیوں چلیے۔ تاریخ کے صفحات کیوں اٹھیں، سامنے کی چیزیں دیکھ لیجئے۔ آج دنیا کے لاکھوں مسلمانوں کے ناموں میں علی، حسن اور حسین کا لفظ موجود ہے لیکن کسی مسلمان کا نام معاویہ یا یزید نہیں ہوتا۔ ہر مسلمان کے گھر میں بیچ تن پاک کے ناموں کا طغری اور پتلے نظر آتا ہے۔ آل ابی سفیان کے نام کوئی دیواروں پر لکھ کر نہیں لگاتا۔ مسلمان جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں تو آل رسول کا واسطہ دیتے ہیں۔ معاویہ اور یزید کے واسطہ سے دعا نہیں مانگتے۔ معاویہ اور یزید کی قبروں کا کوئی نشان نہیں لیکن نجف، کربلا اور اہل بیت میں ہزاروں زائر دور دور سے جا کر جمع ہوتے ہیں اور ان مشاہد مقدسہ کی زیارت کو اپنے لئے سرمایہ آخرت تصور کرتے ہیں۔

آل رسول کی شان میں عربی، فارسی، ہندی، اردو، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، فرض دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں نظم و نثر کے موتی لٹائے جاتے ہیں اور مسلمان لوہاء و شعراء سے قطع نظر غیر مسلم ادیب و شاعر بھی ان کی مدح و توصیف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ لیکن بنی امیہ کے ان سلاطین کا نام آتے ہی ذوق سلیم کی پیشانی پر بل آجاتے ہیں۔ محرم آتے ہی اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ میں آل رسول کا ذکر چمڑ جاتا ہے اور خوش بیان و اطمینان آل رسول کی تعریف میں اپنی طاقت لسانی کے جوہر دکھانا شروع کر دیتے ہیں لیکن یزید اور معاویہ کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کو یاد رکھنا بھی غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ آل رسول کے ذکر کے لئے دنیا میں ہزاروں عمارتیں امام باڑوں اور عاشور خانوں کے نام سے موجود ہیں لیکن اموی حکمرانوں کے نام سے ایک ٹیلہ بھی موسوم نہیں۔ اردو زبان میں یزید کی شان میں ایک لفظ بھی ملنا محال ہے۔ لیکن اردو کے شعری ادب کا

اور سستی و جھد کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔ یہ دنیا دار العمل ہے، سستی و حرکت کا میدان ہے اور یہاں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سستی کرنا جانتا ہے۔ قربانیاں دینا جانتا ہے۔ خونِ پییدہ ایک کرنا جانتا ہے۔ پھر معتقد جتنا عظیم ہو گا کامیابی جتنی بڑی درکار ہو گی، فتح جتنی دیرپا چاہیے ہو گی، قربانیاں بھی اتنی ہی زیادہ پیش کرنا پڑیں گی۔ یہ دنیا کا دستور ہے۔ اس لئے اگر آل رسول کو آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ یہ انہیں قربانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کے سران کے آستانوں پر جگمگے نظر آ رہے ہیں۔



معاویہ اور یزید کا قاتل کوئی نہیں دلاتا لیکن آل رسول کی نیاں ہر گھر میں عام ہے۔ اموی سلاطین کے نام سے خود مسلمان منقض ہو جاتے ہیں اور حسین حسین کا نعرہ بند بھی بلند کرتے ہیں اور یہ ساری عظمت، عزت، شہرت ان لوگوں کے لئے ہے جو بلوی نقطہ نظر سے قطعاً "کمزور اور بے بس تھے لیکن چونکہ وہ حق کے لئے لڑنے، حق کے لئے جئے، حق کے لئے مرے اور حق کی سرپرستی کے لئے جدوجہد کرتے رہے اس لئے وہ زندگی میں بھی کامیاب رہے اور مرنے کے بعد بھی کامیاب ہیں۔ زندگی میں انہوں نے جاہر بادشاہوں اور باطل کی قوتوں کو شکست دے کر اپنے مقاصد حاصل کئے اور موت کے بعد ان کو ان کی ان عظیم کامیابیوں پر یہ ثمرہ حاصل ہوا کہ آج ان کے نام عظمت، محبت اور عقیدت کے لئے مرکز بنے ہوئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان کو آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرنا پڑا، ان کو قدم قدم پر طوفانوں اور زلزلوں کا مقابلہ کرنا پڑا، ان کی زندگی کے آئیٹیم، مصائب کے پتھروں سے چکناچور ہوتے رہے۔ ان کی حیات ظاہری آلسوں کے سیلاب میں ڈوبی نظر آئی، لیکن ان کے باطن ہمیشہ مسکراتے رہے۔ ان کے قاب ہمیشہ سرور رہے اور ہجوم مصائب میں بھی خوشیاں ان کے قدم چومتی رہیں۔ اس لئے کہ ان کو اپنے حریف کے مقابلے میں قدم قدم پر کامیابیاں نصیب ہو رہی تھیں۔ وہ اپنا ہر پیسہ پیسہ منہد حاصل کر رہے تھے اور ان کے مخالف اپنی ہر مالدش ہر تھکوشی ناکام ہو رہے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس فتح عظیم کے حصول میں انک و آ کا بڑا حصہ رہا اور ان عظیم انسانوں کو بے پناہ قربانیاں پیش کرنا پڑیں لیکن دنیا کی کوئی کامیابی قربانیوں